مجلۂ علوم اسلامیہ کی خصوصی اشاعت

الفاروق

ایک مطالعہ

مرتبین

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ڈاکٹر عبید اللہ فہد

ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

الفاروق

ایک مطالعہ

مرتبین

- پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
- ڈاکٹر عبید اللہ فہد

ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تالیف	:	الفاروق — ایک مطالعہ
مرتبین	:	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
		ڈاکٹر عبید اللہ فہد
صفحات	:	۴۴۰
ناشر	:	ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
مطبع	:	مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ
کمپوزنگ	:	آرورا پرنٹرس اینڈ کمپیوٹر سینٹر، شاہدرہ، دہلی۔
		Ph.2311785
اشاعت	:	مارچ ۲۰۰۲ء
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
قیمت	:	۱۵۰ روپے (غیر مجلد) ۲۰۰ روپے (مجلد)

ملنے کا پتہ

پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

فہرست

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴) کی تصانیف میں الفاروق کو فضیلت کلی حاصل ہے۔ سیرۃ النبیؐ ان کا سرمایہ حیات ہے مگر اس میں دوسروں کے خون جگر کی بھی گلکاری ہے۔ دوسری سوانحی تصانیف میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ ان میں مواد ہے، تحلیل وتجزیہ ہے، تنقید وتبصرہ ہے، اسلوب وانداز بیان انشا پردازی کا حسین نمونہ ہے، پیشکش کی جادوگری ہے، قلم شبلی کی جلوہ سامانی ہے۔ سب کچھ ہے مگر وہ الفاروق کی سی جامعیت اور کلی فضیلت نہیں۔ ان کے فضائل جزوی ہیں، بعض بعض تو بہت عظیم وجلیل ہیں، دوچار تو شاید الفاروق کے اپنے ہم پلہ فضائل سے بھی برتر ہوں مگر مجموعی گراں قدری، کلی فضیلت، ہمہ گیر فوقیت الفاروق کو حاصل ہے، شاید یہ شیخین کی فضیلت کلی کا پرتو ہے۔

الفاروق کی سب سے بڑی فضیلت آج بھی یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی حیات وعہد پر اس سے بہتر کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ اردو، عربی، فارسی، انگریزی کی حدتک یہ بات دعوے کی حدتک کہہ سکتا ہوں۔ دوسری زبانوں میں اگر اس پایہ کی کتاب لکھی گئی تھی تو ہم تک نہیں پہونچی۔ ایمان ویقین کی دنیا تبلیغ وعلم سے ہی آباد ہوتی ہے۔ الفاروق ہمارا مشاہدہ ومطالعہ بھی ہے اور علم وایقان بھی۔

کہنے کو وہ سوانح ہے لیکن حق یہ ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے جوہری دور اور معماری عہد کی تاریخ ہے۔ مؤرخین مغرب بلا شبہ سوانحی کتب کو تاریخ کے ذخیرے میں شامل نہیں کرتے اور عمومی طور سے کرنا بھی نہیں چاہئے لیکن سیرت نبوی اور سوانح خلیفہ اسلامی کو تاریخ اسلامی سے جدا نہیں کیا جاسکتا تاریخ عظیم اشخاص اور جلیل شخصیات کے کارناموں کا

دفتر اور ان کی پروردہ نہ ہو مگر وہ رسولوں اور خلفاء کی تعمیر کردہ ضرور ہے فکر، ایمان، یقین، اقدار اور حسن عمل ان ہی اداروں سے آتا ہے جو تاریخ انسانی کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔

وہ ایک تحقیقی، تاریخی اور علمی کتاب ہے۔ تحقیق کے تین بنیادی معیار ہوتے ہیں: مواد کی جمع و تدوین، اس کی چھان پھٹک، تحلیل و تنقیح، اور تنقیدی و تجزیاتی انداز میں اور قابل قبول اسلوب میں اس کی پیش کش۔ الفاروق ان تینوں معیاروں پر کھری اترتی ہے۔ سوانح فاروقی اور تاریخ اسلامی کے تمام دستیاب مصادر سے مواد تحقیق جمع و مدون کیا گیا، ان کی خوب تنقیح و تحلیل کی گئی، تنقید و تجزیہ سے ان کو گزارا گیا اور خوبصورت حسین ادبی، علمی اسلوب میں اسے پیش کیا گیا۔

تاریخی اعتبار سے وہ اسلام کے دوسرے سب سے بڑے عہد کی دستاویز ہے، وہ محض خلیفہ دوم کے زمانے سے شروع نہیں ہوتی۔ وہ سیرت نبوی اور عہد اسلامی کے بنیادی عہد سے ایسی پیوستہ ہے جیسے عمارت بنیاد سے ہوتی ہے اور وہ اس پر ختم بھی نہیں ہوتی کہ خلافت فاروقی پر بعد کی تمام خلافتیں استوار تھیں۔ بقول شاہ ولی اللہ دہلویؒ نبوت محمدی کی توسیع اور اس کا تسلسل خلافت راشدہ میں جاری ساری نظر آتا ہے۔ حقیقت بیں جانتے ہیں کہ خلافت راشدہ کا جوہری دور عہد فاروقی ہے۔ عہد عثمانی اسی کی ایک شاخ، عہد مرتضوی اسی پر مبنی اور بعد کے ادوار خلافت اس کے مرہون منت ہیں۔

خلافتِ دوم کی حیثیت اور خلیفہ ثانی کی منزلت کے اعتبار سے الفاروق اسلام کے معمار دوم کی سوانح حیات ضرور ہے لیکن کس عظیم و جلیل، مرد مجاہد اور بطل اسلام کی حیات و سوانح ہے۔ انفرادی اور انسانی اوصاف ثریا سے ہم دوش بلکہ حظیرۃ القدس سے ہم عناں۔ خلیفہ اسلام کی خدمات اور اولیات کی بنا پر مہر نبوت سے پیوستہ خاتم المرسلین ﷺ نے انہی اوصاف کی بنا پر فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی آتا تو وہ عمر ہوتے اور ان کے معاصرین ان کے اسلام کو طاقت، ان کی خلافت کو رحمت اور ان کی شہادت کو مصیبت کا درجہ دیتے تھے۔

اس کا علمی پایہ آسمانِ ہفتم سے پیوست ہے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ ہر اعتبار

سے الفاروق کا مقام و مرتبہ تصانیف شبلی میں بلند ترین تو ہے ہی، دوسری سوانح اور کتب تاریخ میں بھی منفرد و بلند تر ہے۔ ہر واقعہ بلکہ ہر جزئیہ تاریخی شہادت سے مدلل و مستند ہے۔ بلاثبوت و بلاسند کوئی بات درج نہیں کی گئی حوالہ کی کتابوں میں بھی افضل و غیر افضل کی درجہ بندی کی گئی اور صرف افضل کتب سے بنیادی اور جوہری باتیں لی گئیں ثانوی کتب سے ان کے ثانوی مرتبے کے مطابق تحلیل و تنقید کا وہ بلند عالم کہ اس سے بہتر شاید شبلی خود بھی نہ کر سکتے تجزیہ عالمانہ، پیش کش فاضلانہ اور اسلوب محققانہ۔

شبلی کی تاریخ نویسی اور اس کے اسلوب پر بالعموم تنقید کی جاتی ہے۔ بیشتر ناقدین مؤرخین نہیں اور فنِ تاریخ سے کوئی مس نہیں رکھتے۔ کسی مدرسہ یا کسی جامعہ سے فراغت فنی تخصص عطا نہیں کر دیتی۔ یہ کسب و اکتساب سے زیادہ تعلیم فن و تربیت مذاق کا جاں سوز مرحلہ ہے۔ اب ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ہے۔ تاریخ نویسی محض واقعات و کوائف کو مختلف کتابوں سے نقل کر دینے کا کام نہیں، نقد و تجزیہ بھی اسی طرح دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے اگلنے اور اپنے مرغوبات کو بیان کرنے کا فریضہ نہیں۔ نقد و تبصرہ فنی تخصص کے بغیر تحسین ناشناس ہے تو کبھی تنقید جاہلاں۔

تاریخ نویسی میں تمام دستیاب مواد کا استقصاء ممکن ہے نہ مطلوب۔ ضروری اور بنیادی مواد کا جوہر اور عطر کشید کر کے اسے صحیح تناظر میں پیش کرنا واجب ہے اور شبلی نے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا ہے، بالخصوص الفاروق میں ان کا فن تاریخ نویسی اپنے بلند ترین معیار پر ہے۔ اگر چہ ان کو اپنے زمانے میں بعض اہم ترین مصادر حاصل نہ تھے لیکن ان کی کمی انہوں نے دستیاب ماخذ کی روایات اور شواہد سے اکتساب نور کر کے خلاؤں کو پرنور کر دیا آج تمام مصادر و مآخذ کی موجودگی اور حصول و دستیابی کے باوجود الفاروق جیسی کتاب نہیں لکھی جا سکتی کیونکہ مواد کی موجودگی اور دستیابی جتنی ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ لازمی ہے اس ملبہ سے تعمیر کی صلاحیت۔ تاج محل بار بار نہیں بنا کرتے۔ نہ مسجد قرطبہ دوبارہ تعمیر ہو سکتی ہے۔

اسلوبِ شبلی پر ایک عامی تبصرہ یہ پایا جاتا ہے کہ انشا پردازانہ زیادہ ہے مؤرخانہ کم

ان کا رنگین ودلکش اسلوب بیان تاریخ کے لئے موزوں نہیں۔ یہ رائے جزوی طور سے تو صحیح ہوسکتی ہے مگر حقیقت میں بے مایہ ہے۔ ایسے ناقدین میں بالعموم صاحبان اسلوب شامل ہیں، ان میں مؤرخانہ ژاف نگاہی کی کمی ہے۔ وہ مؤرخ ادیب کی دوگانہ فنی نظر سے محروم ہیں یہ شبلی ان دونوں ''نظروں'' سے آراستہ تھے کہ ان کی دونوں آنکھیں اس وقت پوری طرح کام کرتی تھیں۔

بلا شبہ شبلی کہیں کہیں خالص فنی ادبی اور انشا پردازانہ جلوہ طرازی کر جاتے ہیں۔ ایسا ان کی ایک مجبوری کے تحت ہوتا ہے۔ ان میں ایک شاعر (دردمند) ایک ادیب ہوشربا اور ایک غزل گوے دلربا بھی موجود تھا۔ وہ کبھی کبھی زور لگا کر اپنی بات ان کے قلم سے کہلوا لیتا ہے۔ وہ جذبات آفرینی یا خطابت نگاری اور شاعرانہ گفتاری سے کام بھی ہوشمندی سے لیتے ہیں۔ سیرت النبی میں ظہور قدسی ایک خاص فضا اور ماحول کی تصویر کشی کے لئے بالارادہ کی گئی ہے، الفاروق میں انفرادی اوصاف نگاری میں وہ جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ عظیم وجلیل خلیفہ اسلام سے ان کی شیفتگی کی بے اختیارانہ کشش کا نتیجہ وشاخسانہ ہے۔ عام انداز بیان اور کلی اسلوب خالص تاریخی علمی، فنی اور غیر شاعرانہ اور غیر انشا پردازانہ ہے۔ ان کے اسلوب کی ادبی سلاست اور فنی نجابت اس کو ایک سحر حلال کا درجہ دیتی ہے جو تاریخ نگاری کو کہیں مجروح وزخمی، پامال وپژمردہ اور بے تال وبے سر نہیں کرتی۔ شبلی کا سادہ اسلوب بھی حسین کشش رکھتا ہے جس سے بے بصروں کو کج بینی، بے دلوں کو غلط فہمی اور بے دردوں کو بدتوفیقی ہوجاتی ہے۔

الفاروق پر ایک غیر عالمانہ تبصرہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کو ایک شہنشاہ کے روپ سروپ میں پیش کیا گیا ہے، اسلام کے ایک خلیفہ اور شیدائی کی حیثیت سے نہیں شبلی کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی نے تو یہ ستم فرمایا کہ سیرت نبوی کو دل سے اور الفاروق کو دماغ سے لکھی کتاب قرار دے کر دونوں کا غلط موازنہ کیا اور اپنی رائے سے دوسروں کو متاثر کیا۔ یہ دونوں آراء انفرادی اور ان کے ماننے والوں کے اپنے جذبات اور خیالات کی زائیدہ اور نمائندہ ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ الفاروق میں ایک عظیم الشان، جلیل القدر اور بطل اسلام خلیفہ ہی نظر آتے ہیں ان کے انفرادی اوصاف وصفات کا بیان الفاروق اس کا شاہد عدل ہے۔ وہ کسی شہنشاہ کے اوصاف نہیں ہوسکتے۔ وہ صرف خلیفہ اسلام کی صفات ہی ہیں۔ البتہ وہ خانقاہ نشیں اور خاک نشیں صوفی اور دنیا سے بیزار اور انسان وحیوان سے کنارہ کش عبادت گذار کے بھی اوصاف نہیں جن کی تلاش اس قسم کے ناقدین کو رہتی ہے۔ وہ فاروق اعظم تھے، شخص وشخصیت کے اعتبار سے پر جلال و پرہیبت انبوہ میں کھڑے ہوں تو سب سے بلند وبالا۔ تنہا ہوں تو اپنی ذات میں انجمن۔ حضور الٰہی سجدہ ریز وخاک نشیں اکابرو اساطین کے درمیان عظمت وجبروت کے پیکر، عوام وجمہور میں محبوب ومکرم اور خواص واخص میں صاحب تمکنت واختیار۔ ایسے عظیم وجلیل شخص کی سوانح اور ایسے کبیر ومدبر خلیفہ کی تاریخ صرف الفاروق کا اسلوب ہی رقم کرسکتا ہے۔

رہی شاگرد رشید کی ''دل ودماغ'' کی کشمکش۔ یہ شبلی کی نہیں، ان کی اپنی تھی، الفاروق میں شبلی کا دل بھی اسی طرح دھڑکتا ہے جس طرح ان کا دماغ جلوہ سامانی کرتا ہے۔ وہ سیرت النبی سے ''دل ودماغ'' کی ہم آہنگی میں کسی طرح کم نہیں۔ بس فرق ہے کوکب فیض کے معیار واعتبار کا۔ سیرت النبی رسول اکرم ﷺ، خاتم النبیین، سید المرسلین اور شہنشاہ دوعالم کی سیرت وتاریخ ہے۔ اس سے شیفتگی اور فریفتگی شبلی کا جزو ایمان ہے۔ وہاں فکر ونظر سے زیادہ قلب وروح کی حکمرانی ہے۔ ان جیسا کوئی نہیں ہوسکتا اور ان کی سیرت جیسی کوئی سیرت نہیں ہوسکتی۔ شبلی کا یہی خیال وعقیدہ تھا اس لئے وہ دبیر چرخ اور روح الامین کی سیرت نگاری کو بھی شایان شان نہیں سمجھتے، صرف بارگاہ عالم قدوس کی جلوہ سامانی اور رقم طرازی کو اس کے لائق قرار دیتے ہیں۔

عمر فاروقؓ اسی بارگاہ عالم قدوس کے موضوع سیرت کے محبوب و پرداختہ تھے ان کا مقام ومرتبہ، ان کے اوصاف جمیلہ، ان کی بلند وبالا شخصیت، ان کے تمام شخصی کمالات، ان کے تمام خلافتی اولیات اور حکومتی امتیازات اسی محبوب ومرجع عالم ﷺ کے عطیات تھے۔ شبلی جانتے تھے کہ محمد ﷺ نہ ہوتے تو عمر نہ ہوتے۔ اور عمر جو کچھ ہیں وہ محمد کے بنائے

ہوئے ہیں۔ لہذا ان کے دل و دماغ میں محمد اور عمر دونوں کے مقامات کی درجہ بندی کا امتیاز واضح تھا۔ وہ عمرؓ کے اس طرح والہ وشیدا اور ان پر فریفتہ اور ان کے شیفتہ ہیں جس طرح ان کے رسول مکرم کے اور دونوں میں یہی فرق ہے جو صاحب وبندہ میں ہوتا ہے۔

بلاشبہ الفاروق شبلی کی قلبی نظر اور دماغی فکر کا آئینہ خانہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے الفاروق عظیم وکبیر خلیفہ اسلام کا آئینہ ہے اور جس طرح سیرت النبی رسول اسلام کا تمثال ہے۔ مگر یہ بھی فرق ملحوظ رہے کہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح حضرت فاروق اعظم کی شخصیت وخدمات نویسی کا فریضہ انجام نہیں دیا جاسکتا۔ دونوں میں ایک انچ کی کسر رہ ہی جاتی ہے کہ ہمارا۔ ہم سب کا۔ قلم محدود صلاحیتوں کا محدود اظہار کرسکتا ہے۔ وہ ہمارے جذبات افکار اور حالات کی ترجمانی میں قاصر ہے تو ان پیکران صدق وصفا کی بھرپور ترجمانی وتصویر کشی کیسے کرسکتا ہے ہاں تھوڑا سا حق ادا کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے اور شبلی نے تو بھرپور کوشش کر ڈالی ہے۔

الفاروق کی علمی، فنی، تاریخی، تحقیقی اور اسلامی جہات کا یہی تقاضا تھا کہ اس پر ایک خاص سمینار اور مذاکرہ کا خیال ازغیب دل خاکسار پر وارد ہوا۔ وہ قلب وجگر اور روح سے ہوتا ہوا دماغ وذہن پر چھا گیا اور پھر پورے وجود پر مسلط ہوگیا۔ خدشہ صرف ایک بات کا رہا کہ صرف ایک کتاب پر پورا مذاکرہ علمی برپا کرنا کہاں تک گوارا ہوگا۔ موزوں ومناسب تو تھا ہی۔ اکابر علی گڑھ اور دانشوران جامعہ کے علاوہ اپنے خاص بزرگوں، رفیقوں، عزیزوں اور طالب علموں سے مشورہ واستفساء کیا۔ ہر کہیں سے تائید وتوثیق کی مہر ثبات نہیں ملی بلکہ تحسین وآفریں کے ڈونگرے برسے۔ خیال کی رعنائی اور فکر کی برنائی کی وہ حوصلہ افزائی ہوئی کہ مذاکرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا

سنہ انیس سو اٹھانوے، ناوے میں مذاکرہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ وجہ یہ بتائی کہ کتاب مستطاب کی تالیف واشاعت پر پوری ایک صدی گذر گئی۔ یوم وفات شبلی مقرر کیا کہ روح پرفتوح سے مناسبت تھی اور دل سے راحت۔ لیکن قضا وقدر کے فیصلے، ملکی حالات کی ابتری نے جامعہ کے کوائف خراب کیئے۔ اور سمینار الفاروق ملتوی ہوا۔ قضائے مبرم کا

البتہ فیصلہ تھا کہ سمینار ضرور ہی منعقد ہوگا لہذا گذشتہ ۱۸۔ ۱۹ نومبر ۲۰۰۱ء میں الفاروق سمینار کا انعقاد ہوا اور اس میں مختلف اہل علم اور اصحاب فکر نے شرکت فرما کر اسے اعزاز وافتخار بخشا۔

مذاکرہ محض مقالات کی خواندگی اور سماعت کا کام نہیں جیسا کہ بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ وہ افکار وخیالات کے تبادلے، عقائد ونظریات کی اصلاح، ذہنی صیقل گری اور روحانی انشراح وارتقاء کا کام بھی کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی منفی اثرات بھی مرتب کرتا ہے مگر اہل ایمان وایقان ان سے بھی تقویت ایمان کا مواد حاصل کر لیتے ہیں۔ اور کسب نور کر کے قنادیل ہدایت جلاتے ہیں مذاکرہ وسمینار کا دوسرا عملی پہلو یہ ہے کہ ایک موضوع پر بہت سے صاحبان فکر کے مقالات اور مضامین مل جاتے ہیں جو ایک ٹھوس، مفید تر شکل میں اصلاح وارشاد، رہنمائی اور تربیت کا کام کرتے ہیں۔ موجودہ مجموعہ اسی الفاروق سمینار میں پیش کئے جانے والے مضامین ومقالات پر مشتمل ہے اس کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا جو وعدہ سمینار کے موقع پر کیا تھا وہ الحمد للہ آج پورا ہو رہا ہے۔ اس کی تکمیل وترتیب میں ہمارے تمام مقالہ نگاروں کے علاوہ ہمارے رفقائے کار کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے۔

نام گنانے میں کبھی کبھی کیا اکثر وبیشتر شمار کی غلطی ہو جاتی ہے۔ جن کا نام رہ جاتا ہے وہ برا مانتے ہیں حالانکہ ان کا نام دل کی لوح پر روشن حروف میں لکھا ہوتا ہے جو سیاہی سے لکھے نام سے زیادہ پائیدار وجاگزیں ہوتا ہے لیکن ہماری علمی دنیا اور تصنیفی عالم میں اب لکھے ہی کو سند سمجھا جاتا ہے خواہ اس لکھے پر روبروئے خلق یا بارگاہ قدوس میں ہماری پیشی ہو جائے۔

بہر حال بعض نام اور کئی احباب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا صریح ذکر کئے بغیر احسان شناسی اور ممنونیت بندہ کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ ان میں اپنے دو بزرگوں اور دو ساتھیوں کا ذکر سب سے پہلے کرتا ہوں بزرگوں میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی اولین ہیں کہ ناظم ندوۃ العلماء اور صدر رابطہ ادب اسلامی ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہیں۔ میرے لئے تو وہ سب سے بڑے مربی، معلم اور محسن ہیں۔

شروع سے آخر تک خاکسار کے استاذ عالی مقام رہے۔ جو کچھ لکھنا پڑھنا آیا وہ ان ہی کا فیضان ہے دوسروں کا فیضان اس سے پہلے یا اس کے بعد ہے۔ مولانا موصوف کا خاص کرم یہ بھی رہا کہ اس علمی مذاکرے میں اپنے بہت سے سرکاری، علمی اور منصبی فرائض چھوڑ کر شرکت کے لئے تشریف لائے اور اپنے گراں قدر خطبے سے ہماری توقیر بڑھائی۔ ان کی یہ آمد اس لحاظ سے بھی بہت اہم اور نادر ہے کہ وہ شبلی گرامی کی قدر شناسی کی سند بنے دوسرے عظیم بزرگ، رہنما اور سرپرست ہمارے استاذ الاساتذہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری مدظلہ العالی ہیں انہوں نے نہ صرف اس مذاکرے کی بلکہ ہمارے شعبہ اور ادارہ کے تمام سمیناروں اور مذاکروں کی جو عالمانہ سرپرستی فرمائی ہے وہ تاریخ مسلم یونیورسٹی میں نادر وبیمثال ہے۔ وہ اسلامیات کے عبقری مفکرین اور شبلی کے اہم ترین قدر شناس۔ ان کی قد آور شخصیت اور ان کی بیکراں محبت وسرپرستی کے سامنے یہ شکر گذاری محض ہیچ ہے۔

اپنے عزیز رفقائے کار میں ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی اور ڈاکٹر عبد المجید خاں صاحب کا بطور خاص شکر گذار ہوں ان دونوں نے تعاون، تعامل، کارگذاری، خدمت گذاری، فعالیت، مردانگی، زیرکی، محنت، غرضکہ اقدار عالیہ مطلقہ کی وہ تابندہ ودرخشندہ مثال قائم کی ہے جو انہیں خود سعادت دارین کی طرف لے جاتی ہے اداروں اور شعبوں کی تعمیر وتشکیل، احیاء وارتقاء اور کارکردگی وآدم گری کی روایت قائم کرتی ہے۔ ایسے ہی مخلص وبے لاگ اور جان نثار رفیقوں اور معاونوں کی بدولت دل فتح ہوتے ہیں، ملکوں کی تسخیر ہوتی ہے اور علوم وفنون کے چراغ جلتے ہیں مجھے یہ اعتراف کرنے میں خوشی سے زیادہ طمانیت وافتخار محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں بازوؤں کے بغیر ہمارے اکثر علمی مذاکرے اور تصنیفی منصوبے نامکمل رہ جاتے یا سرے سے وجود پذیر ہی نہ ہوتے۔ ہمارے تیسرے ساتھی ڈاکٹر عبد الحمید فاضلی اپنی محنت، لگن اور تعلق خاطر اور فرض شناسی کی بدولت ''اصحاب ثلاثہ'' کے زمرہ میں آتے ہیں۔

ہمارے کئی سینئر اصحاب کار اور رفقائے ادارہ میں پروفیسر عبد العلی، ڈاکٹر اعظم قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ ان کے علاوہ دوسرے بزرگوں،

عزیزوں اور طالب علموں کا بھی پورا پورا تعاون ملا ان سب کا مجموعی شکریہ ادا کرنا واجب ہے، نوجوان عزیزوں میں ڈاکٹر جمشید احمد ندوی کی محبت آمیز اور اطاعت آگیں معاونت کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ وہ علی گڑھ کے ان ذہین وفطین اور مستعد و فعال اصحاب قلم وتحقیق میں ہیں جن سے امید بندھتی ہے کہ ہماری عظیم یونیورسٹی اپنی روایات علم وفضل اور آثار سعادت ومعاونت آنے والی نسلوں میں بھی باقی اور تروتازہ رکھے گی۔ اللہ تعالی ہر دو کو نظر بد سے بچائے۔

سب سے آخر میں اپنے محسن ومنعم حقیقی جل مجدہ کی جناب میں شکر بجا لاتا ہوں کہ اس کے فضل وکرم کی کوئی انتہا نہیں اور ہماری ساری کاوشیں بشمول موجودہ اس کے فضل وانعام کے مظاہر ہیں۔ اس سے دعا ہے کہ وہ ہماری مساعی کو بار آور کرے اور انہیں قبول فرما کر ہمارے لئے توشہ دنیا وآخرت بنائے۔ آمین

۱۲/ اپریل ۲۰۰۰ء

محمد یسین مظہر صدیقی
الامین، احمد نگر علی گڑھ،

ادارہ علوم اسلامیہ کی مطبوعات

۱۔	البیان فی اعجاز القرآن	ڈاکٹر عبدالعلیم	۱۹۵۳ء
۲۔	Post Revolution Persian Verse	Dr Munibur Rahman	1955
۳۔	United States & the Arab World	M. Shafi Agwani	1955
۴۔	ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق	عبدالعلیم	۱۹۵۶
۵۔	Wither North Africa	Nicolazadeh	1957
۶۔	برگزیدہ شعر فارسی۔ حصہ اول	منیب الرحمٰن	۱۹۵۸
۷۔	جدید فارسی شاعری	منیب الرحمٰن	۱۹۵۹
۸۔	Masudi Millenary Celebration Volume	S. Maqbul Ahmad	1960
۹۔	Arab Geography	Dr. S. Muzaffar Ali	1960
۱۰۔	کتاب فضائل من اسمہ، احمد أو محمد	مختار الدین احمد آرزو	۱۹۶۱
۱۱۔	معرفۃ المذاہب	عبدالعلیم	۱۹۶۲
۱۲۔	المختار من شعر ابن دمنہ	مختار الدین احمد آرزو	۱۹۶۲
۱۳۔	برگزیدہ شعر فارسی۔ حصہ دوم	منیب الرحمٰن	۱۹۶۳
۱۴۔	Types of Islamic Thought	Dr. Sabih A. Kamali	3691
۱۵۔	ترکی	اکمل ایوبی	۱۹۶۳
۱۶۔	عراق	محمود الحق	۱۹۶۴
۱۷۔	Islamic Sciences	S.M. Hasan Qaisar	1965
۱۸۔	The Arab League	M. Iqbal Ansari	1968
۱۹۔	A Versified Treatise on Mysticism of Zaheeruddin Muhammad Babur	N. Akmal Ayyubi	1968

تعارف نامہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی :

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، رابطہ ادب اسلامی عالمی کے مشرقی خطے کے صدر، متعدد دینی علمی اداروں کے رکن رکین اور منصب دار، اصلاً عالم واستاذ ومربی، متن قرآن کریم اور اس کے دقائق کے ماہر، معانی ومفاہیم مراد الٰہی کے عظیم ترجمان، ادب عربی سے زیادہ قرآنیات کے رمز شناس، اساتذہ وطلبہ کے مربی ومحسن، خلیق وپاکباز، عظیم وخاکباز، ایک جلیل خانوادہ کے فرد فرید اور ملتِ اسلامی کے قائد وفلسفہ باف، علماء ہند میں انفرادی مقام کے حامل ومالک۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی :

دار المصنفین کے ناظم، اس کے موقر رسالے کے مدیر کبیر، فکر فراہی کے ترجمان ووکیل، شبلی وسلیمان کے حامی وناصر، مشرقی روایات اور علمی اقدار کے امین ووارث، متعدد کتب علمی کے مؤلف کبیر اور ان گنت مقالات کے لکھنے والے، مرنجان مرنج مگر نظریات وعقائد میں پختہ، وسیع المشرب مگر فکر خاص سے پیوستہ، اخلاق عالی اور بے نفسی کے پیکر، خوردوں اور بندوں کے مربی وپرور، عظیم اسلامی دینی روایات کے پیکر اور سادگی وپرکاری کے مظہر۔

ڈاکٹر جمشید احمد ندوی :

قدیم صالح اور جدید نافع کے مجمع البحرین، علمی ذوق اور تحقیقی مزاج رکھنے والے نوجوان، ان تھک محنت اور ثمر بار علمیت کے شناور، خدمت ومحبت میں فرد، اردو عربی میں سلیس اسلوب اور ادبی انداز کے جاننے والے، متعدد مقالات ومضامین کے مؤلف، صلاح وفلاح کے مالک، نرم گوئی، حسن خُلق، بشاشت وانبساط کے رمز آشنا نوجوانوں کے طبقہ میں اپنی صلاحیت ولیاقت، علمیت وتحقیقات اور جہاد ومجاہدہ پیہم کے لئے ممتاز۔

مفتی محمد مشتاق تجاروی :

قدیم اسلامی علوم وفنون میں ٹھوس صلاحیت وصلابت کے مالک، جدید علوم وفنون کے ماہر وعالم علوم اسلامی کے ماہر، حدیث نبوی، قرآنیات اور فقہ کے علوم پر گہری نظر اور

بصیرت رکھنے والے، جدید اردو ادب کے نبض شناس محقق، افتاء وفتویٰ کے متخصص مگر صلاحیت ولیاقت میں حدیث نبوی کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ مرنجاں مرنج منکسر المزاج، احتیاط پسند، تقویٰ شعار اور بے پناہ محنت وصلاحیت کے مالک۔

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی :

قہاری وغفاری اور قدوسی وجبروت کے پیکر، ندوہ کے ممتاز ترین عالم، علی گڑھ میں سرسید ثانی، مردم گری، علم پروری اور تحقیق کی ہمت افزائی میں بے مثال، وسعت ظرف کا یہ حال کہ پوری دنیا کو سمونے کو تیار، اسلامی تاریخ میں بین الاقوامی شہرت کے حامل، رسول مقبول ﷺ، صحابہ کرام اور خلفائے عظام کے ممتاز سوانح نگار ہی نہیں بلکہ ان کے وکیل وترجمان اور دفاع کیلئے ہمہ وقت تیار مجاہد قلم، استاذ الاساتذہ محسنوں کے محسن، علماء اور دانشوروں کی کہکشاں سجانے والے عظیم ترین مصنف ومصنف گر، معاصرین میں بے بدل دانشور۔

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی :

علوم قدیمہ وجدیدہ کے جامع، عالم دین اور ماہر طب، اردو۔ عربی ادب پر گہری نظر رکھنے والے، دونوں زبانوں میں اظہار خیال پر قادر، قرآنیات سے خصوصی شغف، فکر مودودیؒ کے شارح وترجمان، عمدہ نقد ونظر سے بہرہ ور، مطبوعات جدیدہ وقدیمہ کے مبصر، فکرِ فراہیؒ کے ناقد وقدر شناس، متعدد کتابوں کے مؤلف اور مقالات ومضامین کے مصنف۔ دینی اور علمی اداروں کے رکن رکین اور متواضع ومخلص اسلامی کارکن۔

مولانا محمد اسلام عمری :

ایک بلند پایہ دینی ادارہ کے فارغ، فکرِ اسلامی کے خاص مکتب سے وابستہ اور کارکن، کتاب وسنت کے عالم، عمل بالحدیث کے مکتبہ فکر کے پرجوش داعی اور عامل، متعدد مقالات کے لکھنے والے، اردو ترجمہ میں مہارت رکھنے والے، علماء واہل علم کے خدمت گذار مومن سادہ کی مثال، متواضع، حلیم اور منکسر المزاج، وسیع المشرب اور بلند خیال، علمی اور دینی اداروں سے وابستہ۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی :

بلند پایہ عالم، حقیقت جو دانشور، علم وتربیت کے قدیم فکروں کا سنگم، اردو۔ عربی

انگریزی پر وسیع قدرت رکھنے والے، بہت سے مقالات ومضامین اور متعدد علمی کتب کے مؤلف، بین الاقوامی رسائل وجرائد کے مستقل لکھنے والے، تاریخ ہند بالخصوص اسلامی معاشرتی تاریخ کے قابل ذکر محقق، تاریخ فقہ اور ہندی فقہیات کے پارکھ، مرنجان مرنج اور وسیع المشرب، اسلامی مشرقی روایات کے امین وپاسدار۔

ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری :

فاروقی صلابت اور اسلامی انکسار کے پیکر، خالص اسلامی علی گڑھ کی پیداوار، استاذ ادب عربی اور محقق اسلامیات، اردو۔ عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر وسیع دسترس رکھنے والے، عمدہ مترجم اور خاص اسلوب کے مالک، مقالات تحقیقی وعلمی اور کتب علمی کے مؤلف، وسیع القلب، معاونت وتعاون کے پیکر، محبت آمیز والفت آفریں، سارے جہاں کا درد جگر میں رکھنے والے مومن۔

ڈاکٹر توفیر عالم فلاحی :

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ کے عالم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈاکٹر۔ قدیم وجدید علوم وفنون کے جامع، قرآنیات سے خصوصی شغف رکھنے والے اور فکر فراہی کے شارح وترجمان، فکر اسلامی سے وابستہ، اردو انگریزی میں متعدد مقالات اور کتابوں کے مؤلف، فکر سرسید کے عالم ووکیل، متعدد دینی اور علمی اداروں سے وابستہ، فکر وعمل میں خاص مسلک اور مخصوص ہیئت کے پیکر۔

ڈاکٹر عبد الحمید فاضلی :

ندوی عالم لہذا عربی ادب پر گہری دسترس کے مالک، مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر اور تحقیق شناس اردو عربی پر متعدد مقالات کے مؤلف، مولانا مسعود عالم ندوی پر گہری نظر رکھنے والے اور ان کے سوانح نگار، استاذ اسلامیات، متعدد علوم وفنون اسلامی پر عمدہ بصیرت کے مالک، انتہائی فعال ومتحرک اور زندہ وتابندہ، عمل ومجاہدہ کے داعی اور پیکر، سیاسیات جامعہ سے واقف اور ہنر مند۔

ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی :

عظیم دار العلوم دیوبند کے فرزند دل بند اور مسلم یونیورسٹی کے محقق ڈاکٹر۔ قدیم علوم

اور جدید فنون کے عالم استاذ ادب عربی پیشہ سے مگر استاذ و عالم اسلامیات اصل سے۔ اردو عربی اور انگریزی پر قادر، تینوں زبانوں میں مقالات وکتب کے مؤلف، انتظامی صلاحیتوں سے بہرہ ور، متحرک وسیلابی وسیمابی مزاج کے مالک اقدار عالیہ کے پیکر، خلوص ومحبت کے مظہر، صاحب دل اور صاحب علم اور زود رنج شخصیت۔

ڈاکٹر انجم آراء فلاحی :

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ سے عالمہ وفاضلہ کی سند رکھنے والی، اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ڈاکٹر ادب عربی۔ اردو عربی اور علوم اسلامی پر فکر خاص رکھنے والی، فکر اسلامی سے وابستہ، بہبود نسواں کی وکیل وترجمان، خواتین کی تحریکات سے واقف اور سرگرم کا رکن، متعدد مقالات کی مؤلفہ اور بہت سے سمیناروں کی شریک وسہیم، خواتین صف علماء میں منفرد مقام کی حامل، علوم وفنون کی شیفتہ وفریفتہ۔

مولانا نظام الدین اصلاحی :

عظیم ترین علمائے ہند میں منفرد و بلند مقام کے مالک، فکر اسلامی کے وکیل وشارح، وسیع المشرب اور وسیع المطالعہ، اداری، مسلکی اور جماعتی تعصبات سے بلند، حقیقت دین اور واقعیت علم کے خوگر، بندہ پرور وبندہ نواز، دلآویز شخصیت اور محبت آگیں روح کے مالک، استاذ الاساتذہ، معلم عالی، مربی خالص اور محسن بلند پایہ، متعدد مقالات وکتب کے مؤلف، عمدہ مقرر، علمی اور دینی اداروں کے ممتاز ومحترم رکن وصدر۔

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی :

علوم اسلامیہ اور فنونِ جدیدہ کے عالم وماہر، تعلیم وتربیت کے روایتی وعصری دھاروں سے سرشار، ممتاز عالم دین اور بلند پایہ محقق دانشور، اردو عربی انگریزی پر قدرت رکھنے والے مجمع البحار، متعدد بلند پایہ کتابوں کے محترم مؤلف اور بے شمار علمی تحقیقی مقالات کے مصنف۔ فکری تحقیق اور علمی جدوجہد کی نادر مثال تنظیم وتحریک اور دلآویزی ودلفریبی کے گروں سے آراستہ، انتہائی عمدہ منتظم اور اجتماعیت پسند، فکر وتحقیق اور علمی کمالات میں منفرد وفرید۔

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی :

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے عالم وفاضل، مسلم یونیورسٹی کے محقق

وڈاکٹر۔ معاشیات بالخصوص اسلامی معاشیات کے استاذ، عالم اور محقق، اردو عربی انگریزی میں بلند پایہ کتابوں اور مقالات کے مؤلف، فکر فراہی سے وابستہ اور وسیع المشرب، صلح کل کے عامل وفہیم دانشور، اخلاق عالی کے مالک اور مخیر وکارگذار متعدد دینی اور تحقیقی اداروں سے وابستہ اور بعض کی روح رواں، اقدارِ اسلامی سے بہرہ منداور حقیقت شناس۔

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :

شریعت وطریقت کے پیکر ومجمع البحرین، عصری ہندی اور عربی جامعات کے پروردہ وپرداختہ، وسیع المطالعہ وسیع المشرب عالم صوفی، حقیقت پسند عالم اور ناقد، اقدار اسلامی کا چلتا پھرتا پیکر، محبت وعقیدت اور تعاون ومعاونت کے خوگر، اردو عربی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان کے ماہر، علماء عصر میں ممتاز مقام کے مالک عمدہ مقرر اور بلند پایہ مترجم۔ بزرگوں کا احترام کرنے والے، خوردوں پر شفیق، نگاہ بلند سخن دلنواز کے پیکر۔

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی :

اردو ادب کے معروف لکھنے والے، متعدد مقالات اور کتابوں کے مؤلف، تحقیق وعلم کی مشرقی اور اسلامی روایات کے پاسدار، فکر شبلی وسلیمان کے پارکھ اور ترجمان، محنت، علم، تحقیق اور فکر ونقد میں انفرادیت کے حامل، استاذ ادب اردو مگر اسلامیات سے وابستہ، ان تھک محنت اور بلند پایہ تحقیقات کے دلدادہ، علم وکمال کی دنیا میں ابھرتے ہوئے نوجوان محقق وعالم۔

مولانا محمد جرجیس کریمی :

عمرآباد کے دینی ادارہ کے عالم، فکر اسلامی سے وابستہ، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کے رکن، مقالات علمی کے مؤلف، عمل بالکتاب والسنہ کے داعی، محنت، جستجو، تلاش اور نقد ونظر کے خوگر، سلیس اردو اسلوب کے مالک، اسلامیات اور عربی زبان پر قدرت رکھنے والے نوجوان ابھرتے ہوئے مصنف وعالم اور مرنجان مرنج، منکسر المزاج شخصیت کے مالک اور اقدار اسلامی کے داعی وعامل۔

احسان اللہ خاں ندوی :

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ، مسلم یونیورسٹی شعبہ عربی کے اسکالر، اردو

عربی اور انگریزی پر قادر متعدد مقالات کے لکھنے والے، نوجوان محقق اور عالم، محنت ولگن کے پیکر، اخلاق عالیہ اور اقدار اسلامی کے جوہر شناس، ادب عربی سے خصوصی شغف رکھنے والے، اسلامیات کی مختلف شاخوں پر کام کرنے والے محنتی اور کام کی دھن میں مگن رہنے والے محقق اور افراط وتفریط سے عاری عالم۔

ڈاکٹر نذیر احمد عبد المجید قاسمی :

دار العلوم دیوبند کے محققین علماء کی سلک زریں کی ایک کڑی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علم وتحقیق اور فکر وفلسفہ کو آمیخت کرنے والے نوجوان محقق، علوم قدیمہ کے عالم اور علوم جدید کے ماہر، فکر وفلسفہ کے اداروں سے وابستہ، اردو عربی اور انگریزی میں یکساں قدرت رکھنے والے منفرد عالم، متعدد مقالات اور مضامین کے مؤلف، نقد ونظر کے مالک اور صلابت فکر ونظر کے حامل۔

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی :

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کے عالم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اسلامیات کے ڈاکٹر۔ اسلامیات کی مختلف شاخوں اور قسموں سے بہرہ مند، ہندوستان میں فقہیات پر ہونے والے کام کے محقق مؤرخ، اردو عربی انگریزی پر قادر، متعدد مقالات کے مؤلف، کئی علمی دینی اور تحقیقی اداروں سے وابستہ اور تحقیق شناس نوجوان، باصلاحیت دانشور اور محقق عالم، فکرِ اسلامی وفراہی سے وابستہ اور ترجمان۔

کبیر احمد خاں :

ادارہ علوم اسلامیہ کتاب خانے میں کہنے کو اسٹنٹ لائبریرین (نائب ناظر کتاب خانہ) مگر صحیح معنوں میں کتابوں کے عالم اور فنون وعلوم کے پارکھ، ادارہ اور اس کی لائبریری کی روح رواں، فعال ومتحرک اور محبت آگیں، مخلص اور جاں نثار کارکن، خدمت گذاری، محبت شناسی اور قدر نوازی میں منفرد، متعدد علمی وتحقیقی مقالات کے مؤلف، علم وفکر کے ساتھ عمل اور مجاہدہ کے پیکر، دلنواز ودل آویز شخصیت۔

☆☆☆

خطبہ صدارت

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی☆

حضرات!

میرے لئے یہ مسرت اور عزت کی بات ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اسلام کے عہد اول کی علمی اور اسلامی شخصیتوں کے کمالات اور ان کے کارناموں کو پیش کرنے کیلئے، جو عظیم تحقیقی تصنیفی کام انجام دیا جس میں الفاروق کی تصنیف سرفہرست ہے اس کے تذکرہ ومطالعہ کے مذاکرہ علمی میں شرکت کا موقعہ مل رہا ہے۔ علامہ شبلی کے قدر دانوں اور عقیدت مندوں کی حیثیت سے اور ندوۃ العلماء کے نمائندے کی حیثیت سے اس میں شرکت کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

حضرات!

۱۸۵۷ء کے بعد کا برصغیر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک سخت کرب وشکست خوردگی کا عہد رہا ہے ایک طرف برصغیر میں مسلمانوں کو ظلم کا شکار بنایا جارہا تھا جس نے مسلمانوں کے اہل احساس طبقے کو بہت متفکر بنایا دوسری طرف عالم اسلام کے مختلف حصوں میں استعماری طاقتوں کے سامنے ایک ایک مسلمان ملک کا سقوط ہو رہا تھا اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں ایک عام شکست خوردگی پیدا ہو رہی تھی دوسری طرف تعلیمی محاذ پر پرانے پیمانے ٹوٹ رہے تھے اور نئے پیمانے قائم ہو رہے تھے ان سب حالات میں مسلمانوں کے اہل احساس طبقے کو بڑی فکر میں مبتلا کیا جس کا اظہار اس وقت کے ادب وشاعری میں بھی ہوا ہے جس کا نمونہ علامہ شبلی کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے علامہ نے صرف اپنی نظموں میں ہی اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ عملی طور پر اسکا مداوا کرنے کی کوشش کی انہوں نے ایک طرف مسلمانوں کے جدید نصاب ونظام تعلیم کی وکالت کی اور اس کو عمل میں لانے کے لئے تنظیمی کوشش بھی کی جس کے لئے ملک کے قدیم علماء اور جدید اہل علم کے تعاون وکوشش سے نظام ونصاب تعلیم کی

اصلاح اور نئے عہد کے تقاضوں کی اعانت کو عمل میں لایا گیا جس کا بڑا مظہر تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا دار العلوم ہے دوسری طرف علمی وادبی دائرے میں تصنیف و تحقیق کے ذریعہ ذہن سازی کا کام انجام دیا۔ اسلام کے عہد اول کی عظیم شخصیات پر علامہ موصوف کی نگارشات اس کا بڑا ثبوت ہیں جن میں الفاروق کو ایک بڑی خصوصیت حاصل ہے۔

الفاروق علامہ شبلی نعمانی کی وہ اہم ترین تصنیف ہے جس نے امت مسلمہ ہندیہ کے دانشور طبقے سے بہت خراج تحسین حاصل کیا اور اس نے صرف یہی نہیں بلکہ اس عہد میں جو مسلمانوں کی شکستہ دلی اور ان کے دانشور طبقے میں اسلامی سربلندی کے پہلو سے مایوسی اور احساس کمتری کا عہد تھا ہمت بڑھانے اور اسلامی عظمت کا احساس دلانے کا کام انجام دیا۔

یہ وہ عہد تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامی تمدن اور اس کی عظیم شخصیتوں کے بارے میں یورپ کے اہل قلم کی کتابیں ہی ملتی تھیں۔ ان کتابوں میں یورپ کے ان اہل علم واہل قلم نے اسلامیات پر مواد پیش کیا تھا اور متعدد کم یاب قدیم کتابوں کو شائع بھی کیا تھا، لیکن ان میں ایسے اہل علم بھی ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے عظیم تمدن اور مایۂ ناز تاریخ کو اس کی اہمیت وعظمت کے مطابق پیش کرنے اور اس کی عظیم شخصیتوں کا تعارف کرانے میں کوتاہی بلکہ زیادتی کی اور جگہ جگہ نقصان رسان بلکہ اخفاء حقیقت کا عمل اختیار کیا مثلاً حضرت محمد ﷺ کے کام اور مقام کو ان میں سے متعدد مصنفین نے صرف ایک مخلص سماجی لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا ایسے سماجی لیڈر کی حیثیت سے جس کو اس کی قوم کی غربت وجہالت وپس ماندگی کے احساس نے اٹھایا اور اس نے دین کے حوالہ سے اپنی قوم کو غربت وہلاکت سے نکالنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں ان کے نزدیک ایک وہ اپنی جاہل اور پس ماندہ ترین قوم کی سماجی واقتصادی حالت کو درست کرنے میں علاقائی سطح پر کامیاب ہوئے پھر انہوں نے جنگوں کے ذریعہ اپنے پڑوسی ملکوں میں اپنا اقتدار قائم کرلیا جو ان کے ماننے والوں نے اپنے پڑوسی ملکوں کے تمدن سے متأثر ہو کر تمدنی وعلمی ترقی بھی کی جو اصلاً یونان وروم کے تمدنی وعلمی سرمایۂ سے خوشہ چینی کا نتیجہ تھی۔ یہ وہ طرز بیان تھا جو اسلامی واقعات وشخصیات کے بارے میں یورپ کے متعدد اہل قلم نے اختیار کیا اس طرح یورپ کے دانشوروں نے اپنے فکری وثقافتی لٹریچر کے ذریعہ اور اس نصاب تعلیم کے ذریعہ جو اس نے

اپنے زیر اقتدار مشرقی ملکوں میں رائج کیا مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنوں میں تشکیک پیدا کی، اس بات نے جدید تعلیم کی درسگاہوں سے استفادہ کرنے والوں کے ذہنوں کو خاصا متأثر کیا اوران کو اپنے تہذیبی وعلمی ورثہ سے بے اعتماد بنایا بلکہ ان کو اس کے سلسلہ میں احساس کمتری میں مبتلا کردیا اسی کے ساتھ ساتھ تاریخ وسیرت اورسماجی علوم میں مسلمان علماء ومصنفین کا جو علمی سرمایہ ہے اس کو انہوں نے علم وتحقیق کے معیار سے کمتر اور غیر محققانہ کاوشوں کا نتیجہ سمجھا اور اس کے اعتبار کوشک کی نگاہ سے دیکھا، ان کے سامنے اس کی وجہ غالباً یہ ہیں کہ وہ روایت کے عمل سے زیادہ وابستہ رہا ہے جو دراصل حدیث شریف کے بجنسہ نقل کرنے کی ضرورت کے پیش نظر کیا گیا اس میں تنقیح ودرایت کا عمل زیادہ تر رواۃ کی ثقاہت کے سلسلہ میں کیا گیا ہے اس کے اثر سے مسلمانوں کے علمی کاموں میں ان کے اس طریقہ کار کو غیر معمولی احتیاط اور عملی دیانت کی خصوصیت حاصل ہوئی جو کہ مذہب کی اصل حقیقتوں کی حفاظت کا ذریعہ بنی۔

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب الفاروق کے مقدمہ میں اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں ”اس امر پر مسلمان بلاشبہ فخر کرسکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انہوں نے جس قدر اعتناء کیا کسی قوم نے یہ نہیں کیا تھا انہوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفحص اور تلاش سے بہم پہنچائے کہ اس کو ایک مستقل فن بنادیا جو فن رجال کے نام سے مشہور ہے یہ توجہ واہتمام اگر چہ اصل میں حدیث نبوی کے لئے شروع ہوا تھا لیکن فن تاریخ بھی اس فیض سے محروم نہ رہا، طبری، فتوح البلدان، طبقات ابن سعد وغیرہ میں تمام واقعات بسند متصل مذکور ہیں مزید تحریر کرتے ہیں کہ یورپ نے فن تاریخ کو آج کمال کے درجہ پر پہنچا دیا ہے لیکن اس خاص امر میں وہ مسلمان مؤرخوں سے بہت پیچھے ہیں ان کو واقعہ نگار کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی پرواہ نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ جرح وتعدیل کے نام سے بھی آشنا نہیں“ [۱]

مزید لکھتے ہیں کہ یہ امر بھی جتادینا ضروری ہے کہ اگرچہ میں نے واقعات میں اسباب وعلل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اس باب میں یورپ کی بے اعتدالی سے احتراز

۱۔ الفاروق، ص: ۱۲، ۱۳ مطبع کردہ فرید بکڈپو جامع مسجد دہلی

کیا ہے اسباب وعلل کے سلسلے پیدا کرنے کے لئے اکثر جگہ قیاس سے کام لینا پڑتا ہے اس لئے مؤرخ کو اجتہاد اور قیاس سے چارہ نہیں لیکن یہ اس کا لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس اور اجتہاد کو واقعہ میں اس قدر مخلوط نہ کردے کہ کوئی شخص دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کرسکے۔

اہل یورپ کا عام طرز یہ ہے کہ وہ واقعہ کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لئے اسی ترتیب اور انداز سے لکھتے ہیں کہ وہ واقعہ بالکل ان کے اجتہاد کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی شخص قیاس اور اجتہاد کو واقعہ سے الگ نہیں کرسکتا''۔[۱]

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کے باب میں تاریخ کا ایسا تحقیقی اصول اختیار کیا جس میں پوری احتیاط ودیانت علمی کے ساتھ ساتھ واقعات اور حالات کے سلسلہ میں جو شبہات ابھارے گئے تھے ان کی معقول توجیہہ وتحقیق کی، اور جو بے ضرورت شک کی فضا بنائی گئی اس کا ازالہ کیا اس سلسلہ میں الفاروق اسکی واضح مثال ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علامہ کی کتاب الفاروق نیز اس طرز کی ان کی دوسری کتابوں کے اثر وخوبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''علامہ شبلی کی زندہ جاوید تصنیفات میں ان کی کتاب الفاروق خاصی اہمیت رکھتی ہے اس کو ان کی انشاء پردازی کا شاہکار کہا جاسکتا ہے اس کتاب نے بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی محبت کا بیج بودیا اور ایمان کی آبیاری کی اور وہ مغرب کے فکری وتہذیبی حملوں کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بنی۔

علامہ موصوف کے سوانح وسیرت نگاری کے اس مفید سلسلہ میں الغزالی سوانح مولانا روم، المامون اور سیرت النعمان بھی شامل ہیں جو تذکرہ اور سوانح کی ترتیب کا جدید اور قابل تقلید نمونہ ہیں۔

علامہ شبلی نے صرف یہی نہیں کیا کہ متوازن تحقیق اور مؤثر کتابیں لکھیں بلکہ انہوں نے اپنے تلامذہ کی ایک جماعت تیار کردی جس کو دبستان شبلی سے تعبیر کیا ہے جس نے اس نہج پر کام کیا۔

اس سلسلہ میں مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں کہ دبستان شبلی

۱۔ الفاروق، ص: ۱۲، ۱۳، طبع کردہ فرید بکڈپو جامع مسجد دہلی

نے بحث وتحقیق، وسعت مطالعہ، قلم کی شائستگی اور تحریر کی شگفتگی کے دل آویز نمونے پیش کئے۔

اس دبستان کی کتابوں اور مضامین نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تہذیب وثقافت مسلمانوں کی تابناک تاریخ اور ان کی علمی دعوتی خدمات کو اس طرح پیش کیا جس نے اسلام کی برتری اور عظمت اور اسلاف کی ذہنی اور انسانی بلندی پر اس کا اعتماد جو جدید تعلیم اور مغربی لٹریچر کے اثر سے متزلزل ہو رہا تھا بحال کر دیا اور اس احساس کمتری کو دور کرنے میں مؤثر رول ادا کیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں پیدا ہو گیا[۱]

دبستان شبلی کی تصنیفات اور مضامین کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بحث وتحقیق میں براہ راست اصلیت اور پختگی پائی جاتی ہے جو ان کی عربی وفارسی زبانوں پر قدرت اور اصل ماخذ سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور علوم اسلامیہ کی باقاعدہ تحصیل کا نتیجہ تھی اور جس کی کمی مستشرقین کے خوشہ چینوں اور بالواسطہ (سیکنڈ ہینڈ) معلومات رکھنے والوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

حضرات!

علامہ شبلیؒ نے جس عہد میں اپنی معرکۃ الآراء تصنیف الفاروق اور دیگر عظیم شخصیات کی سوانح لکھیں وہ دور بڑا شکست خوردگی کم ہمتی کا دور تھا ۱۸۵۷ء کے حادثہ کے اثر سے سب کے دل بیٹھ گئے تھے اور مغرب کی علمی وفکری یلغار نے اسلام کے جلیل القدر اسلاف کی شبیہ دھندلی کر دی تھی اور جمہوریت ومساوات عدل وعوامی ہمدردی جیسے خیالات کو مغرب کی دین سمجھا جا رہا تھا۔ اور اسلامی تاریخ کو ان سے تہی دامن محسوس کیا جا رہا تھا یہ مسلمانوں کیلئے خاص طور پر ان کی نئی نسل کے لئے جس کو علم کا حصول مغرب کے نصاب تعلیم ومغربی اہل علم کی علمی تحقیقات کے ذریعہ ہو رہا تھا زبردست ذہنی شکست کا سبب بن رہا تھا اس صورت میں علامہ شبلی نے جو کارنامہ انجام دیا وہ ایک انقلابی کارنامہ تھا انہوں نے مغرب کے طریقہ تحقیق طرز استدلال کو سمجھا اور تاریخ ساز اسلامی شخصیات کی انقلابی خصوصیات کو پردۂ خفا سے نکال کر جدید ذہن ساز اسلوب میں پیش کیا اس کے ذریعہ انہوں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کی عظمتوں کو دھندلا کرنے

۱۔ اسلامیات

والی کوششوں کو بے اثر بنایا دوسری طرف جدید علمی حلقوں میں جو شکست خوردگی کا احساس جاگزیں ہو رہا تھا اس کو دور کیا اور ان کیلئے اپنے اسلاف پر فخر کرنے کا سامان فراہم کیا، اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب تحریر فرماتے ہیں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل (جو اسلامی ممالک میں یورپین سامراج کا زمانہ ہے) تاریخ اسلام اسلامی تہذیب وتمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم محکوموں کے ساتھ سلوک وبرتاؤ سے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کردئے گئے تھے اور تاریخ کو شک آفرینی اعتقادی تزلزل اور ذہنی مرعوبیت کا ایسا ہی ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور اس سے وہی کام لیا جانے لگا تھا جو تیسری وچوتھی صدی ہجری میں یونانی فلسفہ سے لیا گیا تھا اس لئے اس کی شدید ضرورت تھی کہ تاریخ کو صحیح طریقے پر پیش کیا جائے اور شبہات اور افترا پردازیوں کا پردہ چاک کیا جائے یہ نہ صرف ایک علمی وتاریخی خدمت تھی بلکہ ایک نیا علم کلام تھا جس سے ایمان کی حفاظت وتقویت کا کام لیا جاسکتا تھا علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء کے فضلاء نے اس سلسلہ میں مفید وناقابل فراموش خدمت انجام دیں۔

حضرات!

تاریخ اسلامی کی عبقری صفت شخصیات ہیں حضرت عمر بن خطابؓ کی شخصیت نادر شخصیت تھی ان کے متعدد کارنامے نہ صرف یہ کہ نہایت عظیم تھے بلکہ وہ اولیت کا مقام رکھتے ہیں۔ یورپ نے اس مثالی اور جمہوری دور میں جمہوریت، مساوات، سماجی انصاف جیسے اصولوں کو اپناتے ہوئے ان میں اپنی اولیت ظاہر کی ہمارے اہل فکر واہل تحقیق کا یہ کام تھا کہ ان میں مسلمانوں کی اولیت پھر اس کے نفاذ کے اعلا نمونوں کے سامنے لاتے یہ وہ کام ہے جس کو بطریق احسن علامہ شبلی نعمانی نے انجام دیا جس کا علمی حلقوں میں غیر معمولی اثر پڑا تھا۔ اب چونکہ حالات بدل چکے ہیں اور مسلمانوں کے احساس کمتری کے اسباب تقریباً دور ہو چکے ہیں ایسی صورت میں علامہ شبلی کے کارناموں کی قدر ذہنوں میں کمزور ہو رہی تھی ان کی قدر دانی کو ابھارنے کی ضرورت تھی اس کیلئے یہ سمینار ایک بڑا قابل قدر اقدام ہے میں اس کے منتظمین کو اس کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔

الفاروق کا تجزیاتی مطالعہ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

الفاروق مولانا شبلیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس پر ان کو بجا طور سے فخر تھا، اس کی مقبولیت کی بنا پر اس کے کئی اڈیشن نکلے اور متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے۔

مولانا شبلی کی بعض تصانیف کی دھوم طبع ہونے سے پہلے ہی مچ جاتی تھی اور اہل علم اور اصحاب ذوق کو ان کی اشاعت کا انتظار نہایت بے چینی سے رہتا تھا، الفاروق بھی ان کی ایسی ہی تصنیف ہے جس کے متعلق وہ خود دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آگیا تھا، اسکے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار نہیں ہوچکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

ادھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رک گیا اور اس کے بجائے دوسرے کام چھڑ گئے چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں، لیکن جونگاہیں فاروق اعظم کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں ان کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہو سکتی تھی،،[1]

مصنف کے حبیب سے بھی یہ داستان سننے کے لائق ہے، وہ اس شعر سے شروع

کرتے ہیں:

اے آتش فراقت دلہا کباب کرد
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کرد

الفاروق کی آمد آمد کا آوازہ مدت سے ملک میں بلند تھا، پبلک کا شوق وقفِ انتظار تھا، خلیفہ ثانی کی لائف کی عظمت واہمیت علامہؔ مصنف کے پیش نظر تھی.......... جب یہ سیمائی جلوے محو ہوئے اور صبح کاذب کی دھندلی روشنی کافور ہوگئی تو صبح صادق نورافشاں ہوئی جس نے نگاہوں کو پرنور اور دماغوں کو روشن کردیا، ہم بعض مذکورۂ بالا کتابیں پڑھ چکے تھے لہذا الفاروق کو دیکھ کر ہم نے بے تامل کہا ''دیر آید درست آید'' اور جب ہم نے اس میں ان کتابوں کے حوالے دیکھے جو قسطنطنیہ میں مصنف کی نظر سے گزری تھیں تو ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا ''دیر آمدۂ زراہ دور آمدۂ'' .... حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف (جن کا دِرّہ جنرلوں کی شمشیر سے زائد پر اثر اور جن کی سادہ عظمت قیصر وکسریٰ کے جاہ وجلال سے بڑھ کر تھی) شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے قلم سے نکلے تو کی اس کا غلغلہ اور انتظار اس سے کم ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا''۔[۲]

۱۰؍اگست ۱۸۹۴ء کو مولانا نے الفاروق مکمل کرنے کا عزم مصمم کیا اور چار برس کے بعد ۵؍جولائی ۱۸۹۸ء کو یہ منزل طے ہوئی۔

مجھے مولانا کی اسی مایۂ ناز اور مشہور ومقبول کتاب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا ہے۔

سب سے پہلے ۵۰۰ صفحے کی اس کتاب کا مقدمہ ہم کو دعوت نظر وتامل دیتا ہے جو اصلاً الفاروق کے ماخذ ومصادر بتانے اور اس کے اصول تصنیف وترتیب بیان کرنے کے لئے لکھا گیا تھا، تمہید کے ان اٹھارہ صفحات میں فن تاریخ وتذکرہ کے متعلق وہ اصولی باتیں زیر بحث آئی ہیں جن کو الفاروق کی تالیف میں ملحوظ رکھا گیا ہے اس لئے اس سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

شروع میں عرب کی اس خاص خصوصیت کا ذکر ہے کہ ان میں بعض خاص خاص باتیں ایسی پائی جاتی تھیں جن کو تاریخی سلسلے سے تعلق تھا اور جو اور قوموں میں نہیں پائی جاتی

تھیں مثلاً انساب کا چرچا، ایام العرب اور شاعری، اسی لئے جب عرب میں تمدن کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے تاریخی تصنیفات وجود میں آئیں [۳]

وہ عبید بن شربہ کی کتاب الملوک واخبار الماضیین کو فن تاریخ کی پہلی تصنیف بتاتے ہیں جو حضرت امیر معاویہ (متوفی ۶۰ھ) کے حکم سے کاتبوں اور محرروں نے عبید سے سن کر قلم بند کی تھیں [۴]

خلیفہ منصور عباسی کے لئے محمد ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) نے خاص سیرت نبوی پر جو کتاب لکھی تھی مؤرخین نے اس کو فن تاریخ کی پہلی کتاب مانا ہے مگر مولانا کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس سے پہلے موسی بن عقبہ (التوفی ۱۴۱ھ) نے آنحضرت ﷺ کے مغازی قلمبند کئے تھے [۵]

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ الفاروق لکھنے کے زمانے میں وہ کتابیں نہیں چھپی تھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ سے پہلے بھی تاریخ ومغازی کی بعض کتابیں لکھی جا چکی تھیں خود مولانا شبلی نے الفاروق کے کئی برس بعد اپنی شاہ کار تصنیف سیرۃ النبی لکھی تو اس کے مقدمہ میں موسیٰ بن عقبہ کے استاد امام زہری (م ۱۲۴ھ) کی مغازی پر ایک مستقل کتاب کا ذکر کیا ہے، [۶] اور عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ) کے متعلق صاحب کشف الظنون کے حوالے سے تحریر کیا کہ ''بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی ہے،'' [۷]

ابو الاسود محمد بن عبد الرحمٰن بن نوفل (م ۱۳۱ھ یا ۱۳۷ھ) کی مغازی پر ایک کتاب کا ذکر فیوک نے کیا ہے [۸] مولانا نے فن تاریخ کی ترقی وتنزل پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ چوتھی صدی ہجری تک ایک دفتر بے پایاں تیار ہو گیا اور کبار مؤرخین ابو مخنف، کلبی اور واقدی نے نہایت عمدہ اور جدید عنوانوں پر کتابیں لکھیں اور ان میں سے ہر صاحب قلم کا موضوع اور عنوان جدا تھا۔ اس صدی تک آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے حالات میں جن مؤرخین نے کتابیں لکھی ہیں مولانا نے ان کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

۱۔ وہ جن کی کتابیں ناپید ہو گئیں لیکن ان کا سرمایہ ان کتابوں میں موجود ہے جو اسی زمانے

میں یا اسکے بعد قریب تر زمانے میں لکھی گئیں۔

۲۔ جن کی کتابیں آج بھی موجود ہیں اوران میں سے اکثر کے مطبوعہ یا خطی نسخے مولانا کی نظر سے گزرے تھے۔ مولانا نے دونوں قسم کے مؤرخین کے سنین وفات درج کرنے اور ان پر مختصر نوٹ لکھنے کا اہتمام کیا ہے تا کہ انکا اور ان کی تصنیفات کا پایہ معلوم ہو جائے۔ مولانا نے چوتھی صدی ہجری تک کے مؤرخین کو قدما اور بعد کے مورخین کو متأخرین کا نام دیا ہے اوران کا نمایاں فرق بھی واضح کیا ہے مثلاً قدما کی ہر تصنیف نئی معلومات پر مشتمل ہوتی تھی متأخرین نے اس پر کچھ اضافہ کرنے کے بجائے تغیر اور اختصار کے ساتھ اس کا قالب بدل دیا اور اختصار میں وہی بات چھوڑ دی جو تمام واقعہ کی روح تھی، قدما واقعات کو حدیث کی طرح بسند متصل نقل کرتے تھے، متأخرین نے یہ التزام بالکل چھوڑ دیا۔ قدما نے بھی کسی عہد کی معاشرت وتمدن پر جدا عنوان نہیں قائم کئے تھے لیکن ضمناً وہ جزئیات لکھ دیتے ہیں جن سے تمدن ومعاشرت کا کچھ کچھ پتہ چلتا تھا، متأخرین نے یہ خصوصیت بھی قائم نہ رکھی۔

پانچویں صدی کو انھوں نے فن تاریخ کے تنزل کا پہلا قدم قرار دیکر متأخرین میں ابن اثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفدا، نویری اور سیوطی کا نام لے کر لکھا ہے کہ نہایت شہرت حاصل کی مگر تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا، قدما کی خصوصیات کھودیں اور خود کوئی نئی بات نہیں پیدا کی لیکن ابن خلدون اوران کے شاگرد مقریزی کو اس عام نکتہ چینی سے مستثنٰی اور مدح وستایش کا مستحق بتایا ہے، اول الذکر نے فلسفہ تاریخ کا فن ایجاد کیا جس پر کل قوم ناز کرسکتی ہے۔[9]

فن تاریخ کی حقیقت وماہیت اور تاریخ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اوران کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ ہر موجود واقعہ گذشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا اسی کا نام تاریخ ہے''۔[10]

اس تعریف کی روشنی میں وہ دو باتوں کو لازمی قرار دیتے ہیں:

جس عہد کا حال لکھا جائے، اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات لکھے جائیں یعنی تمدن،

معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

۲۔ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

لیکن یہ دونوں چیزیں قدیم تاریخوں میں مفقود ہیں، رعایا کے اخلاق وتمدن اور معاشرت کا سرے سے ذکر نہیں ہوتا، فرماں روائے وقت کے حالات میں فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اسلامی تاریخوں بلکہ ایشیائی تاریخوں کا بھی یہی نقص اور انداز ہے مگر مولانا کے نزدیک یہ مقتضائے اسباب اس لئے تھا کہ ایشیا میں ہمیشہ شخصی سلطنتوں کا رواج رہا، واقعات میں سلسلۂ اسباب اس لئے نظر انداز ہوا کہ فن تاریخ فلسفہ اور عقلیات سے ناآشنا لوگوں کے ہاتھ میں رہا جن کی نظر فلسفہ تاریخی کے اصول ونتائج پر نہیں پڑی، احادیث وسیر میں روایت کا پلہ درایت پر بھاری رہنے کی وجہ بھی یہی ہے[11] ابن خلدون نے فلسفہ تاریخ کے اصول وآئین منضبط کئے لیکن اس کو اس قدر فرصت نہیں ملی کہ اپنی تاریخ میں اس سے کام لیتا،

اس فن کے نامکمل رہنے کی وجہ مولانا نے یہ بتائی کہ فن تاریخ میں مذکور واقعات کو مختلف فنون سے رابطہ ہوتا ہے مثلاً لڑائی کے واقعات فن حرب سے، انتظامی اور قانون سے، اخلاقی تذکرے علم الاخلاق سے تعلق رکھتے ہیں، مؤرخ اگر ان تمام امور کا ماہر ہو تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے ورنہ ایک عامی کی طرح اس کی نظر سرسری اور سطحی ہوگی۔ لکھتے ہیں:

"اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہوتا جو تاریخ کے ساتھ فن جنگ، اصول قانون، اصول سیاست، علم الاخلاق سے بھی آشنا ہوتے تو آج یہ فن کہاں سے کہاں تک پہنچا ہوتا"[12]

مولانا کے نزدیک سب سے اہم تر بحث یہ ہے کہ جو واقعات مذکور ہیں ان کی صحت کا اعتبار کیسے ہو واقعات کے جانچنے کے دو طریقوں روایت ودرایت پر سیرۃ النبی کے مقدمہ میں زیادہ مفصل بحث کی ہے، یہاں خاص زور دیا ہے کہ درایت کے اصول اگرچہ موجود تھے مگر تاریخ میں ان سے بالکل کام نہیں لیا گیا[13]

قدیم تاریخوں کے نقائص لکھنے کے بعد الفاروق میں اس کی جس طرح تلافی کی گئی

ہے، اس کا مفصل بیان ہے مثلاً حضرت عمرؓ کے حالات میں جو مستقل کتابیں لکھی گئیں ان میں ہر قسم کے ضروری واقعات نہیں ملتے، اس لئے ان کے طریق حکومت اور آئین انتظام کے لئے الاحکام السلطانیہ (ابن الوردی) مقدمہ ابن خلدون اور کتاب الخراج (امام ابویوسف) اور اخبار القضاۃ (محمد بن خلف وکیع) سے خاص صیغۂ قضاء کے متعلق حضرت عمر کا طریق عمل پیش کیا گیا ہے، ان کی اولیات کی تفصیل کتاب الاوائل (ابوہلال عسکری) اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل سے بیان کی گئی ہے، عقد الفرید اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) سے خطبے نقل کئے ہیں، ابن رشیق کی کتاب العمدہ سے حضرت عمر کا شاعرانہ مذاق معلوم کیا گیا ہے، میدانی کی کتاب الامثال سے ان کے حکیمانہ اقوال فراہم کئے ہیں، ابن جوزی کی فقہ واجتہاد پر معلومات اکٹھا کئے ہیں، محب طبری کی ریاض النضرۃ میں حضرت عمر کے حالات بہت تفصیل سے ہیں لیکن مولانا نے دانستہ اس سے احتراز اسلئے کیا ہے کہ اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں ہیں[14]

درایت کے منضبط اصول وقاعدے میں سے واقعات کی تحقیق وتنقید کے لئے حسب ذیل کو کارآمد قرار دیا ہے۔

۱۔ واقعہ مذکورہ اصول عادت کے رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے کے لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس کی تفتیش کہ واقعہ میں راوی کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵۔ واقعہ کی جو صورت راوی نے بیان کی وہ اس کی مکمل تصویر ہے یا اس نے تمام پہلوؤں اور خصوصیتوں پر نظر نہیں ڈالی؟

۶۔ روایت میں زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا سے کیا اور کس قسم کے تغیرات پیدا ہوئے؟[15]

ان اصولوں کی صحت سے کس کو انکار ہوگا، مولانا نے الفاروق میں ان کو برت کر بہت سے مخفی راز معلوم کئے ہیں موجودہ متداول تاریخوں میں غیر قوموں کی نسبت حضرت عمر

کے نہایت سخت احکام منقول ہیں، اس سلسلے میں وہ دو باتیں مدّ نظر رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

یہ تصنیفات اس زمانے کی ہیں جب مسلمانوں میں تعصب پیدا ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ قدیم ترین تصنیفات میں اس قسم کے واقعات بالکل نہیں ہیں یا بہت کم ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر تعصب آتا گیا اسی قدر روایتیں خود بخود تعصب کے سانچے میں ڈھلتی گئیں مثلاً تمام تاریخوں میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ عیسائی کسی وقت اور کبھی ناقوس نہ بجانے پائیں لیکن قدیم کتابوں (کتاب الخراج، تاریخ طبری وغیرہ) میں یہ روایت اس قید کے ساتھ منقول ہے کہ جس وقت مسلمان نماز پڑھتے ہوں اس وقت عیسائی ناقوس نہ بجائیں۔[16]

ابن اثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے حکم دیا تھا کہ قبیلۂ تغلب کے عیسائی اپنے بچوں کو اصطباغ نہ دینے پائیں، لیکن یہی روایت تاریخ طبری میں اس طرح ہے کہ اسلام قبول کر لینے والوں کے بچوں کو زبردستی اصطباغ نہ دیا جائے۔[17]

یہ نکتہ بھی بتایا کہ جو روایتیں تاریخی ہونے کے ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتی ہیں جس قدر ان میں تنقید ہوتی گئی ہے، اسی قدر مشتبہ اور مشکوک باتیں کم ہوتی گئی ہیں مثلاً فدک، قرطاس اور سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات ابن عساکر، ابن سعد، بیہقی، مسلم، بخاری سب نے نقل کئے ہیں لیکن جس قدر ان بزرگوں کے اصول اور شدت احتیاط میں فرق مراتب ہے، اسی نسبت سے روایتوں میں مشتبہ اور نزاع انگیز الفاظ کم ہوتے گئے ہیں یہاں تک کہ خود مسلم و بخاری میں فرق مراتب کا یہ اثر موجود ہے۔[18]

اصول عقلی کی بنا پر بھی مختلف قسم کے واقعات میں صحت واعتبار کے مدارج مختلف بتائے ہیں مثلاً حضرت عمر کے خلافت کے واقعات سو برس کے بعد تحریر کئے گئے اس بناء پر معرکوں کی نہایت جزئی تفصیلیں مثلاً صف آرائی کی کیفیت، فریقین کے سوال و جواب، ایک ایک بہادر کی معرکہ آرائی، پہلوانوں کے داؤں پیچ کا رتبہ یقین تک نہیں پہنچ سکتا لیکن انتظامی امور اور قواعد حکومت مدت تک چونکہ محسوس صورت میں موجود رہے اس لئے ان کی نسبت جو واقعات منقول ہیں وہ بے شبہ یقین کے لائق ہیں، مولانا کے نزدیک خطبوں اور حکمت آمیز

مقولوں میں جو فقرے زیادہ پر اثر اور فصیح و بلیغ ہیں وہ ضرور صحیح ہیں کیونکہ یہ ضرور محفوظ رہ جاتے ہیں اور ان کا مدت تک چرچا رہتا ہے، اسی طرح احکام شرعیہ سے متعلق خطبوں کے فقرے بھی ضرور قابل اعتماد ہیں کیونکہ فقہ کی حیثیت سے لوگ ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔[۱۹]

اس امر کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس زمانے کے مذاق کے لحاظ سے جو واقعات چنداں قابل ذکر نہ تھے اور باوجود اس کے ان کا ذکر آجاتا ہے ان کی نسبت سمجھنا چاہئے کہ اصل واقعہ اس سے زیادہ ہوگا مثلاً رزم و بزم کی معرکہ آرائیوں اور رنگینیوں کے مقابلے میں مؤرخین انتظامی امور کے بیان کرنے کے بالکل عادی نہیں ہیں بایں ہمہ حضرت عمر کے حال میں عدالت، پولیس، بندوبست اور مردم شماری وغیرہ کا ضمناً جو ذکر آجاتا ہے وہ جس قدر قلم بند ہوا، اس سے بہت زیادہ چھوڑ دیا گیا۔[۲۰]

مولانا یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ اور صحابہ کی نسبت حضرت عمر میں زہد و تقشف سخت مزاجی اور سخت گیری کے اوصاف زیادہ تھے لیکن ان کی نسبت سینکڑوں روایتوں کو صحیح نہیں خیال کرنا چاہئے کیونکہ یہ عموماً گرمی محفل کا سبب ہوتی تھیں اور عوام ان کو نہایت ذوق سے سنتے تھے اس لئے ان میں خود بخود مبالغہ کا رنگ آتا گیا ہے، اسی لئے زیادہ معتبر اور مستند کتابوں میں یہ روایتیں بہت کم پائی جاتی ہیں الفاروق میں مولانا نے ان کے سلسلے میں بڑی احتیاط کی ہے اور ریاض النضرۃ، ابن عساکر اور حلیۃ الاولیا وغیرہ کی روایتوں کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔[۲۱]

مولانا نے آج کل کی اعلا درجہ کی مقبول عام تاریخوں کو فلسفہ اور انشا پردازی سے مرکب بتایا ہے، ان کے نزدیک تاریخ و انشا پردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں، مؤرخ کا فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے یورپ کے ایک بڑے مؤرخ رینکی کے وہ مداح ہیں کیونکہ اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا۔ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب اور قوم کا طرف دار ہوا۔ کسی واقعہ کے بیان میں یہ پتہ نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔[۲۲]

مولانا نے واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش میں یورپ کی بے اعتدالی سے احتراز کیا ہے، اس میں قیاس واجتہاد سے چارہ نہیں لیکن اس کو واقعہ

میں اس قدر مخلوط نہیں کیا ہے کہ دونوں کو الگ نہ کیا جا سکے، یورپ پر وہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ واقعہ کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لئے ایسی ترتیب اور انداز سے لکھتے ہیں کہ وہ بالکل ان کے اجتہاد کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی شخص قیاس واجتہاد کو واقعہ سے الگ نہیں کرسکتا۔[۲۳]

کتاب کی ترتیب، اس کے اصول تحریر اور حوالے کے متعلق بعض باتیں لکھ کر وہ تمہید کو سات شعروں پر ختم کرتے ہیں جن میں تعلّی تو ہے مگر بیجا نہیں، مقدمہ کے اس تجزیہ سے ظاہر ہوا کہ گزشتہ تاریخوں میں موجودہ ذوق ومعیار کی اور وہ چیزیں نہیں ملتیں جن کو آج نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اس لئے مولانا نے قدما کی معتبر، اعلا درجہ اور اول قسم کی تاریخیں اور جدید تحقیق واقعات کے اصول سے الفاروق کا مصالحہ تیار کیا اور مولانا شروانی کے بقول ''قدیم معتبر تاریخیں، جدید تحقیق واقعات کے اصول، ان دونوں عنصروں کو ملا کر مؤلف الفاروق نے ایک تازہ دل فریب شکل پیدا کی ہے جو ایشیا اور یورپ دونوں کے قابو سے فرداً فرداً خارج تھی اور جس کی نسبت خود مولانا نے فخریہ لہجے میں فرمایا ہے ؎

پیکرے تازہ کہ خواہم بہ عزیزاں بنمود
لختے از ذوق خودش نیز تماشا کردم

الفاروق دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں حضرت عمر کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحاتِ ملکی کے حالات ہیں ہم پہلے اسی کا تجزیہ پیش کرتے ہیں ضمناً یا الگ سے اس کے بعض اہم مباحث پر نظر بھی ڈالیں گے۔ اس میں سب سے پہلا عنوان ''نام ونسب، سن رشد وتربیت'' کا ہے، اس کے تحت حضرت عمر کے سلسلۂ نسب، ان کی خاندانی عظمت، خاندان کی مذہبی سیادت، جد اعلی عدی اور جد امجد نفیل کے رتبہ، والد خطاب کے خاندان قریش کے ممتاز فرد اور حضرت عمر کے برادر عم زاد زید کا تذکرہ ہے، یہ زید نہایت عالی درجہ اور ان ممتاز بزرگوں میں تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بت پرستی ترک کر دی تھی اور اس کو علانیہ برا کہتے تھے۔

پھر ولادت، سن رشد اور ان چیزوں کی تعلیم حاصل کرنے کا ذکر ہے جو اس وقت

عرب میں لازمہ شرافت خیال کی جاتی تھی یعنی نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی، مقرری (خطابت) اور ضمناً شاعری کے عمدہ ذوق، تجارت کو ذریعہ معاش نے اور اس غرض سے دور دور ملکوں کے سفر کا تذکرہ ہے، سفر کے نتیجہ خیز حالات پر افسوس ہے کسی مؤرخ نے توجہ نہیں کی مولانا کے خیال میں اسی کی بدولت حضرت عمر میں خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری، معاملہ دانی وغیرہ اوصاف اسلام لانے سے قبل ہی پیدا ہوگئے تھے، حضرت عمر کے لکھنا پڑھنا سیکھ لینے کو علامہ بلاذری کے بسند حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت کی بعثت ہوئی تو قبیلہ قریش میں ۱۷ آدمی لکھنا جانتے تھے ان میں سے ایک عمر بن خطاب تھے۔

گو یہ واقعات کم و بیش دوسری کتابوں میں بھی درج ہیں لیکن مولانا کے انداز بیان اور زور قلم نے جو رنگ بھرا ہے وہ علانیہ سب سے جدا ہوگیا ہے مثلاً حضرت عمر کے جد اعلی عدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان صیغوں میں سفارت کے صیغے کے افسر تھے، یعنی قریش کو کسی قبیلے کے ساتھ کوئی ملکی معاملہ پیش آتا تو سفیر بن کر جایا کرتے اس کے ساتھ منافرہ کے معرکوں میں ثالث بھی یہی ہوا کرتے تھے، عرب میں دستور تھا کہ برابر کے دو رئیسوں میں سے کسی کو افضلیت کا دعوی ہوتا تو ایک لایق اور پایہ شناس شخص ثالث مقرر کیا جاتا اور دونوں اس کے سامنے اپنی اپنی ترجیح کے دلائل بیان کرتے، کبھی کبھی ان جھگڑوں کو اس قدر طول ہوتا کہ مہینوں معرکے قائم رہتے، جو لوگ ان معرکوں میں حکم مقرر کئے جاتے ان میں معاملہ فہمی کے علاوہ فصاحت اور زور تقریر کا جوہر بھی درکار ہوتا تھا، یہ دونوں منصب عدی کے خاندان میں نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے''۔[۲۵]

اس کے بعد قبول اسلام اور ہجرت کا عنوان آتا ہے، اس میں حضرت عمر کے اسلام لانے کا واقعہ تین صفحوں میں لکھا ہے، اس میں اگرچہ کوئی ندرت نہیں لیکن مولانا کے طریقۂ ادا اور اچھوتے انداز بیان نے جو کیفیت و جاذبیت پیدا کی ہے وہ آج بھی لوگوں کو مست اور سرشار کردینے کے لئے کافی ہے، حضرت عمرؓ جو آیتیں پڑھ کر بے اختیار ''**اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد ارسول الله**'' پکار اٹھے تھے، مولانا شبلی کے خیال نے ان کو سورۂ

صف کی بتایا ہے[۲۶] بعض مؤرخین نے ان کو دوسری سورہ کی آیتیں بتایا ہے غالباً مرجوح ہونے کی بنا پر مولانا نے ان اقوال کو نظر انداز کیا ہے۔

پھر حضرت عمر کے ۲۰ آدمیوں کے ہمراہ مدینہ ہجرت کرنے اور قبا یعنی عوالی میں رفاعہ بن منذر کے یہاں قیام کرنے کا ذکر ہے، جب آنحضرتؐ نے مہاجرین کے رہنے سہنے کے انتظام کے خیال سے انصار سے ان کی مواخات قائم کی تو حضرت عمر کو قبیلہ بنی سالم کے سردار عتبان بن مالک کا بھائی بنایا، یہ ابن ہشام نے لکھا ہے مگر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کے بجائے اوس بن خولی کا نام لکھا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے لیکن مولانا کو اس پر اس لئے تعجب ہوا کہ خود حافظ موصوف نے اصابہ میں ابن سعد کے حوالے سے عتبان ہی کا نام لکھا ہے اور اوس بن خولی کا جہاں حال لکھا ہے، حضرت عمرؓ کی اخوت کا کچھ ذکر نہیں کیا ہے[۲۷]

اسی عنوان کے تحت حضرت عمر کی رائے کے موافق اذان کا طریقہ قائم ہونے کا بیان ہے[۲۸]

ص: ۳۴ تا ۵۸ میں ۱ھ ہجری سے وفات نبوی کے واقعات وحالات بیان کئے گئے ہیں جن میں اہم غزوات ہیں یہ واقعات وحالات دراصل سیرت نبوی کے اجزا ہیں'' اس لئے مصنف نے اس کو پوری تفصیل سے نہیں لکھا، البتہ جن واقعات میں حضرت عمر کا خاص حصہ ہے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا، ان کو اس کا احساس ہے کہ اس طرح اگر چہ حضرت عمر کے کارنامے نمایاں ہو کر نظر نہ آئیں گے کیونکہ جب تک واقعہ کی پوری تصویر نہ دکھائی جائے اس کی اصلی شان قائم نہیں رہتی مگر اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی[۲۹]

ان اوراق کے جن اہم مندرجات کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا مناسب ہوگا وہ یہ ہیں:

(۱) حضرت عمر معرکہ بدر میں رائے وتدبیر، جاں بازی و پامردی کے لحاظ سے ہر موقع پر رسول اللہؐ کے دست وبازو رہے لیکن مولانا نے ان کی شرکت کی محسوس خصوصیات یہ بیان کی ہیں۔

۱۔ قریش کے تمام قبائل اس معرکہ میں آئے لیکن بنو عدی یعنی حضرت عمر کے قبیلے میں

سے ایک متنفس بھی شریکِ جنگ نہیں ہوا، اور یہ امر جہاں تک قیاس کیا جاسکتا ہے صرف حضرت عمرؓ کے رعب داب کا اثر تھا۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ان کے قبیلہ اور حلفاء کے ۱۲ آدمی شریک جنگ (مولانا نے ان سب کے نام لکھے ہیں)

۳۔ سب سے پہلے جو شخص اس معرکہ میں شہید ہوا وہ مہجع حضرت عمرؓ کا غلام تھا۔

۴۔ عاصؓ بن ہشام بن مغیرہ جو قریش کا ایک معزز سردار اور حضرت عمرؓ کا ماموں تھا، حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے مارا گیا، یہ بات ان کی خصوصیات میں شمار کی گئی کہ اسلام کے معاملات میں قرابت اور محبت کا اثر ان پر کبھی غالب نہیں آسکتا تھا، چنانچہ یہ واقعہ اس کی پہلی مثال ہے۔[۳۰]

مولانا نے آگے قیدیوں کے معاملے میں حضرت عمر کی رائے کے موافق وحی الٰہی نازل ہونے کا ذکر کیا ہے[۳۱] مگر اس کو ان محسوس خصوصیات میں محسوب نہیں کیا ہے۔

(۲) جنگ احد میں فتح کے بعد مسلمانوں کے مال غنیمت پر ٹوٹ پڑنے اور خالد کے جو اس وقت اسلام نہیں لائے تھے دفعتاً عقب سے حملہ کردینے سے نقشۂ جنگ تبدیل ہوگیا اور یہ غل پڑ گیا کہ رسول اللہ ﷺ مارے گئے اس سراسیمگی اور برہمی کی حالت میں جو جاں نثار میدانِ جنگ سے نہیں ہٹے ان میں حضرت عمر بھی تھے مولانا کے نزدیک تمام روایتوں سے یہ امر ثابت ہے، اس کی تائید میں طبری اور سیرتِ ابن ہشام کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ اس کے بعد علامہ بلاذری کی انساب الاشراف سے یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر ان لوگوں میں تھے جو احد کے دن بھاگ گئے تھے لیکن خدا نے ان کو معاف کردیا۔ علامہ کی ایک اور روایت میں بھی حضرت عمر کے ثابت قدم نہ رہنے کا ذکر ہے، مولانا شبلی نے اس روایت کو درایتاً غلط بتا کر اصول روایت کے لحاظ سے بھی اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے کیونکہ اس کی سند کے دو راوی مجہول الحال ہیں، علاوہ ازیں تمام روایتیں اس کے خلاف ہیں۔[۳۲]

صلح حدیبیہ میں معاہدہ کی شرائط پر حضرت عمر کو سخت خلش تھی، اس بارے میں

رسول اللہؐ سے ان کے سوال وجواب کا ذکر کرنے کے بعد مولانا کا یہ تحریر فرمانا قابل توجہ ہے:

''حضرت عمر کی یہ گفتگو اور خصوصاً انداز گفتگو اگرچہ خلافِ ادب تھا چنانچہ بعد میں ان کی سخت ندامت ہوئی اور اس کے کفارہ کے لئے روزے رکھے، نفلیں پڑھیں، خیرات دی، غلام آزاد کئے تاہم سوال وجواب کی اصل بنا اس نکتہ پر تھی کہ رسول اللہؐ کے کون سے افعال انسانی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے رسالت کے منصب سے، چنانچہ اس کی مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصے میں آئے گی''[۴۳]

خیبر کی فتح کے بعد جب اس کی زمین رسول اللہؐ نے مجاہدوں کو تقسیم کی تو ایک ٹکڑا ثمغ نام کا حضرت عمرؓ کے حصہ میں آیا انہوں نے اس کو راہ خدا میں وقف کردیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ کا یہ پہلا وقف تھا۔[۴۴]

اس حصہ کی سب سے اہم بحث واقعہ قرطاس ہے جو رسول اللہؐ کی علالت کے زمانے کا ہے اور اس سے حضرت عمر کا خاص تعلق ہے، اس کی تفصیل یہ ہے

آپ نے وفات سے تین روز پہلے قلم اور دوات طلب فرمائی اور کہا ''میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھوں گا کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہوگے'' حضرت عمر نے کہا ''آپ کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لئے قرآن کافی ہے''، بعض حاضرین نے کہا رسول اللہؐ بہکی باتیں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ)

مولانا نے واقعہ کی سنگینی بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا (نعوذ باللہ)

مولانا کے خیال میں اصل مسئلہ اس لئے نامنفصل رہا کہ غیر متعلق بحثیں چھڑ گئیں اور اصولِ درایت سے کام نہیں لیا گیا، اصل غور طلب امر یہ ہے کہ جو واقعہ جس طریقہ سے روایتوں میں منقول ہے اس سے کسی امر پر استناد ہوسکتا ہے یا نہیں؟ مولانا اس معاملے میں مندرجہ ذیل امور وواقعات کو پیش نظر رکھنے پر زور دیتے ہیں:۔

۱۔ آنحضرتؐ کم وبیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

۲۔ صحیح بخاری ومسلم کی تصریح کے مطابق کاغذ وقلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا

ہے، چونکہ آنحضرتؐ نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اس لئے اس واقعہ کے بعد آنحضورؐ چار دن زندہ رہے۔

۳۔ اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرت ﷺ کی نسبت اور کوئی واقعہ اختلالِ حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں۔

۴۔ اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے (صحیح بخاری میں سات طریقوں سے) بایں ہمہ بجز عبد اللہ بن عباسؓ کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

۵۔ عبداللہ بن عباسؓ کی عمر اس وقت صرف ۱۳۔۱۴ برس کی تھی۔

۶۔ سب سے بڑھ کر یہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر حضرت عبداللہ خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا؟

۷۔ تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے کاغذ قلم مانگا تو لوگوں نے کہا رسول اللہ بہکی ہوئی باتیں کررہے ہیں۔

اس روایت کی تضعیف کرتے ہوئے یہ نکات تحریر فرماتے ہیں۔

جب اور کوئی واقعہ یا قرینہ آنحضرتؐ کے اختلال حواس کا کہیں کسی روایت میں مذکور نہیں تو صرف اس قدر فرمانے سے کہ ''قلم دوات لاؤ'' لوگوں کو ہذیان کا خیال کیونکر پیدا ہوسکتا ہے، بالفرض انبیا سے ہذیان سرزد ہونا ممکن بھی ہو تو اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ معمولی بات بھی کہیں تو ہذیان سمجھی جائے، وفات کے قریب ایک پیغمبر کے اس بات کے فرمانے میں ہذیان کی کیا بات ہے؟

روایت اگر خواہ مخواہ صحیح سمجھی جائے تب بھی اس قدر بہر حال تسلیم کرنا ہوگا کہ راوی نے روایت میں وہ واقعات چھوڑ دئے ہیں جن سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرتؐ ہوش میں نہیں ہیں اور بیہوشی کی حالت میں قلم دوات طلب فرمارہے ہیں، پس ایسی روایت سے کسی واقعہ پر کیوں کر استدلال ہوسکتا ہے جس میں راوی نے واقعہ کی نہایت ضروری خصوصیتیں چھوڑ دیں۔

روایت پر مولانا کا یہ اعتراض بھی وزن دار ہے کہ اتنے بڑے واقعہ میں تمام صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس اس کے راوی ہیں جن کی عمر اس وقت کل ۱۳۔۱۴ برس کی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود واقعہ کے وقت جب موجود نہ تھے تو روایت کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

اپنے اوپر بخاری ومسلم کی حدیث پر شبہہ کرنے کا یہ جواب دیا ہے کہ ان کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہؐ کی نسبت ہذیان اور حضرت عمر کی نسبت گستاخی اور سرکشی کا الزام لگایا جائے۔

یہ پہلو بھی قابل غور بتایا ہے کہ آنحضرتؐ اس واقعہ کے بعد چار دن تک زندہ رہے اور اس اثنا میں وقتاً فوقتاً بہت سی ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں (تو آخر اس اہم واقعہ کا کیوں پھر ذکر نہیں کیا)

اسی موقع کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر وفات کے وقت تک آنحضرتؐ کی خدمت میں رہے اور ان کو اسکا سخت صدمہ ہوا، عام روایت ہے کہ وہ اس قدر خود رفتہ ہوئے کہ مسجد نبوی میں جا کر اعلان کیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی اس کو قتل کرڈالوں گا۔

مولانا کے نزدیک قرائن اس روایت کی تصدیق نہیں کرتے ،تو جیہہ یہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں کثرت سے منافقین کا گروہ موجود تھا جو فتنہ پردازی کے لئے آپ کی وفات کا منتظر تھا اس لئے حضرت عمر نے مصلحتا اس خبر کے پھیلنے سے روکا ہوگا، اسی واقعہ نے روایتوں کے تغیرات سے مختلف صورت اختیار کرلی ہے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں صحیح بخاری وغیرہ کی تصریحات ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہوسکتیں۔[۳۵]

اس کے بعد ''سقیفہ بنی ساعدہ، حضرت ابوبکر کی خلافت اور حضرت عمر کا استخلاف'' کا باب شروع ہوتا ہے۔ اس میں عہد صدیقی کے واقعات سے زیادہ تعرض نہیں کیا گیا ہے کیونکہ وہ سیرۃ الصدیق کے عنوان کے تحت آتے ہیں لیکن سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمر کی کارروائی

اور اقدامات ایسے تھے کہ ان سے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے اس لئے مولانا نے اس کی صحیح نوعیت واضح کی ہے۔

اس واقعہ سے یہ تعجب خیز امر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے انتقال کے بعد خلافت کی نزاع پیدا ہوگئی اور جن لوگوں کو رسول اکرمؐ سے عشق ومحبت کا دعوی تھا وہ آپ کو بے گور وکفن چھوڑ کر اس بندوبست میں مصروف ہوگئے کہ مسند حکومت اوروں کے قبضے میں نہ آجائے، اس فعل کی ناگواری اس وقت زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے کہ یہ حضرت ابوبکر وعمر سے سرزد ہوا تھا جو آسمان اسلام کے مہر و ماہ تھے اور جن لوگوں کو آنحضرتؐ سے فطری تعلق تھا یعنی حضرت علی وخاندان بنو ہاشم، ان کو آنحضرتؐ کے درد وغم اور تجہیز وتکفین سے ان باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔

مولانا کو تسلیم ہے کہ کتب حدیث وسیر سے بظاہر اسی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن ان کے نزدیک درحقیقت ایسا نہیں ہے، وہ اس کو بھی صحیح نہیں مانتے کہ حضرت ابوبکر وعمر تجہیز وتکفین چھوڑ کر سقیفہ بنوساعدہ چلے گئے اور خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنوہاشم اور حضرت علی سے بزور منوانا چاہا جس کو بنو ہاشم نے آسانی سے تسلیم نہیں کیا۔

مولانا نے مسئلہ کی تنقیح کر کے یہ غور طلب باتیں لکھیں:

۱۔ کیا خلافت کا سوال حضرت عمرؓ وغیرہ نے چھیڑا تھا،

۲۔ کیا یہ لوگ خود اپنی خواہش سے سقیفہ بنی ساعدہ میں گئے تھے؟

۳۔ کیا حضرت علی اور بنو ہاشم خلافت کی فکر سے بالکل فارغ تھے۔

۴۔ ایسی حالت میں حضرت عمرؓ وغیرہ نے جو کیا وہ کرنا چاہئے تھا یا نہیں؟

مولانا شبلی نے نہایت مستند کتاب مسند ابو یعلی سے حضرت عمرؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے خانہ مبارک میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی نے ان سے باہر آنے کے لئے کہا، انہوں نے کہا چلو ہٹو ہم لوگ آپ کے بندوبست میں مشغول ہیں، اس نے کہا کہ ایک حادثہ پیش آیا ہے، انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے ہیں جلد پہنچ کر ان کی خبر لو

کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھیں جس سے لڑائی چھڑ جائے، اس وقت انہوں نے حضرت ابوبکر سے کہا چلو۔

اس روایت سے پہلے دونوں مسئلہ حل ہوگئے، نہ حضرت عمر وغیرہ نے خلافت کی بحث کو چھیڑا اور نہ اپنی خوشی سے سقیفہ بنی ساعدہ کو جانا چاہتے تھے۔

تیسرے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس وقت جماعت اسلامی تین گروہوں میں منقسم تھی۔

(۱) بنو ہاشم: جس میں حضرت علی شامل تھے۔ (۲) مہاجرین: جس کے رئیس وافسر حضرت ابوبکر وعمر تھے۔ (۳) انصار: جن کے شیخ القبیلہ سعد بن عبادہ تھے۔ ان میں سے کوئی گروہ بھی خلافت کے خیال سے خالی نہ تھا، انصار نے تو اعلانیہ اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ رہے بنو ہاشم اور حضرت علی تو صحیح بخاری، اس کی شرح فتح الباری کی روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت علی امیدوار خلافت تھے اور ان کے حمایتی بنو ہاشم تھے اور جس طرح حضرت عمر وغیرہ آنحضرتؐ کو چھوڑ کر سقیفہ کو چلے گئے تھے، حضرت علی بھی آنحضرتؐ کے پاس سے چلے آئے تھے اور حضرت فاطمہ کے گھر میں بنو ہاشم کا مجمع ہوا تھا، سقیفہ میں حضرت علی کا نہ جانا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے غم والم میں مصروف تھے اور ان کو ایسے پر درد موقع پر خلافت کا خیال نہ آسکا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقیفہ میں مہاجرین وانصار جمع تھے اور ان دونوں میں سے کوئی حضرت علیؓ کے دعوے کے تائید نہ کرتا، کیونکہ مہاجرین حضرت ابوبکر کو پیشوا تسلیم کرتے تھے اور انصار کے رئیس سعد بن عبادہ تھے۔

اخیر بحث کے متعلق مولانا نے اصول تمدن کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بالکل بجا تھا کیونکہ منافقین مدت سے منتظر تھے کہ رسول اکرم کا سایہ اٹھ جائے تو اسلام کو پامال کردیں، ایسے نازک وقت میں ضروری تھا کہ جزع فزع اور گریہ وزاری میں مصروف رہنے کے بجائے خلافت کا انتظام کرنا ضروری تھا، اس وقت انصار نے یہ بحث چھیڑ کر حالت کو اور نازک بنا دیا، قریش ان کو بہت حقیر سمجھتے تھے جس کا ثبوت بدر کی جنگ میں مل چکا تھا اور وہی نہیں تمام عرب کو انصار کی متابعت سے انکار ہوتا جس کو صاف ابوبکرؓ نے سقیفہ کے

اپنے خطبے میں ظاہر کر دیا تھا، علاوہ ازیں اوس وخزرج میں باہم اتفاق نہ تھا، اس لئے ان کے دعوائے خلافت کو دبانا اور حضرت ابوبکرؓ کو جو سب میں با اثر، تجربہ کار اور معمر بزرگ تھے خلیفہ بنانا بالکل بجا ہوا جس سے ایک اٹھتا ہوا طوفان رک گیا اور سب لوگ مطمئن ہو گئے، صرف بنو ہاشم اپنے ادعا پر رکے رہے اور حضرت فاطمہ کے گھر میں وقتاً فوقتاً جمع ہو کر مشورے کرتے رہے، اس کے متعلق مولانا نے مصنف ابن ابی شیبہ اور تاریخ طبری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہؓ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا "اے بنت رسول خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے ہاں لوگ اسی طرح مجمع کرتے رہتے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا"

مولانا شبلی کو اس روایت کے رواۃ کا حال معلوم نہیں ہو سکا، اس لئے اصول روایت کے رو سے انہوں نے اس پر گفتگو نہیں کی لیکن از روئے درایت وہ اس کا انکار نہیں کرتے، لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس نازک موقعہ میں حضرت عمرؓ نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں ان میں گو بعض بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ انہی بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا اور بنو ہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اسی وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ میں واقع ہوئیں" [۳۶]

مسلمانوں میں جو لوگ بنو ہاشم کی برہمنیت کے قائل ہیں ممکن ہے ان کو مولانا کی یہ رائے پسند نہ آئے مگر ہمارے خیال میں حضرت عمرؓ کی اس طرح کی رائیں ان کے اسلامی جوش اور حمیت حق کا نتیجہ تھیں جو بالکل صحیح تھیں، اسے "حرکت" یا بے اعتدالی پر نہیں محمول کرنا چاہئے اور نہ تندی، تیز مزاجی اور بے اعتدالی قرار دینا چاہیے، وفات نبوی کے وقت بر افروختہ ہو کر گردن اڑا دینے کی بات کی خود بڑی خوبصورت توجیہہ کی ہے، اس لئے سازشوں کے مرکز میں آگ لگا دینے کے اظہار کو بے اعتدالی کہنے کی گنجائش نہیں۔

اس کے بعد ''خلافت اور فتوحات'' کا عنوان قائم کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں فتوحات ملکی کا آغاز ہو چکا تھا عراق وشام میں مہمات کا ابھی آغاز ہی تھا کہ وہ انتقال کر گئے، حضرت عمرؓ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لی تو سب سے ضروری کام انہی مہمات کا انجام دینا تھا، مولانا نے ان واقعات کی تفصیل لکھنے سے پہلے ۵ صفحوں میں یہ بتانا ضروری سمجھا کہ اسلام سے پہلے عرب کو فارس وشام سے کیا تعلقات تھے۔ تاکہ اس تمہیدی بیان سے یہ ظاہر کر دیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو کام شروع کیا اور حضرت عمرؓ نے جس کی تکمیل کی اس کے کیا اسباب تھے، پھر انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہونے والی جنگوں اور ملکوں کی فتوحات کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں جن کا سلسلہ ص :۷۲ سے شروع ہو کر ص :۱۹۶ تک چلا گیا ہے، ہم پہلے ان کے جلی عنوانات لکھتے ہیں پھر ان میں بیان کردہ اہم اور توجہ طلب امور اور مولانا کے اخذ کردہ نتائج کو نمایاں کریں گے ان کے عنوانات یہ ہیں:

فتوحات عراق (ص :۷۲ تا ۷۹) واقعہ بویب رمضان (ص: ۸۰ تا ۹۳) قادسیہ کی جنگ اور فتح (ص: ۹۴ تا ۱۱۰) جلولاء (ص: ۱۱۱ تا ۱۱۳) فتوحات شام (ص: ۱۱۴) فتح دمشق (۱۱۵ تا ۱۱۶) فحل (۱۱۷ تا ۱۲۰) حمص (۱۲۳ تا ۱۲۵) یرموک (ص: ۱۲۶ تا ۱۴۱) بیت المقدس (۱۴۲ تا ۱۴۶) حمص پر عیسائیوں کی دوبارہ کوشش۔ حضرت خالد کا معزول ہونا (ص: ۱۵۰ تا ۱۵۲) عمواس کی وبا (۱۵۳ تا ۱۵۶) قیساریہ کی فتح (ص: ۱۵۷) خوزستان (ص: ۱۶۰ تا ۱۶۵) عراق عجم (ص: ۱۶۶ تا ۱۷۱) ایران پر عام لشکر کشی (۱۷۲ تا ۱۷۴) آذربیجان (۱۷۵ تا ۱۷۶) طبرستان (۱۷۷) آرمینیہ (ص: ۱۷۸) فارس (۱۷۹ تا ۱۸۱) کرمان (ص: ۱۸۲) سیستان (ص: ۱۸۳) مکران (ص: ۱۸۴) خراسان کی فتح اور یزدگرد کی ہزیمت (ص: ۱۸۵ تا ۱۸۷) مصر کی فتح (ص: ۱۸۸ تا ۱۹۰) اسکندریہ کی فتح (ص: ۱۹۱ تا ۱۹۶)

الفاروق میں ان معرکوں کے سنین ہجری وعیسوی عنوان کے ساتھ ہی اور مقامات کے جغرافیائی حالات اور جنگوں کا پس منظر بھی بیان کیا ہے مولانا نے تبصرے کئے یا واقعہ کے نتائج پیش کئے ہیں، ذیل میں ان کی بعض مثالیں درج ہیں:

قادسیہ کی جنگ کے سپہ سالار حضرت سعد بن وقاص کو عرق النسا کی شکایت تھی اور

چلنے پھرنے سے معذور تھے، وہاں ایک قدیم شاہی محل تھا جو عین میدان کے کنارے پر واقع تھا، حضرت سعد بالا خانہ پر میدان کی طرف رخ کر کے تکیہ کے سہارے سے بیٹھے اور خالد بن عرفطہ کو اپنے بجائے سپہ سالار مقرر کیا تاہم فوج کو لڑاتے خود تھے یعنی جو حکم دینا مناسب ہوتا تھا پرچوں پر لکھ کر اور گولیاں بنا کر خالد کی طرف پھینکتے جاتے تھے اور خالد انہی ہدایتوں کے موافق موقع بہ موقع لڑائی بدلتے جاتے تھے، مولانا اس کی تفصیل بیان کر کے لکھتے ہیں:

''تمدن کے ابتدائی زمانے میں فن جنگ کا اس قدر ترقی کرنا تعجب کے قابل اور عرب کے تیزی طبع اور لیاقت جنگ کی دلیل ہے''[۳۶] مداین میں حضرت سعد داخل ہوئے، ایوان کسریٰ میں تخت شاہی کے بجائے منبر نصب ہوا چنانچہ جمعہ کی نماز اسی میں ادا کی گئی اور یہ پہلا جمعہ تھا جو عراق میں ادا کیا گیا۔ اس کا حال لکھتے ہوئے بے ساختہ مولانا کے قلم سے یہ جملے نکل گئے:

''ہمارے فقہا کو تعجب ہوگا کہ سعد نے باوجودیکہ اکابر صحابہ میں سے تھے اور برسوں جناب رسالتمآب ﷺ کی صحبت میں رہے تھے عالم گیر و محمود کی تقلید نہیں کی بلکہ ایوان میں جس قدر مجسم تصویریں تھیں سب برقرار رہنے دیں''

اور حاشیے میں یہ تحریر فرمایا:

''علامہ طبری نے جو بڑے محدث بھی تھے تصریح کے ساتھ اس واقعہ کو لکھا ہے''[۳۸]

حضرت سعد نے ایوانات شاہی کا خزانہ اور نادرات لا کر یک جا کرنے کا حکم دیا، نوادر اور اشیا کی تفصیل لکھتے ہوئے یہ مؤثر باتیں بھی حوالۂ قلم کی ہیں

''یہ تمام سامان فوج کی غارت گری میں ہاتھ آیا تھا لیکن اہل فوج ایسے راست باز اور دیانت دار تھے کہ جس نے جو چیز پائی تھی بجنسہ لا کر افسر کے پاس حاضر کر دی تھی چنانچہ جب سب سامان لا کر سجایا گیا اور دور دور تک میدان جگ مگا اٹھا تو خود سعد کو حیرت ہوئی، بار بار تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جن لوگوں نے ان نادرات کو ہاتھ نہیں لگایا بے شبہہ انتہا کے دیانت دار ہیں'' مال غنیمت حسب قاعدہ فوج میں تقسیم ہو کر پانچواں حصہ دربار خلافت میں بھیجا گیا، فرش اور قدیم یادگاریں بجنسہ بھیجی گئیں کہ اہل عرب ایرانیوں کے جاہ وجلال اور

اسلام کی فتح و اقبال کا تماشا دیکھیں حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ سامان چنے گئے تو ان کو بھی فوج کی دیانت اور استغنا پر حیرت ہوئی''۔[۳۹]

مال غنیمت میں سب سے عجیب وغریب ایک فرش تھا جس کو ایرانی ''بہار'' کے نام سے پکارتے تھے، یہ فرش اس غرض سے تیار کیا گیا تھا کہ جب بہار کا موسم نکل جاتا تھا تو اس پر بیٹھ کر شراب پیتے تھے، اس رعایت سے اس میں بہار کے تمام سامان مہیا کئے تھے، اس کی نسبت لوگوں کی رائے تھی کہ تقسیم نہ کیا جائے خود حضرت عمرؓ کا منشا بھی یہی تھا لیکن حضرت علی کے اصرار سے اس بہار پر بھی خزاں اور دولت نوشیروانی کے مرقع کے پرزے اڑ گئے، مولانا اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یورپ کے موجودہ مذاق کے موافق یہ ایک وحشیانہ حرکت تھی لیکن ہر زمانے کا مذاق جدا ہے، وہ مقدس زمانہ جس میں زخارف دینوی کی عزت نہیں کی جاتی تھی، دنیاوی یادگاروں کی کیا پروا کر سکتا تھا''۔[۴۰]

فتح جلولا کے بیان میں دو باتوں پر نظر ٹھہرتی ہے۔

۱۔ اس فتح کا مژدہ دینے کے لئے حضرت سعدؓ نے زیاد کو بھیجا، انہوں نے نہایت فصاحت سے جنگ کے حالات بیان کئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان واقعات کو اسی طرح مجمع عام میں بھی بیان کر سکتے ہو، زیادؓ نے کہا میں کسی سے مرعوب ہوتا تو آپ سے ہوتا چنانچہ مجمع عام ہوا اور انہوں نے اس فصاحت وبلاغت سے تمام واقعات بیان کئے کہ معرکہ کی تصویر کھینچ دی، حضرت عمرؓ بول اٹھے کہ خطیب اس کو کہتے ہیں، انہوں نے برجستہ کہا ؎

ان جندنا اطلقونا
بالفعال لساننا[۴۱]

۲۔ زیادؓ نے غنیمت کا ذخیرہ حاضر کیا، اس وقت شام ہو چکی تھی اس لئے تقسیم ملتوی رہی اور صحن مسجد میں ان کا ڈھیر لگا دیا گیا، عبدالرحمٰن بن عوف اور عبداللہ بن ارقم نے رات بھر پہرہ دیا، صبح کو مجمع عام میں چادر ہٹائی گئی، درہم ودینار کے علاوہ انبار کے انبار

جواہرات تھے، حضرت عمرؓ بے ساختہ رو پڑے، لوگوں نے تعجب سے پوچھا یہ رونے کا کیا محل ہے، فرمایا کہ جہاں دولت کا قدم آتا ہے رشک وحسد بھی ساتھ آتی ہے"۔[۴۲]

عراق عجم کی بڑی مہم میں سپہ سالار کا مسئلہ اٹھا لوگوں کو اس درجہ کا کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا، جو لوگ اس منصب کے قابل تھے وہ اور مہمات میں مصروف تھے، اس موقع پر حضرت عمرؓ کے انتخاب کی تحسین مولانا نے اس طرح کی "حضرت عمرؓ کے مراتب کمال میں یہ بات بھی داخل ہے کہ انہوں نے ملک کے حالات سے ایسی واقفیت حاصل کی تھی کہ قوم کی ایک ایک فرد کے اوصاف ان کی نگاہ میں تھے، چنانچہ اس موقع پر حاضرین نے خود کہا کہ اس کا فیصلہ آپ سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے، حضرت عمرؓ نے نعمان بن مقرن کو انتخاب کیا اور سب نے اس کی تائید کی"۔[۴۳]

فتوحات کے تذکرے میں کہیں کہیں اسلامی نظریہ جنگ پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً عراق عجم کے ضمن میں یزدگرد کی فوجوں سے نہاوند میں معرکہ آرائی کے بعد عام لشکر کشی کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

"اس وقت تک حضرت عمرؓ نے ایران کی عام تسخیر کا ارادہ نہیں کیا تھا، اب تک جو لڑائیاں ہوئیں، وہ صرف اپنے ملک کی حفاظت کے لئے تھیں، عراق البتہ ممالک محروسہ میں اضافہ کرلیا گیا تھا لیکن وہ درحقیقت عرب کا ایک حصہ تھا، کیونکہ اسلام سے پہلے اس کے ہر حصہ میں عرب آباد تھے، عراق سے آگے بڑھ کر جو لڑائیاں ہوئیں وہ عراق کے سلسلہ میں خود بخود پیدا ہوتی گئیں، حضرت عمر خود فرمایا کرتے تھے کہ کاش ہمارے اور فارس کے بیچ میں آگ کا پہاڑ ہوتا کہ نہ وہ ہم پر حملہ کرسکتے نہ ہم ان پر چڑھ کر جاسکتے۔ لیکن ایرانیوں کو کسی طرح چین نہیں آتا تھا، وہ ہمیشہ نئی فوجیں تیار کرکے مقابلے پر آتے تھے اور جو ممالک مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے وہاں غدر کروا دیا کرتے تھے، نہاوند کے معرکے سے حضرت عمرؓ کو اس پر خیال ہوا اور اکابر صحابہ کو بلا کر پوچھا کہ ممالک مفتوحہ میں بار بار بغاوت کیوں ہو جاتی ہے، لوگوں نے کہا جب تک یزدگرد ایران کی حدود سے نکل نہ جائے، یہ فتنہ فرو نہیں ہوسکتا کیونکہ جب تک ایرانیوں کو خیال رہے گا کہ تخت کیان کا وارث موجود ہے،

اس وقت تک ان کی امیدیں منقطع نہیں ہو سکتیں، اس بنا پر حضرت عمرؓ نے عام لشکر کشی کا ارادہ کیا"۔[۴۴]

آگے خراسان کی فتح اور یزدگرد کی ہزیمت کے زیر عنوان لکھا:

"حضرت عمرؓ فتوحات کی وسعت کو چنداں پسند نہیں کرتے تھے، خط پڑھ کر ہمارے اور خراسان کے بیچ میں آگ کا دریا حائل ہوتا تو خوب ہوتا"۔[۴۵]

احنف جن کو خراسان کا علم ہوا تھا کہ مردانہ حوصلوں کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ احنف شرقیوں کا سرتاج ہے تاہم جواب میں جو نامہ لکھا، اس میں لکھا کہ جہاں تک پہنچ چکے ہو وہاں سے آگے نہ بڑھنا" اس سلسلہ کا خاتمہ اس عبرت انگیز اور مؤثر تحریر پر کیا۔ احنف کا نامۂ فتح پا کر کے حضرت عمرؓ نے تمام آدمیوں کو مژدۂ فتح سنایا اور ایک پر اثر تقریر کی، آخر میں فرمایا:

"آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہو گئی اور اب وہ اسلام کو کسی طرح ضرر نہیں پہنچا سکتے لیکن اگر تم بھی راست کرداری پر ثابت قدم نہ رہے تو خدا تم سے بھی حکومت چھین کر دوسروں کے ہاتھ میں دے دے گا"۔[۴۶]

شام کی فتوحات اور ۱۷ھ کے واقعات میں حضرت خالدؓ جیسے عظیم الشان سپہ سالار کا معزول کیا جانا بڑا اہم واقعہ ہے مگر حضرت عمرؓ پر طعن و تشنیع کرنے کے لئے اس میں بڑی رنگ آمیزی کی گئی جس کی اصل حقیقت مولانا کے حقیقت نگار قلم نے اس طرح واضح کی ہے، وہ عام مؤرخین کے اس بیان کو غلط قرار دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا جو حکم دیا وہ حضرت خالدؓ کی معزولی تھی، انہوں نے اس میں ابن اثیر پر اختلاف بیانی کا الزام بھی لگایا ہے کہ خود ۱۳ھ کے واقعات میں خالد کا معزول ہونا لکھا ہے اور خود ہی ۱۷ھ کے واقعات میں ان کی معزولی کا الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک سے واقعات نقل کر دئے ہیں۔

مولانا شبلی نے واقعہ کی یہ تفصیل لکھی ہے:

"حضرت عمرؓ خالد کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے مدت سے ناراض تھے تاہم

آغاز خلافت میں ان سے کچھ تعرض کرنا نہیں چاہا لیکن چونکہ خالد کی عادت تھی کہ وہ کاغذات حساب دربار خلافت کو نہیں بھیجتے تھے، حضرت عمرؓ کی تاکید پر انہوں نے جواب لکھا کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا حضرت عمرؓ کو ان کی یہ خود مختاری کیونکر پسند آسکتی تھی اور وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیونکر کسی کے ہاتھ میں دے سکتے تھے، چنانچہ حضرت خالد کو لکھا کہ تم اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو، انہوں نے اس شرط کو نامنظور کر دیا اس بنا پر وہ سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کردئے گئے چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں حضرت خالد کے حال میں بہ تفصیل لکھا ہے[۴۷]

مولانا کا بیان ہے کہ بایں ہمہ ان کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ ابوعبیدہ کے ماتحت کر دیا، اس کے بعد ۱۷ھ میں انہوں نے ایک شاعر کو دس ہزار روپے انعام میں دے دئے، حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے ابوعبیدہ کو خط لکھا کہ اگر انہوں نے اپنی گرہ سے دیا تو اسراف کیا اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی، دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔

حضرت خالد کی معزولی کی کیفیت یہ تحریر کی ہے کہ معزولی کا خط لے جانے والے قاصد نے مجمع عام میں ان سے پوچھا یہ انعام تم نے کہاں سے دیا، حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ اگر اپنی خطا کا اقرار کرلیں تو ان سے درگذر کی جائے لیکن وہ اپنی خطا کے اقرار کرنے پر راضی نہ تھے، مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتاری اور ان کی سرتابی کی سزا کے لئے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی، اس کیفیت پر مولانا کا تاثر ملاحظہ ہو:

''یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایک ایسا بڑا سپہ سالار جس کا نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق وشام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جارہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا، اس واقعہ سے ایک طرف تو حضرت خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی سطوت وجلال کا اندازہ ہوتا ہے''[۴۸]

امام ابویوسف کی کتاب الخراج اور تاریخ طبری سے یہ بھی لکھا کہ ''حضرت خالدؓ

نے حمص کی ایک تقریر میں کہا کہ امیر المؤمنین نے مجھ کو شام کا افسر مقرر کیا جب میں نے اس کو زیر کرلیا تو مجھ کو معزول کردیا ایک سپاہی نے کہا سردار چپ رہ! ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے، حضرت خالدؓ نے کہا حضرت عمرؓ کے ہوتے فتنہ کا کیا احتمال ہے[۴۹]

حضرت خالدؓ مدینہ آئے تو حضرت عمرؓ سے کہا بخدا آپ میرے معاملے میں ناانصافی کرتے ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی، کہا مال غنیمت سے، اور یہ کہہ کر کہا کہ ساٹھ ہزار سے جس قدر زیادہ رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں، چنانچہ بیس ہزار زیادہ نکلی اور وہ بیت المال میں داخل کردی گئی، حضرت خالد سے حضرت عمرؓ نے کہا واللہ تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں، عمالان ملکی کو لکھا کہ میں نے خالد کو ناراضی سے یا خیانت کی بنا پر موقوف نہیں کیا لیکن میں یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں، اس لئے میں نے ان کو معزول کرنا مناسب سمجھا تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے،،[۵۰]

عہد فاروقی میں فتوحات مکران پر ختم ہوئیں یا سندھ میں دیبل اور تھانہ تک پہنچ گئی تھیں، طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر حد مکران ہے، بلاذری کا بیان ہے کہ دیبل سے نشیبی حصہ اور تھانہ تک فوجیں آئیں۔

مولانا شبلی دونوں اقوال میں کوئی ترجیح نہیں دے سکے، وہ بلاذری کا بیان نقل کرکے یہ لکھتے ہیں ''اگر یہ صحیح ہے تو حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلام کا قدم سندھ ہند میں آچکا تھا،،[۵۱]

بعد کے مؤرخین نے بلاذری کے بیان کو ترجیح دی ہے

مولانا شبلی کے زمانے میں الفاروق کے جو اڈیشن نکلے اس کے حصہ اول وحصہ دوم کے مابین دنیائے اسلام کا ایک نقشہ بھی شامل تھا، شروع میں دارالمصنفین سے شائع ہونے والے نسخوں میں بھی یہ نقشہ شامل تھا پھر پتہ نہیں کیسے غائب ہوگیا چند برس پہلے اس کا عکسی اڈیشن شائع کرنے کے وقت راقم نے بہت چاہا کہ نقشے والا کوئی نسخہ مل جائے تو اس کو شامل کردیا جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

یہ نقشہ جرمنی کے پروفیسروں نے مرتب کیا تھا، ان کی جانفشانی اور دقیقہ سنجی کو لایق ہزار آفریں کہتے ہوئے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے لکھا:

''اس نقشہ میں کھاری پانی کے سمندروں سے گزر کر فتوحات اسلامیہ کے جاں فزا سمندر موجزن ہیں اور جس طرح دنیا کے سمندروں میں رنگ کا امتیاز ہے۔ کوئی اسود ہے، کوئی احمر۔ اسی طرح اس نقشہ میں مختلف عہد کے فتوحات کے سیلاب اپنے اپنے رنگ سے ممتاز نظر آتے ہیں اور ایک نگاہ میں حضرت سرور عالمؐ خلیفۂ اول سے ثالث تک اور بنی امیہ کے عہد اور اس کے مابعد کی فتوحات کی حد معلوم ہو جاتی ہے، اس نقشہ کی مدد سے عرب کی گزشتہ تاریخ عمدہ طور پر سمجھ میں آسکتی ہے، شمس العلما سید علی بلگرامی نے بھی ایک نقشہ ''تمدن عرب'' میں مثل اس کے دیا ہے لیکن الفاروق کا نقشہ اس سے زائد مفید اور زیادہ معلومات کا مخرج ہے، کاش یہ نقشہ بڑا چھاپ کر دیوار کے آویزاں کرنے کے لائق بنایا جائے۔[۵۲]

اب ہم حصہ دوم کا تجزیہ کر کے اس کے اہم مطالب ومباحث پر نظر ڈالیں گے۔ اس حصے میں حضرت فاروق اعظم کے ملکی اور مذہبی انتظامات اور علمی کمالات اور ذاتی اخلاق اور عادات کی تفصیل ہے، اس کے متعلق مصنف کا یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ ان کی سعی ومحنت کی تماشا گاہ ہے واقعتاً انہوں نے اس میں حضرت فاروق کی عظمت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے'' مولانا شروانی رقمطراز ہیں:

کوئی حصہ ثانی کی فہرست مطالب دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ کسی انیسویں صدی کی مہذب ومنتظم سلطنت کے محکموں کی فہرست ہے، کیا یہ کم تعجب خیز امر ہے کہ شائستگی نے جو وسعت حکومت کے مفہوم میں آج پیدا کی ہے اور اسی وسعت کی بنا پر جو جو محکمے جزء سلطنت قرار پائے ہیں وہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر منتظم شکل میں حضرت عمرؓ نے اپنی دہ سالہ حکومت میں قائم فرمادئے تھے اور نہ صرف قائم فرمائے بلکہ ان کے فیض بخش نتائج عالم کو دکھادئے۔

علامہ مصنف کو سب سے اول ان کی قوت دماغی اور جامعیت خیال پر آفریں کہنی چاہئے کہ انہوں نے فاروق اعظم کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا،

یا بہ الفاظ دیگر ان کی عظمت کو اصلی ہیئت میں دیکھا اس کے بعد مصنف کی تلاش وتجسس کی داد دینی چاہئے کہ جس قدر عنوان قائم کئے ان کو پوری نکتہ سنجی اور موشگافی کے ساتھ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کر دیا“۔[۵۳]

سب سے پہلے اس حصے کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں:

فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ (ص: ۲ تا ۱۰) نظام حکومت (ص: ۱۱ تا ۲۰) ملک کی تقسیم، صوبہ جات اور اضلاع، عہدہ داران ملکی (ص: ۲۱ تا ۳۶) صیغۂ محاصل (خراج) (ص: ۳۷ تا ۵۳) صیغۂ عدالت (ص: ۵۴ تا ۶۲) افتا (ص: ۶۳ تا ۶۵) فوجداری اور پولیس (ص: ۶۶ و ۶۷) بیت المال یا خزانہ (ص: ۶۸ تا ۷۰) پبلک ورکس (نظارت نافعہ) (ص: ۷۱ تا ۷۶) شہروں کا آباد کرنا (ص: ۷۷ تا ۸۴) صیغۂ فوج (ص: ۸۵ تا ۱۰۸) صیغۂ تعلیم (ص: ۱۰۹) صیغۂ مذہبی (ص: ۱۱۰۔ ۱۲۹) متفرق انتظامات (ص: ۱۳۰ تا ۱۳۴) ذی رعایا کے حقوق (ص: ۱۳۵ تا ۱۵۴) غلامی کا رواج کم کرنا (ص: ۱۵۵ تا ۱۶۱) سیاست وتدبیر عدل وانصاف (ص: ۱۶۲ تا ۱۸۹) امامت اور اجتہاد (ص: ۱۹۰۔ ۲۴۰) ذاتی حالات اور اخلاق وعادات (ص: ۲۴۱ تا ۲۷۷) اولیات (ص: ۲۷۷ تا ۲۸۰) ازواج واولاد (ص: ۲۸۱ تا ۲۸۵) خاتمہ (ص: ۲۸۶ تا ۲۹۱)

پہلے عنوان کے تحت فتوحات فاروقی کی وسعت، حدود اربعہ کے اور کل رقبہ اور یہ بتایا ہے کہ اس میں کون کون ممالک تھے، پھر فتوحات کے وہ اسباب بیان کئے ہیں جو یورپین مؤرخین نے دکھائے ہیں کہ اس وقت فارس وروم کی سلطنتیں اوج اقبال سے گر چکی تھیں، فارس کا نظام سلطنت درہم برہم تھا، حکومت سنبھالنے والے اہل اور لائق اشخاص نہ تھے، ارکانِ سلطنت میں سازشیں ہوگئی تھی، مزدکیہ فرقہ کا زور تھا، اسلام مذہب وعقیدہ سے تعرض نہ کرتا تھا، عیسائی فرقے ان کے معین ہوگئے تھے، روم کی سلطنت بھی کمزور ہوگئی تھی اور عیسائیت کے باہمی اختلافات زوروں پر تھے۔ مولانا کے نزدیک واقعیت سے خالی نہ ہونے کے باوجود یہ جواب طرز استدلال کی ملمع سازی ہے، سلطنتوں کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ پرزور قوی سلطنت کا مقابلہ نہ کرسکتیں نہ یہ کہ عرب جیسی بے سروسامان قوم سے ٹکرا کر پرزے

پرزے ہوجاتیں۔ ان کے نزدیک اصل سبب یہ تھا:

''مسلمانوں میں آنحضرت ؐ کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جسکو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کردیا تھا، روم وایران کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکرا ٹھا نہیں سکتی تھیں'' [۵۴]

پھر وہ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنہوں نے قیام حکومت میں مدد دی۔ اور جن میں سب سے مقدم دیانت داری اور راست بازی تھی جس کی بنا پر مفتوحہ ممالک کی رعایا مسلمانوں کی گرویدہ ہوجاتی تھی۔

ایک اور سبب یہ بتایا کہ مسلمانوں نے اول اول حملہ شام وعراق پر کیا، جہاں کثرت سے عرب آباد تھے جنہوں نے عیسائی ہونے کی وجہ سے اول اول مسلمانوں کا مقابلہ کیا، لیکن قومی اتحاد کا جذبہ رائگاں نہیں جاسکتا تھا، بڑے بڑے رئیس جلد مسلمان ہوگئے [۵۵]

فتوحات فاروقی کو سکندر وچنگیز کی فتوحات سے تشبیہ دینا غلط اور بے محل بتایا ہے، انکی فتوحات قہر، ظلم، قتل عام کی بدولت تھیں اسی لئے ان کی سلطنتیں دیر پانہ ہوئیں۔ فوری فتوحات کے لئے اس قسم کی سفاکیاں کارگر ہوئیں۔

حضرت عمرؓ کی فتوحات میں سرمو قانون انصاف سے تجاوز نہیں ہوا۔ آدمیوں کا قتل عام درکنار درختوں کے کاٹنے، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سے تعرض کرنے کی ممانعت تھی۔ باغیوں اور خائنوں کو جلاوطن کیا جاتا تو ان کی جائداد کی قیمت ادا کردی جاتی۔

سفاک فاتحین خود شریک جنگ ہوکر فوج کو لڑاتے تاکہ اس کا حوصلہ بلند رہے مگر حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت کی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے البتہ فوج کی باگ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی [۵۶] ایک اور صریحی فرق یہ بتایا کہ:

''سکندر وغیرہ کی فتوحات، گذرنے والے بادل کی طرح تھیں کہ ایک دفعہ زور سے آیا اور نکل گیا، ان لوگوں نے جو ممالک فتح کئے وہاں کوئی نظم حکومت نہیں قائم کیا، برخلاف اس کے فتوحات فاروقی میں یہ استواری تھی کہ جو ممالک اس وقت فتح ہوئے تیرہ سو برس گذرنے پر آج بھی اسلام کے قبضے میں ہیں اور خود حضرت عمرؓ کے عہد میں ہر قسم کے ملکی

انتظامات وہاں قائم ہو گئے تھے'' [۵۷]

عام رائے یہ ہے کہ فتوحات میں خلیفہ وقت کی چنداں تخصیص نہ تھی، اس وقت کے جوش وعزم کی حالت خود تمام فتوحات کی کفیل تھی مولانا کی رائے میں جوش واثر کی برقی قوت اسی وقت کام دے سکتی ہے جب کام لینے والا بھی اسی زور وقوت کا ہو۔ تمام فوج تیلی کی طرح ان کی اشاروں پر حرکت کرتی تھی۔ غرض ان کے خیال میں فاروق اعظم کے بغیر یہ کل مطلق کام نہیں دے سکتی تھی [۵۸]

آخر میں ان کا یہ فیصلہ سننے کے لائق ہے:

''جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے آج تک کوئی شخص فاروق اعظم کے برابر فاتح اور کشورستان نہیں گزرا [۵۹]

دوسرے عنوان کے تحت دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ کا نظام حکومت شخصی نہیں بلکہ جمہوری تھا جس میں عوام کو بھی مداخلت کا حق تھا اور خلیفہ عام حقوق میں سب کے مساوی تھا، اسی سلسلے میں ان کی مجلس شوریٰ، اس کی ہیئت، اس کے انعقاد کے طریقے وغیرہ زیر بحث آئے ہیں، نوعیت حکومت بتانے کے بعد وہ سلطنت کے نظم ونسق کے مختلف محکمہ جات اور الگ الگ صیغوں کے قیام کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کے عجیب وغریب کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ تمدن کی ابتدائی حالت ہونے کے باوجود بہت سے شعبے جو مخلوط تھے الگ کر کے جداگانہ محکمے قائم کئے'' [۶۰]

ملک کو صوبے، اضلاع اور پرگنوں میں تقسیم کرنے کا کام اسلام میں حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے کیا، اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کے مناسب وموزوں حدود قائم کئے، مؤرخین نے صوبوں کی جو تقسیم کی ہے اس کو صحیح ماننے کے باوجود اس میں ان کے اقوال پر بعض حیثیتوں سے بہت کچھ اضافے کئے۔ صوبوں میں بڑے بڑے افسر اور عہدہ داروں کے نام لکھے جن سے ان کے فرائض کا تعین ہو گیا ہے، پھر عہدہ داروں کے تقرر اور ان کے انتخاب میں حضرت عمرؓ کی جو ہر شناسی دکھائی ہے۔ ان کی تنخواہیں، رشوت کے انسداد کے طریقے اور جرائم کے انسداد کے لئے کمیشن کے تقرر کا ذکر کیا ہے، [۶۱] اس بحث کے دو اہم

واقعے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مصر کے عامل حضرت عیاض بن غنم کی یہ شکایت حضرت عمرؓ کو معلوم ہوئی کہ ''باریک کپڑے پہنتا ہے اور اس کے دروازے پر دربان مقرر ہے'' انہوں نے حضرت محمد بن مسلمہ[1] سے کہا جس حالت میں پاؤ ساتھ لوالاؤ، شکایت بجا تھی اسی ہیئت اور لباس میں ابن مسلمہ عیاض کو مدینہ لائے حضرت عمرؓ نے وہ کرتا اتروا کر کمل کا کرتہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں لے جا کر چراؤ۔ عیاض کو اس میں بڑی ذلت محسوس ہوئی حضرت عمرؓ نے کہا تیرے باپ کا نام غنم اسی وجہ سے تھا کہ وہ بکریاں چراتا تھا۔ غرض عیاض نے دل سے توبہ کی اور آئندہ اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے[٦٢]

دوسرا واقعہ حضرت سعد بن وقاص کا ہے، انہوں نے کوفہ میں ایک محل بنوایا تھا جس میں ڈیوڑھی بھی تھی حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ اس سے اہل حاجت کو رکاوٹ ہوگا، محمد بن مسلمہ کو ڈیوڑھی میں آگ لگانے کا حکم دیا، انہوں نے تعمیل حکم کی اور حضرت سعد چپکے دیکھا کئے[٦٣]

مولانا شبلی نے اس قسم کی باتوں کے بظاہر قابل اعتراض ہونے کا ذکر کیا ہے کیونکہ لوگوں کے طرز معاشرت وذاتی افعال سے تعرض کرنا اصول آزادی کے خلاف ہے مگر اس کا یہ جواب بھی دیا ہے:

''حضرت عمرؓ تمام ملک میں مساوات اور جمہوریت کی جو روح پھونکنی چاہتے تھے وہ بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ وہ خود اور ان کے دست وبازو یعنی ارکان سلطنت اس رنگ میں ڈوبے نظر آئیں، عام آدمیوں کو اختیار ہے جو چاہیں کریں ان کے افعال کا اثر بھی انہی کی حد تک محدود رہے گا لیکن جو لوگ سلطنت کے ارکان ہیں، ان کے طرز معاشرت کا ممتاز ہونا لوگوں کے دلوں میں اپنی حقارت کا خیال پیدا کرنا ہے اور رفتہ رفتہ اس قسم کی باتوں سے سلطنت شخصی کی وہ تمام خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص آقا اور باقی تمام لوگ غلام ہیں''[٦٤]

مولانا شبلی نے پولٹیکل مصالح اور عرب کے اصل مذاق مساوات وعدم ترجیح کے

۱۔ محمد بن مسلمہ انصاری مشہور صحابی تھے، حضرت عمر نے تحقیقات کے عہدہ پر ان کو مامور کیا تھا

اصول پر اسی میں سلطنت کی کامیابی بتایا ہے، پھر یہ احکام عرب کی آبادیوں میں محدود تھے، شام میں حضرت امیر معاویہؓ کے بڑے سروسامان سے رہنے پر کچھ تعرض نہیں کرتے تھے شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے ان کے خدم وحشم کو دیکھ کر اس قدر کہا "یہ نوشیروانی جاہ وجلال کیسا؟ انہوں نے جواب دیا یہاں رومیوں سے سابقہ رہتا ہے اور ان کی نظر میں اس کے بغیر سلطنت کا رعب داب قائم نہیں رہ سکتا"۔[۶۵]

اس کے بعد صیغۂ محاصل کا بیان شروع ہوتا ہے جس میں امور ذیل پر بحث ہے۔ خراج کی ایجاد، عراق، شام اور مصر کے بندوبست، ہر جگہ کے جداگانہ اصول بندوبست، افسران بندوبست اقسام آراضی و پیداوار، لگان کی شرح، مال گزاری کی ترقی، اس کی پیمائش اور اس میں صحت واحتیاط، افتادہ زمینوں کی آبادی، پیداوار زراعت میں ترقی مال گزاری کی وصولی میں سختی کی ممانعت، صیغۂ محاصل میں اصلاحات، ترقی زراعت کے لئے ذرائع آب پاشی، نہر تالاب کھدانا، بند بنوانا، پانی کی تقسیم کے لئے دہانے بنانا، نہروں کے شعبے نکالنا، خراج وعشری زمین، گھوڑوں پر زکوۃ اور عشور وغیرہ۔

شروع ہی میں حضرت عمرؓ کو عرب میں طریقۂ خراج کا موجد بتایا، خراج کے نظم ونسق میں ان کو ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، امرائے فوج کا اصرار تھا کہ تمام مفتوحہ مقامات صلہ فتح کے طور پر ان کی جاگیر میں عنایت کئے جائیں اور باشندوں کو ان کی غلامی میں دیدیا جائے، حضرت عمر کی رائے تھی کہ زمین باشندوں کے قبضے میں رہنے دی جائے اور ان کو ہر طرح پر آزاد چھوڑ دیا جائے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ وغیرہ اہل فوج کے ہم زبان تھے بالآخر کثرت رائے سے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا، ان کا استدلال سورۂ حشر کی آیت " للفقراء الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم " کے اخیر فقرے " والذین جاؤا من بعدھم " سے تھا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے لیکن اگر فاتحین کو تقسیم کردیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔[۶۶]

ایک خاص بحث یہ بھی توجہ طلب ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جس قدر خراج وصول ہوا زمانہ بعد میں کبھی نہیں ہوا اور اسلام سے پہلے جس طرح خراج کا دفتر عراق

وایران میں فارسی زبان میں، شام کا رومی اور مصر کا قبطی میں تھا، حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اسی طرح رہا[۶۷]

قانون مال گزاری کے صیغے میں حضرت عمرؓ نے جو سب سے بڑا انقلاب کیا جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوش حالی دفعتاً نہایت ترقی کر گئی یہ تھا کہ زمینداری اور ملکیت زمین کا جو قدیم قانون تھا اور بالکل جابرانہ تھا مٹادیا،[۶۸] اس کی تفصیل اور مفتوح قوموں کے ساتھ دوسری رعایتوں نیز بندوبست مال گزاری میں ذمیوں سے رائے لینے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

غیر قوموں کے ساتھ حضرت عمرؓ کے انصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کو معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی قوم کی حق تلفی کی اور ان کو زراعت اور فلاحت سے روک دیا چنانچہ ارقام فرماتے ہیں:

''درحقیقت اس سے حضرت عمرؓ کی بڑی انجام بینی کا ثبوت ملتا ہے، عرب کے اصلی جوہر یعنی دلیری، بہادری جفاکشی، ہمت عزم اسی وقت تک قائم رہے جب تک وہ کاشکاری اور زمینداری سے الگ رہے، جس دن انہوں نے زمین کو ہاتھ لگایا، اسی دن یہ تمام اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے''[۶۹]

صیغۂ عدالت کا حال تحریر کرتے ہوئے پہلے یہ بتایا کہ محکمہ قضا کا قیام حضرتؓ کی بدولت ہوا، اس کو انتظامی صیغے سے الگ کیا، اس کے لئے با اثر اور رعب داب والا ہی مقرر کیا، تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کئے، آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی کافی تعداد مقرر کی تاکہ فصل مقدمات میں حرج نہ ہو، قضاۃ کے انتخاب میں احتیاط اور نکتہ سے کام لینا تقرر کے وقت ان کا امتحان لینا، کوفہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام قضا کے اصول و آئین پر فرمان لکھا، رشوت سے محفوظ رکھنے کے وسائل اختیار کئے۔ قاضیوں کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، دولت مند اور معزز شخص ہی کو قاضی مقرر کرتے، ان کو خرید و فروخت کی اجازت نہ دیتے، انصاف میں مساوات سے کام لیا اور انصاف ارزاں اور آسان بنایا، عدالت کا مکان مصلحتاً نہیں بنوایا، مسجدوں پر اکتفا کیا، مصنف نے ا

کے زمانے کے حکام عدالت کے نام لکھے اور آخر میں محکمہ افتا قائم کرنے کا ذکر کیا ہے ایک اہم بحث شروع ہی میں یہ کی کہ رومن امپائر کے دوازدہ گانہ قواعد سے حضرت عمرؓ کے قواعد سے موازنہ کیا۔

مولانا نے فصل خصومات میں پورا عدل وانصاف جن باتوں پر موقوف بتایا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ عمدہ اور مکمل قانون جس کے مطابق فیصلے عمل میں آئیں۔

۲۔ قابل اور متدین حکام کا انتخاب

۳۔ وہ اصول اور آئین جن کی وجہ سے حکام رشوت اور دیگر ناجائز وسائل کے سبب سے فصل خصومات میں رورعایت نہ کرنے پائیں۔

۴۔ آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کا کافی ہونا تاکہ مقدمات کے انفصال میں ہرج نہ ہونے پائے۔

اور حضرت عمرؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان تمام امور کا اس خوبی سے انتظام کیا کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا تھا۔[۱]

فوج داری اور پولیس کے صیغے میں یہ لکھا ہے کہ مقدمات فوج داری کے لئے کوئی جدا محکمہ نہیں قائم کیا، پولیس کا صیغہ مستقل طور پر قائم ہوگیا تھا، اس صیغے میں جیل خانے بنوانا اور جلاوطنی کی سزا ان کی ایجاد ہے۔[۱]

بیت المال یا خزانے کا صیغہ بھی حضرت عمر کی بہ دولت ۱۵ھ میں اس طرح وجود میں آیا کہ حضرت ابو ہریرہ عاملؓ بحرین ۵ لاکھ کی رقم لائے، حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس کے متعلق مشورہ کیا، ولید بن ہشام نے کہا میں نے سلاطین شام کے ہاں دیکھا ہے کہ خزانہ اور دفتر کا جدا جدا محکمہ قائم ہے مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

''آج کل کا زمانہ ہوتا تو غیر مذہب والوں کے نام سے اجتناب کیا جاتا لیکن حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور بیت المال کی بنیاد ڈالی''[۲] حضرت عمرؓ نے سب سے بڑا خزانہ دارالخلافہ مدینہ منورہ میں قائم کیا اور اس کی نگرانی اور حساب کتاب کے لئے حضرت

عبداللہ بن ارقم کوخزانہ کا افسر مقرر کیا۔ تمام صوبہ جات اور صدر مقامات میں بیت المال قائم کئے، ان میں جس قدر رقم وہاں کے ہر قسم کے مصارف کے لئے ضروری ہوتی تھی رکھ لی جاتی تھی باقی سال کے ختم ہونے کے بعد صدر خزانہ مدینہ منورہ کے بیت المال میں بھیج دی جاتی۔

مولانا نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ تعمیر کے باب میں کفایت شعاری کرتے تھے لیکن بیت المال کی عمارتیں شاندار اور مستحکم بنوائیں [۴۳]

پبلک ورک کوزمانہ حال کی ایجاد بتایا ہے اسی لئے عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں تھا، مصروشام میں اس کا ترجمہ نظارت نافعہ کیا گیا ہے، اس میں جو چیزیں داخل ہیں مولانا کہتے ہیں شفاخانوں کے سوا ہر چیز حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہایت منتظم اور وسیع طور پر موجود تھیں مثلاً نہریں جو علاوہ ترقی زراعت کے اور اغراض کیلئے تیار ہوئیں عمارات میں مذہبی مساجد، فوجی مساجد، قلعے، چھاؤنیاں، بارکیں کا نام لیا ہے لیکن موقع کے لحاظ سے یہاں آخر الذکر سے تعلق رکھنے والی عمارتوں کا کچھ حال تحریر کیا ہے جیسے دارالامارت، دیوان (دفتر) بیت المال، قید خانے، مہمان خانے، سڑکیں پل اور مکہ سے مدینہ تک چوکیاں اور سرائیں [۴۴]

شہروں کا آباد کرنا کے زیر عنوان حسب ذیل شہروں کے آباد کرنے کا ذکر اور ان کا حال بیان کیا ہے:

بصرہ، کوفہ، فسطاط، موصل اور جیزہ۔

کوفہ کی جامع مسجد کی تعمیر کے ضمن میں اس کے آگے ایک وسیع اور دوسو ہاتھ لمبے سائبان بنائے جانے کا ذکر ہے جسکو سنگ رخام کے ستونوں پر قائم کیا گیا تھا جونوشیروانی عمارات سے نکال کر لائے گئے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا یہ بات یاد رکھنے کے قابل بتاتے ہیں:

''باوجود اس کے کہ دراصل نوشیروانی عمارت کا کوئی وارث نہ تھا اور اصولِ سلطنت کے لحاظ سے اگر کوئی وارث ہوسکتا تھا تو خلیفہ وقت ہوتا لیکن حضرت عمرؓ کا یہ عدل وانصاف تھا کہ مجوسی رعایا کوستونوں کی قیمت ادا کی گئی یعنی ان کی تخمینی جو قیمت ٹھہری، وہ ان کے جزیہ میں مجرا کی گئی'' [۴۵]

فوجی نظام میں اسلام سے پہلے کے فوجی سسٹم کو غیر منتظم اور اصول سیاست کے خلاف بتا کر رومن امپائر، فارس اور فرانس کے فوجی نظام کا حال بیان کیا ہے اور حضرت عمرؓ کے فوجی نظام کے بارے میں یہ لکھا کہ:

''۱۵ھ ہی میں حضرت عمرؓ نے اس صیغے کو اس قدر منتظم اور باقاعدہ کردیا کہ اس وقت کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے''۔ [۷۶]

پھر صیغہ فوج کے مختلف شعبوں اور انتظاموں کا بیان ہے ملک کو فوجی حیثیت سے تقسیم کرنے اور مختلف مقامات پر فوج کے صدر مقامات مقرر فرمانے اور ان کے وجوہ واسباب پر بحث کی ہے، فوجی بارکوں، فوجی چھاؤنیوں، بحری قلعوں، فوجی حفظان صحت، محکمہ خبر رسانی ہر سال ۳۰؍ ہزار نئی فوج تیار ہونے، ہر فوجی صدر مقام کے متعلق بڑے بڑے اصطبل ہونے کا ذکر ہے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے، فوج کی تنخواہوں اور رسد، خوراک، کپڑا اور بھتہ غرض ہر ہر چیز کا ذکر ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی فوج میں ایرانی، رومی اور یہودی یہاں تک کہ ہندوستانی راجپوت اور جاٹ بھی شامل تھے۔ مولانا نے ایک جگہ بڑی دردمندی سے یہ لکھا:

''یہی نظام تھا جس کی بدولت ایک مدت تک تمام دنیا پر عرب کا رعب وداب قائم رہا اور فتوحات سیلاب برابر بڑھتا گیا جس قدر اس نظام میں کمی ہوتی گئی، عرب کی طاقت میں ضعف آتا گیا، سب سے پہلے امیر معاویہ نے اس میں تبدیلی کی یعنی شیر خوار بچوں کی تنخواہ بند کردی، عبدالملک بن مروان نے اور بھی گھٹا دیا اور معتصم باللہ نے سرے سے فوجی دفتر میں سے عرب کے نام نکال دئے اور اسی دن درحقیقت حکومت بھی عرب کے ہاتھ سے نکل گئی''۔ [۷۷] حضرت عمرؓ کے فوجی نظام کی یہ جامعیت اور وسعت مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''حضرت عمرؓ نے اس سلسلے کے ساتھ انتظامات کے اور صیغوں پر بھی توجہ کی اور ایک ایک صیغے کو اس قدر منتظم کردیا کہ اس وقت کے تمدن کے لحاظ سے ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے، فوجوں کی بھرتی کا دفتر جس کی ابتداء مہاجرین اور انصار سے ہوئی تھی، وسیع ہوتے ہوتے قریباً تمام عرب کو محیط ہوگیا''۔ [۷۸]

صیغہ مذہبی

میں اسلام کی اشاعت، اس کے طریقے اور اس کے اسباب لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ خلیفہ ثانی کے مبارک عہد میں اسلام کثرت سے پھیلا۔ پھر قرآن مجید کے تعلق سے ان کی خدمات کی تفصیل بیان کی ہے، اسی طرح حدیث وفقہ کی ترویج وتعلیم کی کوششوں اور قرآن کے معلمین اور قاریوں اور فقہا کی تنخواہیں مقرر کرنے کا ذکر کیا ہے تعلیم کے مکاتب اور بدوؤں کی جبری تعلیم، شہ سواری اور کتابت سکھانے کا تذکرہ بھی ہے، امام ومؤذن اور رہبر حج مقرر کرنے اور انکو تنخواہیں دینے ممالک مفتوحہ میں بہ کثرت مساجد کی تعمیر، حرم کی عمارت کی توسیع اور اس کی زیب وزینت پر توجہ دینے، غلاف کعبہ قباطی بنانے اور مسجد میں فرش اور روشنی کا انتظام کرنے غرض ایک ایک جزئیہ پر بحث کیا ہے۔

متفرق انتظامات کے ضمن میں سب سے مشہور چیز سنہ ہجری مقرر کرنا ہے اس کے علاوہ مختلف قسم کے رجسٹر تیار کرانا جیسے خراج کا دفتر، بیت المال کے کاغذات کا حساب، مصارف جنگ کے کاغذات، مردم شماری کے کاغذات، لوگوں کے اوصاف کے لحاظ سے ان کی فہرستیں تیار کرانا، تحریری معاہدے حفاظت سے صندوق میں رکھنے اور سکوں کی ایجاد پر بحث کی ہے۔

ذمیوں کے حقوق:

بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جو حقوق دئے اور جس طرح ان کی مذہبی آزادی برقرار رکھی اور ان سے کئے گئے معاہدوں کی پابندی کی اس کی مثال اسلام سے پیش تر اور اسکے بعد کہیں نہیں مل سکتی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں ہی کے بقدر ذمیوں کو حقوق دے کر دونوں کو ہم سر بنا دیا تھا اور سازش وبغاوت کے باوجود ان کے معاملے میں مراعات برتتے تھے۔ یہاں بعض اہم باتوں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عریسوس کے ذمی معاہدہ صلح کے بعد بھی در پردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے اور ادھر خبریں ان کو پہنچاتے تھے حضرت عمرؓ نے وہاں کے حاکم عمیر بن سعد کو لکھا کہ ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دوچند قیمت دیدو اور ان

سے کہو کہ اور کہیں چلے جائیں، اگر اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد جلا وطن کر دو، چنانچہ جب وہ اپنی شرارت سے باز نہ آئے تو اس حکم کی تعمیل کی گئی مولانا لکھتے ہیں:

''کیا آج کل کوئی قوم اس درگذر اور عفو و مساحت کی کوئی نظیر دکھلا سکتی ہے''۔[۷۹]

سازش اور بغاوت کے باوجود انہیں مراعات دئے جاتے رہنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آج کل جن حکومتوں کو تہذیب وترقی کا دعوی ہے، رعایا کے ساتھ ان کی تمام عنایت اسی وقت تک ہے جب تک ان کی طرف سے کوئی پولیٹکل شبہ نہ پیدا ہو ورنہ دفعتاً وہ تمام مہربانی غضب اور قہر سے بدل جاتی ہے اور ایسا خون خوار اور پر غیظ انتقام لیا جاتا ہے کہ وحشی قومیں بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں کرسکتیں، برخلاف اسکے حضرت عمرؓ کا قدم کسی حالت میں جادۂ انصاف سے ذرا نہیں ہٹا''۔[۸۰]

اخیر میں ان واقعات کی اصل حقیقت واضح کی ہے جن کی وجہ سے یہ غلط خیال پیدا ہوا یا ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یا خود اسلام نے ذمیوں کے ساتھ ناانصافانہ سلوک کئے، ان کے دئے گئے جو احکام مخالف کے نزدیک قابل اعتراض ہوسکتے ہیں ان کی یہ فہرست دی ہے۔

وضع اور لباس وغیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبہ نہ کرنے پائیں، کمر میں زنار باندھیں، لمبی ٹوپیاں پہنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کسیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، شراب اور سور نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں، صلیب نہ نکالیں، بنو تغلب اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دینے پائیں، عرب سے یہودیوں اور عیسائیوں کو جلا وطن کر دیا، جزیہ عائد کیا۔ ان میں سے بعض کا جواب تمہید میں گزر چکا ہے، یہاں ان سب کا بڑا مدلل ومسکت جواب دیا ہے[۸۱] جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

غلامی کا رواج کم کرنا میں دکھایا ہے کہ گو غلامی کو معدوم نہیں کرسکے لیکن غلاموں کو احرار کا رتبہ اور غلامی کو برادری اور ہمسری بنا دیا۔ اس کے ثبوت میں ان کے ساتھ مراعات

اور دوسرے حسن سلوک کی تفصیل لکھی ہے اس ضمن میں غلط طور پر مشہور ہو جانے والے حضرت شہر بانو کے قصہ کی تردید کی ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ فتح ایران کے بعد یزدگرد شہنشاہ فارس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں تو حضرت عمرؓ نے عام لونڈیوں کی طرح بازار میں ان کو بیچنے کا حکم دیا، لیکن حضرت علیؓ نے خاندانِ شاہی کے ساتھ ایسا سلوک ناروا بتا کر مشورہ دیا کہ لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کر کے کسی کے اہتمام و سپردگی میں ان کو دے دیا جائے اور خود اپنے اہتمام میں لے کر ایک امام حسین کو اور دوسری محمد بن ابی بکر اور تیسری عبداللہ بن عمرؓ کو عنایت کی۔

مولانا نے اس غلط قصہ کی حقیقت یہ بتائی کہ زمخشری نے ربیع الابرار میں اس کو لکھا اور ابن خلکان نے امام زین العابدین کے حال میں یہ روایت ان کے حوالہ سے نقل کر دی۔

مولانا نے اس کے غلط ہونے کی یہ وجہیں لکھی ہیں:

۱۔ زمخشری کو فن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں، ان کا اس میں جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے۔

۲۔ طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری، ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کو نہیں لکھا۔

۳۔ تاریخی قرائن اس کے بالکل خلاف ہیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں یزدگرد اور خاندانِ شاہی پر مسلمانوں کو مطلق قابو نہیں حاصل ہوا، مداین کے معرکہ میں یزدگرد مع تمام اہل وعیال کے دار السلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا، جب مسلمان حلوان پر بڑھے تو وہ اصفہان بھاگ گیا اور پھر کرمان وغیرہ میں ٹکراتا پھرا، مرو میں پہنچ کر ۳۰ھ میں جو حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ ہے مارا گیا، اس کی آل واولاد اگر گرفتار ہوئے ہوں گے تو اسی وقت گرفتار ہوئے ہوں گے۔

۴۔ واقعہ کے وقت حضرت حسین کی عمر بارہ برس تھی، وہ ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے اور فارس ۱۷ھ میں فتح ہوا اس لئے یہ امر بھی کس قدر مستبعد ہے کہ حضرت علیؓ نے نابالغی میں ان پر اس قسم کی عنایت کی ہوگی، اس کے علاوہ ایک شہنشاہ کی اولاد کی قیمت نہایت گراں قرار پائی ہوگی، اور حضرت علی نہایت زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۵۔ حضرت عمرؓ کی تاریخ میں اس قسم کا واقعہ جو مسلم طور پر ثابت ہے اس میں وہی برتاؤ کیا گیا جو تہذیب وانسانیت کا مقتضا تھا اور جو آج بھی تمام مہذب ملکوں میں جاری ہے۔ مصر پر چڑھائی میں حضرت عمرو بن العاص نے اول بلبیس پر حملہ ہوا اتفاق سے مقوقس بادشاہ مصر کی بیٹی جس کا نام ارمانوسہ تھا، یہیں مقیم تھی، وہ بھی گرفتار ہوئی، عمرو بن العاص نے اس کو نہایت عزت وحرمت سے مقوقس کے پاس بھیج دیا اور مزید احتیاط کے لئے اپنے ایک سردار کو جس کا نام قیس بن ابی العاص سہمی تھا، ساتھ کر دیا کہ حفاظت کے ساتھ پہنچا آئے۔[۸۲]

سیاست وتدبیر، عدل وانصاف:

یہ الفاروق کا بڑا اہم باب اور حضرت عمرؓ کی زندگی کا سب سے درخشاں پہلو ہے۔ اس کے عنوانات سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔

عام سلاطین اور حضرت عمرؓ کے طریق سیاست میں فرق، رعایا کی اطاعت وانقیاد کو جابرانہ سیاست سے پرہیز میں دخل نہ تھا، حضرت عمرؓ کی مشکلات، ان کی حکومت کی خصوصیتیں، اصول مساوات، امیر المؤمنین کا لقب کیوں اختیار کیا، سیاست کے اصول سے واقف تھے مختلف ممالک کی مناسبت سے الگ الگ تدبیریں کر سکے، بغاوت کے استیصال کے لئے جنگی مقامات پر عرب آباد کرائے اور فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، عرب میں پولیٹکل تدبیروں سے کام لیا (یہودیوں اور عیسائیوں کو عرب سے نکالا، بڑے بڑے افسروں کو بدلتے رہے۔ عزیز واقارب کو عہدے نہ دئے) فریب اور حکمت عملی سے پرہیز کیا، عہدہ داروں کا عمدہ انتخاب کیا، بے لاگ عدل وانصاف سے کام لیا، قدیم سلطنتوں کے حالات سے واقفیت حاصل کی، حالات سے باخبر رہنے کے لئے پرچہ نویس اور واقعہ نگار مقرر کئے، بیت المال کا خیال رکھتے، تمام کاموں کو وقت پر انجام دیتے غربا ومساکین کے روزینے مقرر کئے، لنگر خانے اور مہمان خانے بنوائے، لاوارث بچوں کا انتظام بیت المال سے کرایا، یتیموں کی پرورش اور ان کی جائداد کی حفاظت کا انتظام کیا، قحط کے انتظام میں سرگرمی دکھائی، جزئیات پر توجہ دیتے اور چھوٹے چھوٹے کام خود انجام دیتے، رعایا کی شکایتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے وسائل

اختیار کرتے، رعایا کے آرام وآسائش کا خیال اوران کے خبر گیری رکھتے۔وغیرہ

حضرت عمرؓ کے اس اہتمام کہ" ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقروفاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے" اور رعایا کی ہر طرح خبر گیری، قحط کے زمانے میں داد دہش وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بڑی اہم بات لکھی ہے:

"اس موقع پر یہ بات خاص طور پر جتا دینے کے قابل ہے کہ حضرت عمرؓ کو اگر چہ ملک کی پرورش اور پرداخت کا اتنا کچھ اہتمام تھا لیکن ان کی یہ فیاضی ایشیائی قسم کی فیاضی نہ تھی جس کا نتیجہ کاہلی اور مفت خوری کا رواج دینا ہوتا ہے، ایشیا میں سلاطین وامرا کی فیاضیوں کا ذکر عموماً بڑے ذوق سے کیا جاتا ہے، لیکن لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ اس سے جہاں ایک بادشاہ کی مدح نکلتی ہے، دوسری طرف قوم کا دریوزہ گر ہونا اور انعام وبخشش پر لولگائے رہنا ثابت ہوتا ہے، یہی ایشیائی فیاضیاں تھیں جس نے آج ہماری قوم میں لاکھوں آدمی ایسے پیدا کردئے ہیں جو خود ہاتھ پاؤں ہلانا نہیں چاہتے اور نذر ونیاز پر اوقات بسر کرتے ہیں"[٨٣]

اس بحث میں مصنف نے حضرت عمرؓ کی تدبیر وسیاست کے جو واقعات اور مثالیں لکھی ہیں ان کی بنا پر ان کا یہ لکھنا تمام تر درست ہے "ان واقعات سے ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو سیاست وتدبیر کے فن میں جو کمال حاصل تھا، کسی مدبر اور فرماں روا کے حالات میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی"

ان کی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آئین حکومت میں شاہ وگدا، شریف ورذیل، عزیز وبے گانہ سب کا ایک رتبہ تھا"[٨٤]

امامت واجتہاد

اس عظیم الشان عنوان کے تحت انہوں نے ۵۰ سے زیادہ صفحے لکھے ہیں اس میں ان کے علمی کمالات دین وعقیدہ اور سیرت واخلاق میں پختگی، حدیث وفقہ میں تبحر، علم اسرار الدین کی بنا اور اجتہاد واستنباط میں مہارت وغیرہ پر بحث کی ہے، اس کی بعض اہم بحثوں کی طرف اہل نظر کو متوجہ کرانا مناسب ہوگا۔

مولانا کے نزدیک مذہبی احکام اور عقائد اگر چہ بظاہر سادہ اور صاف ہیں لیکن ان

مسائل میں اشتباہ اور ابہام اس قدر ہے کہ اگر نہایت نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے کام نہ لیا جائے تو ان کی یہ حقیقت بالکل بدل جاتی ہے، اسلام انہی غلطیوں کو مٹانے کے لئے آیا چنانچہ لکھتے ہیں:

''لیکن چونکہ عام طبائع نکتہ سنج نہیں ہوتیں اس لئے ہر زمانے میں اکثر لوگ اصل حقیقت سے دور ہو جاتے تھے اور اسی لئے ائمہ اور مجددین کی ضرورت باقی رہی کہ ان اسرار پر پردہ نہ پڑنے پائے مثلاً اسلام نے شرک کو کس زور شور سے مٹایا لیکن غور سے دیکھو تو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرز عمل ہے اس میں اب بھی شرک کا کس قدر مخفی اثر موجود ہے گو استفادہ عن القبور اور حصول برکت کے خوش نما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ان نازک اور مشتبہ مسائل میں جس طرح اصل حقیقت کو سمجھا اور جس جرأت و دلیری سے اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کیا، اس کی نظیر صحابہ کے زمانے میں بھی بہت کم ملتی ہے''[۸۵]

مذہبی احکام کے متعلق شروع سے دو خیال چلے آتے ہیں ایک یہ کہ ان میں عقل کو دخل نہیں دوسرا یہ کہ اس کے تمام احکام اصول عقلی پر مبنی ہیں حضرت عمرؓ اسی دوسرے اصول کے قائل تھے اور وہ سب سے پہلے شخص ہیں جس نے علم اسرار الدین کی بنیاد ڈالی[۸۶]

مولانا شبلی کے خیال میں نبوت کی حقیقت کی نسبت عموماً لوگ یہ کرتے آئے ہیں، اکثروں کا خیال ہے کہ نبی کا ہر قول و فعل خدا کی طرف سے ہوتا ہے مگر مولانا لکھتے ہیں:

''نبی جو حکم منصب نبوت کی حیثیت سے دیتا ہے وہ بے شبہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے باقی امور وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ہوتے ہیں تشریعی اور مذہبی نہیں ہوتے، اس مسئلے کو جس قدر حضرت عمرؓ نے صاف اور واضح کر دیا کسی نے نہیں کیا، خراج کی تشخیص جزیہ کی تعیین، ام ولد کی خرید و فروخت وغیرہ مسائل کے تعلق امام شافعی نے اپنی کتابوں میں نہایت ادعا کے ساتھ احادیث سے استدلال کیا ہے اور ان مسائل میں جہاں حضرت عمرؓ کا طریق عمل مختلف ہے بڑی دلیری سے ان پر قدح کی ہے لیکن امام شافعی نے یہ نکتہ نظر انداز کیا کہ یہ

امور منصب نبوت سے تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان مسائل میں خود شارع علیہ السلام کی طرف سے ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہے'' [۸۷]

آگے اس مسئلے کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ارشادات کی روشنی میں اور صاف کردیا ہے [۸۸]

فے، خمس، باغ فدک وغیرہ کے متعلق حضرت عمرؓ کی رائے کو پوری طرح منقح کردیا ہے [۸۹] اور آخیر میں لکھا ہے۔

''ان واقعات سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ مسائل کو جو ابتداء سے آج تک معرکہ آرا رہے ہیں اور جن میں بڑے بڑے اکابر صحابہ کو اشتباہ ہوا، حضرت عمرؓ نے کس خوبی سے طے کیا کہ ایک طرف تو قرآن وحدیث کا صحیح محمل وہی ہوسکتا ہے اور دوسری طرف اصولِ سلطنت ونظام تمدن سے بالکل مطابقت رکھتا ہے'' [۹۰]

ذاتی حالات اور اخلاق وعادات:

میں حضرت عمرؓ کی جامعیت، امارت کی اہلیت کے اوصاف سے متصل ہونے، ملکہ تقریر، قوت تحریر، مذاق، شاعری، انساب وعبرانی زبان سے واقفیت، ذہانت وطباعی، حکیمانہ مقولے، اصابت رائے، نکتہ رسی، مذہبی زندگی (عبادت، نماز، روزہ، حج، مواخذہ قیامت کا خوف) بے تعصبی (عیسائیوں کے برتن اور کھانے کا استعمال) علمی صحبتیں، اہل علم وفضل سے صحبت، اصحاب کمال کی قدر دانی، رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں کا خیال، تواضع وسادگی، زندہ دلی، مزاج کی سختی، آل واولاد سے محبت، مسکن، وسائل معاش (تجارت اور جاگیر، تنخواہ) غذا، لباس سادگی اور بے تکلفی، رہبانیت اور تقشف بیزاری، حلیہ کا ذکر ہے۔ اخیر میں ان کے ۴۵ اولیات کی فہرست دی ہے۔

ازواج واولاد: میں ازواج واولاد کا مختصر ذکر ہے۔

خاتمہ: میں یہ دکھایا ہے کہ دنیا کا کوئی نامور حضرت عمرؓ کا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا ان کی جامعیت کا یہ حال تھا کہ ''وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، مسیح بھی تھے اور سلیمان بھی، تیمور بھی تھے اور نوشیرواں بھی، امام ابوحنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادہم بھی'' [۹۱]

اوروں اور حضرت عمرؓ کا یہ فرق بھی دکھایا ہے کہ ہر حکمراں کی حکومت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا مگر حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا۔[۹۲]

علمی حیثیت سے فائق اور اخلاقی لحاظ سے بجز انبیا کے سب ان سے ہیچ تھے اخیر کے دو صفحے میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک تحریر نقل کی ہے اس سے بھی حضرت عمرؓ کا جامع کمالات ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کے بقول الفاروق میں حضرت عمرؓ کے سوانح و حالات تفصیل کے ساتھ اور اس صحت کے ساتھ لکھے گئے جو تاریخی تصنیف کی صحت کی اخیر حد ہے، خصوصاً ان کی حکومت کے کارنامے اور اس کے تمام شعبوں کی خصوصیات کو جس طرح نمایاں کیا ہے اس سے ان کی خاص نکتہ سنجی، دقیقہ بینی اور سعی و محنت کا پتہ چلتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس تاریخ ساز تصنیف کی یہ سب سے بڑی خوبی بعض کوتاہ نظر لوگوں کے نزدیک اس کا عیب بن گئی ہے ؎

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

اس کی تردید کے لئے علامہ شبلی کے ایک پایہ شناس کا یہ اقتباس نقل کر کے مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

''ناظرین کو شاید وہ خاص مقصد معلوم نہ ہو جس نے علامہ کو الفاروق کی تالیف پر آمادہ کیا تھا علامہ اگرچہ قدیم اسلامی طرز تعلیم کے تربیت یافتہ تھے، لیکن عام علماء کی طرح دنیا کے حالات وواقعات سے بے خبر نہ تھے، ان کے دل میں قوم وملت کا درد تھا، ان کی نظر تہذیب مغربی کی ان فریب کاریوں اور ملمع سازیوں کی حقیقت شناس تھی، جن سے مسحور ہو کر مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھ رہا تھا کہ فطرت انسانی کی ہر قابلیت خواہ وہ علم وفن کی ہو یا سیاست وتدبیر کی، صرف دیار مغرب ہی کو حاصل ہے، یہ غلامانہ احساس کمتری دراصل اسلاف کے شاندار کارناموں سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا زریں ورق الٹا جائے جس کو دیکھ کر مسلمان محسوس کریں کہ وہ ایک ایسے مذہب کے پیرو ہیں جس کی روحانی قوت بڑے بڑے کج کلاہوں کے ایوان اقتدار کی بنیادوں کو متزلزل

کر سکتی ہے، اس کے لئے فاروق اعظمؓ ہی کے کوکبۂ جلال وعظمت کا منظر کام آسکتا تھا، جس کو پیش کر کے علامہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور کامل یقین واعتماد کے ساتھ دنیا کے تمام حریفوں کو چیلنج دیا کہ ''جس احتیاط وقید کے ساتھ حضرت عمرؓ نے فتوحات کیں، جس طرح قیصر وکسریٰ کے قصر ہائے فلک بوس کے کنگروں پر مٹھی بھر بے سروسامان صحرانشینوں کے ہاتھوں سے اسلام کا پرچم اقبال لہرایا، فرش خاک پر بیٹھ کر حکومت وفرماں روائی کا جو جاہ وجلال دکھایا، عام رعایا کو مساوات وآزادی کے جو گراں بہا حقوق عطا کئے، عدل وانصاف کا جو نمونہ پیش کیا، صاحب حکومت ہوتے ہوئے ایک عام آدمی کی طرح جس سادگی کے ساتھ زندگی بسر کی، ایک غیر متمدن ملک کی خاک سے پیدا ہو کر جو وسیع نظام سلطنت قائم کیا، اگر دنیا کے کسی فاتح یا حکمراں کے حالات زندگی میں اس کی کوئی نظیر موجود ہو تو پیش کرو''

اس چیلنج کو ایک مدتِ دراز گذر گئی لیکن اس کے جواب میں آج تک دنیا کے کسی گوشہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی''[۹۳]

☆☆☆

حواشی

١۔ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق۔ دیباچہ ص:١۔ معارف پریس اعظم گڑھ ١٩٥٦ء/ ١٣٧٦ھ

٢۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی: مقالات شروانی ص: ٣٣، ٣٤۔ شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ۔ ١٩٤٧ء

٣۔ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق۔ تمہید ص:٣ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ١٩٥٦ء/ ١٣٧٦ھ

٤۔ ایضاً

۵۔ " " ص:٤

٦۔ " سیرۃ النبی حصہ اول مقدمہ طبع جدید " ١٩٩٦ء

٧۔ " " ص:١٨ " "

٨۔ معارف اگست ١٩٨١ء ص:١٤٦ مضمون ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

٩۔ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق (تمہید) ص:٦تا٩ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ١٩٥٦ء/ ١٣٧٦ھ

١٠۔ " " ص:٩ " "

١١۔ " " ص:١٠ " "

١٢۔ " " ص:١١ " "

١٣۔ " " ص:١٢ " "

١٤۔ " " ص:١٣و١٤ " "

١۵۔ " " ص:١٤و١۵ " "

١٦۔ " " ص:١۵ " "

١٧۔ " " ص: " " "

١٨۔ " " ص:١٦ " "

١٩۔ " " ص:١٦و١٧ " "

٢٠۔ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق (تمہید) ص:١٧ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ١٩٥٦ء/ ١٣٧٦ھ

٢١۔ " " ص: " " "

۲۲۔ ” ” ص:۱۸ ” ”

۲۳۔ ” ” ص:۱۹ ” ”

۲۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی: مقالات شروانی ص:۳۴ شروانی پرنٹنگ پریس ۱۹۴۷ء

۲۵۔ مولانا شبلی نعمان۔ الفاروق حصہ اول ص:۲۱۔ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

۲۶۔ ” ” ص:۲۹ ” ”

۲۷۔ ” ” ص:۳۲ ” ”

۲۸۔ ” ” ص:۳۳ ” ”

۲۹۔ ” ” ص:۳۴ ” ”

۳۰۔ ” ” ص:۳۷ ” ”

۳۱۔ ” ” ص:۳۸ ” ”

۳۲۔ ” ” ص:۴۲و۴۳ ” ”

۳۳۔ مولانا شبلی نعمانی۔الفاروق حصہ اول ص:۴۷ معارف پریس اعظم گڑھ۔۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

۳۴۔ ” ” ص:۵۰ ” ”

۳۵۔ ” ” ص:۵۴تا۵۸ ” ”

۳۶۔ ” ” ص:۵۹تا۶۵ ” ”

۳۷۔ ” ” ص:۹۵ ” ”

۳۸۔ ” ” ص:۱۰۸و۱۰۹ ” ”

۳۹۔ ” ” ص:۱۰۹و۱۱۰ ” ”

۴۰۔ ” ” ص:۱۱۰ ” ”

۴۱۔ ” ” ص:۱۱۲ ” ”

۴۲۔ مولانا شبلی نعمانی۔الفاروق حصہ اول ص:۱۱۳معارف پریس اعظم گڑھ۔۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

۴۳۔ ” ” ص:۱۶۸ ” ”

۴۴۔ ” ” ص:۱۷۲ ” ”

۴۵۔ ” ” ص:۱۷۶ ” ”

۴۶۔ ” ” ص:۱۸۷ ” ”

۴۷۔ ” ” ص:۱۵۰ ” ”

۴۸۔ ” ” ص:۱۵۱ ” ”

۴۹۔ ” ” ص: ” ” ”

۵۰۔ ” ” ص:۱۵۲ ” ”

۵۱۔ ” ” ص:۱۸۴ ” ”

۵۲ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ مقالات شروانی۔ ص:۳۷۔ شروانی پرنٹنگ پریس علیگڑھ ۱۹۴۷ء

۵۳۔ ” ” ص:۳۸ ” ”

۵۴۔ مولانا شبلی نعمانی۔ الفاروق حصہ دوم ص:۵ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ

۵۵۔ ” ” ص:۵و۶ ” ”

۵۶۔ ” ” ص:۷و۸ ” ”

۵۷۔ ” ” ص:۹ ” ”

۵۸۔ ” ” ص:۱۰ ” ”

۵۹۔ ” ” ص:۱۰ ” ”

۶۰۔ ” ” ص:۱۹و۲۰ ” ”

۶۱۔ ” ” ص:۲۱تا۳۲ ” ”

۶۲۔ ” ” ص:۳۳ ” ”

۶۳۔ ” ” ص: ” ” ”

۶۴۔ مولانا شبلی نعمانی۔ الفاروق حصہ دوم ص:۳۴ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ

۶۵۔ ” ” ص: ” ” ”

۶۶۔ ” ” ص:۳۸ ” ”

۶۷۔ ” ” ص:۴۲ ” ”

۶۸۔ ” ” ص:۴۷ ” ”

۶۹۔ ” ” ص:۴۹ ” ”

۷۰۔ "	"	ص:۵۸	"	"
۷۱۔ "	"	ص:۶۶ و ۶۷	"	"
۷۲۔ مولانا شبلی نعمانی۔	الفاروق حصہ دوم	ص:۶۹۔	معارف پریس اعظم گڑھ۔	۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ
۷۳۔"	"	ص:۶۹ و ۷۰	"	"
۷۴۔"	"	ص:۷۱ تا ۷۴	"	"
۷۵۔ "	"	ص:۸۰	"	"
۷۶۔ "	"	ص:۸۶	"	"
۷۷۔"	"	ص:۹۷	"	"
۷۸۔ "	"	ص:۹۹	"	"
۷۹۔ "	"	ص:۱۴۶	"	"
۸۰۔ "	"	ص:۱۴۵	"	"
۸۱۔ "	"	ص:۱۴۶ تا ۱۵۴	"	"
۸۲۔ "	"	ص:۱۵۷ تا ۱۵۹	"	"
۸۳۔"	"	ص:۱۸۳	"	"
۸۴۔"	"	ص:۱۶۵	"	"
۸۵۔ "	"	ص:۱۹۰ و ۱۹۱	"	"
۷۲۔ مولانا شبلی نعمانی۔	الفاروق حصہ دوم۔	ص:۱۹۳۔	معارف پریس اعظم گڑھ۔	۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ
۸۷۔"	"	ص: "	"	"
۸۸۔"	"	ص:۲۱۸	"	"
۸۹۔ "	"	ص:۲۲۶ تا ۲۴۰	"	"
۹۰۔ "	"	ص:۲۴۰	"	"
۹۱۔ "	"	ص:۲۸۷	"	"
۹۲۔ "	"	ص: "	"	"
۹۳۔ مرزا احسان احمد	مقالات احسان	ص:۶۹ و ۷۰	"	۱۹۶۸ء/ ۱۳۸۷ھ

☆☆☆

الفاروق کے مصادر۔عمومی تجزیہ

جمشید احمد ندوی

قوم وملت کی تشکیل وتربیت کا ایک طریقہ کار یہ ہوسکتا ہے کہ قوم کے مشاہیر ونابغہ روزگار اشخاص کے تذکرے لکھے جائیں، ان کی سوانح حیات قلمبند کی جائے، ان کے حالات، واقعات اور کارنامے بیان کئے جائیں تاکہ نئی نسلیں اپنے اسلاف کی حیات وکارناموں سے متعارف ہوتی رہیں اور ان کا رشتہ ماضی سے استوار رہ سکے اور حال میں ان مشاہیر کی پیروی مستقبل میں کامیابی کی ضامن ہوسکے۔شاید اسی مقصد کے حصول کے لئے علامہ شبلیؒ نے ''ہیروز آف دی اسلام'' کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

الفاروق، خلیفہ دوم، صحابی جلیل حضرت عمرؓ کی زندگی کے شب وروز، حالات وواقعات اور کارناموں کا بہترین مرقعہ ہے جو علامہ شبلیؒ کے اشہب قلم کا مرہون منت ہے جس میں ان کے وسیع مطالعہ اور چیونٹی کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرنے کی عادت نے کچھ ایسا رنگ بھر دیا ہے جس کی آب وتاب آج تک برقرار ہے۔

علامہ شبلیؒ کو کتاب کی تصنیف سے پہلے ہی اس موضوع سے متعلق پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ہوگیا تھا خصوصاً مصادر کی عدم فراہمی کا، جو کتابیں دستیاب بھی تھیں ان میں علامہ شبلیؒ کے بقول ان کی فتوحات وغیرہ کی تفصیل تو ملتی ہے لیکن ان کے حقیقی کارناموں، اس عہد کے تہذیبی اور ثقافتی حالات اور تمدنی وعمرانی ترقیوں کے متعلق بہت کم معلومات فراہم ہوتی ہیں جس کا ذکر انہوں نے مصادر پر تبصرہ کرتے ہوئے خود ہی کیا ہے ''بہر حال الفاروق کی تصنیف کے لئے جو سرمایہ کام آسکتا تھا وہ یہی قدماء کی تصنیفات تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ وتذکرہ کے فن نے آج جو ترقی کی ہے اس لحاظ سے یہ بے بہا خزانہ چنداں کارآمد نہیں'' (الفاروق، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶، ۱/۹)

الفاروق کے مصادر کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

۱۔ مستقل کتب:

اس ضمن میں وہ کتب آتی ہیں جن کے حوالے جا بجا مذکور ہیں جیسے تاریخ طبری، فتوح البلدان اور خطط الشام وغیرہ۔

۲۔ ضمنی مصادر:

اس سے وہ مصادر مراد لئے جاسکتے ہیں جن کے حوالے نسبتاً کم یا بہت ہی کم آئے ہیں ان میں علامہ سیوطی کی حسن المحاضرۃ، علامہ ابن قیم کی زاد المعاد اور محدث جمال الدین کی روضۃ الاحباب وغیرہ شامل ہیں۔

علامہ شبلیؒ شاید پہلے مؤرخ وسوانح نگار ہیں جنھوں نے مقدمہ میں مصادر کو بیان کرنے کی طرح ڈالی، الفاروق میں بھی انہوں نے بعض کتب اوران کے مؤلفین کا تعارف کرایا ہے اور بعض کتب کے صرف نام بیان کرنے پر اکتفا کی ہے، مصادر بیان کرنے سے قبل انہوں نے عربوں میں تاریخ کی ابتداء، سیرت نبوی اور صحابہ کرامؓ کے تذکروں پر مشتمل متقدمین کی کتب کا ایک چارٹ پیش کرنے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ ان میں سے اکثر تصنیفات ناپید ہیں تاہم بعد کی کتابوں میں ان مفقودہ کتب کا بہت کچھ سرمایہ موجود ہے جو الفاروق کی تالیف کا بنیادی سرمایہ بھی ہے۔(۱/۳۔۹)

الفاروق کے ثانوی مصادر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اگر چہ یہ امر بالکل صحیح ہے کہ جو کتابیں حضرت عمرؓ کے حالات میں مستقل حیثیت سے لکھی گئی ہیں ان میں ہر قسم کے ضروری واقعات نہیں ملتے لیکن اور قسم کی تصنیفوں سے ایک حد تک اس کی تلافی ہوسکتی ہے مثلاً الاحکام السلطانیة لا بن الوردی ومقدمة ابن خلدون وکتاب الخراج سے حضرت عمرؓ کے طریق حکومت وآئین انتظام کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں، اخبار القضاة لمحمدبن خلف الوکیع سے خاص صیغہ قضاء کے متعلق ان کا طریق عمل معلوم ہوتا ہے، کتاب الاوائل لا بی ھلال العسکری ومحاسن الوسائل الی اخبار الاوائل میں ان کی اولیات کی تفصیل ہے، عقد الفرید وکتاب البیان والتبیین للجاحظ میں ان کے خطبے منقول ہیں، کتاب العمدة لابن رشیق

القیروانی سے ان کا شاعرانہ مذاق معلوم ہوتا ہے، میدانی نے کتاب الامثال میں ان کے حکیمانہ مقولے نقل کیے ہیں، ابن جوزی نے سیرۃ العمرین میں ان کے اخلاق اور عادات کو تفصیل سے لکھا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں ان کے فقہ واجتہاد پر اس مجتہدانہ طریقے سے بحث کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں، یہ تمام تصنیفات میرے پیش نظر ہیں اور میں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے، ریاض النظرۃ للمحب الطبری میں بھی حضرت عمرؓ کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اسی کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے لیکن اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں مذکور ہیں اس لئے میں نے دانستہ اس سے احتراز کیا۔'' (۱/۱۳۔۱۴)

مصادر کا ذکر کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہؒ کے طریقہ کار کی وضاحت کردی جائے کہ انہوں نے ان مصادر سے کیونکر استفادہ کیا ہے، ان میں سے بعض طرق کا ذکر انہوں نے خود ہی کیا ہے جبکہ بعض کا پتہ بین السطور سے چلتا ہے:

- ''کتابوں کا حوالہ زیادہ تر انہیں واقعات میں دیا گیا ہے جو کسی حیثیت سے قابل تحقیق تھے اور کوئی خصوصیت خاص رکھتے تھے''۔ (۱/۱۹)
- ''بعض واقعات مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں اور مختلف عنوانوں کے تحت میں آسکتے ہیں اس لئے اس قسم کے واقعات کتاب میں مکرر آگئے ہیں اور ایسا ہونا ضرور تھا لیکن یہ التزام رکھا گیا ہے کہ جس خاص عنوان کے نیچے وہ واقعہ لکھا ہے وہاں اس عنوان کی حیثیت زیادہ دکھلائی گئی ہے''۔ (۱/۱۹)
- ''جو کتابیں روایت کی حیثیت سے کم رتبہ ہیں مثلاً ازالۃ الخفاء وریاض النضرۃ وغیرہ، انکا جہاں حوالہ دیا ہے اس بنا پر دیا ہے کہ خاص اس روایت کی تصدیق اور معتبر کتابوں سے کرالی گئی تھی''۔ (۱/۱۹)
- ''حضرت عمرؓ کے زہد وتقشف، سخت مزاجی اور سخت گیری کی نسبت سینکڑوں روایتیں مذکور ہیں اور بے شبہہ اور صحابہ کی نسبت یہ اوصاف ان میں زیادہ تھے لیکن اس کے متعلق ان تمام روایتوں کو صحیح نہیں خیال کرنا چاہئے جو حلیۃ الأولیاء، ابن عساکر،

کنز العمال، ریاض النضرۃ وغیرہ میں مذکور ہیں، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ چونکہ اس قسم کی روایتیں عموماً گرمی محفل کا سبب ہوتی تھیں اور عوام ان کو نہایت ذوق سے سنتے تھے اس لئے ان میں خود بخود مبالغہ کا رنگ آتا گیا ہے، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ جو کتابیں زیادہ مستند اور معتبر ہیں ان میں یہ روایتیں بہت کم پائی جاتی ہیں، اسی لئے میں نے اس قسم کی جو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں ان میں بڑی احتیاط کی ہے اور ریاض النضرۃ وابن عساکر اور حلیۃ الاولیاء وغیرہ کی روایتوں کو بالکل نظر انداز کیا ہے" (۱/۱۷) حالانکہ بعض جگہوں پر خصوصاً کنز العمال کے حوالے -- کسی دیگر مستند کتاب کے حوالے سے — ملتے ہیں۔ (۲/۱۴، ۱۵، ۲۷ وغیرہ)

- کسی کتاب کے حوالہ سے دیگر مصادر کا ذکر جیسے فتح الباری کے حوالے سے متعدد کتب کا حوالہ دیتے ہیں۔ (۱/۳۸، ۵۴، ۶۰ وغیرہ)
- بعض کتب کا ذکر متن میں تو ملتا لیکن اس کا حوالہ (یعنی جلد وصفحہ نمبر) مذکور نہیں ہوتا ہے۔ (۱/۶۵، ۶۹، ۲/۲۶۲ وغیرہ)
- بسا اوقات متن میں کتاب کا ذکر کئے بغیر حاشیہ میں حوالہ مذکور ہوتا ہے۔
- متعدد مقامات پر حاشیہ پر کتاب کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں۔
- بسا اوقات عربی عبارت متن میں ہی نقل کرتے ہیں، کبھی ترجمہ بھی کرتے ہیں اور کبھی ترجمہ کے بغیر ہی نقل کرتے ہیں۔
- بسا اوقات کسی کتاب/کتب کا ذکر کئے بغیر عمومی طرز بیان اختیار کرتے ہیں جیسے "عام مؤرخین کا بیان ہے" (۱/۳۵، ۱۵۰) "عام روایت ہے" (۱/۵۷) "ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ کتب حدیث وسیر سے بظاہر اسی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے"۔ (۱/۵۹) "بصرہ کی وجہ تسمیہ عموماً اہل لغت یہ لکھتے ہیں" (۲/۷۸) "عرب کے جغرافیہ نویس اس کو عراق کے اضلاع میں شامل کرتے ہیں" (۲/۹۶) "ایک عیسائی مشہور مؤرخ لکھتا ہے" (۲/۱۷۳) "تکبیر جنازہ...... مجوس اور قسم کے بہت سے مسائل ہیں جن کی نسبت

کتب حدیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے"(۲/۲۰۰)

- بسا اوقات حوالہ کے بغیر ہی واقعہ بیان کرتے ہیں جیسے جنگ حضرت عمرؓ کے جدا مجد نفیل اور قادسیہ کے موقع پر ابن ہذیل کی تقریر کا کچھ حصہ بغیر حوالہ کے نقل کیا ہے۔اسی طرح خنساء کا اپنے بیٹوں سے خطاب بھی نقل کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا ہے۔ (۱/۲۱،۶۹،۹۵،۱۰۰وغیرہ)
- بعض حوالے ربط بیان کے لئے بھی ہیں جیسے حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے جو تمہید باندھی ہے اس میں ابن الاثیر کا حوالہ ہے۔(۱/۶۹،۷۰،۷۳،۷۴وغیرہ)
- بعض حوالے وہ بھی مذکورہ ہیں جن میں حضرت عمرؓ کے علاوہ کسی اور شخصیت یا واقعہ کا ذکر ہے۔جیسے حضرت خنساء کا ذکر کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ان کے مفصل حالات اصفہانی نے بیان کئے ہیں۔(۱/۹۹)
- عربی زبان کے علاوہ فرنچ اور فارسی کتب کا بھی حوالہ دیتے ہیں جیسے پروفیسر برخیم (Berchem) کی اس فرنچ کتاب کا حوالہ دیا ہے جو اس نے مسلمانوں کی مالگذاری کے نظام پر لکھی تھی (۲/۴۳،۴۶) اسی طرح سیرت ابن اسحاق کے فارسی ترجمہ کے مخطوطہ (۱/۵۲) اور شاہ ولی اللہ کی کتاب ازالۃ الخفاء سے بھی استفادہ کیا ہے۔
- جدید مطبوعات سے استفادہ جیسے پروفیسر برخیم کی فرنچ کتاب کے علاوہ پروفیسر رینکی کو عہد حاضر کا مشہور مؤرخ قرار دیتے ہوئے اس کی تعریف کسی گمنام پروفیسر کی زبانی بیان کی ہے، اسی طرح حمص کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے اسے انگریزی میں "امینا" کہتے ہیں۔(۱/۱۸،۱۲۳)
- بسا اوقات مصادر کی قدر و قیمت بیان کرتے ہیں اور ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں جیسے سیرت ابن اسحاق کے اس فارسی ترجمہ کے مخطوطہ کا ذکر حاشیہ میں کیا ہے جو ۶۱۲ھ میں سعد بن زنگی کے حکم سے کیا گیا تھا۔(۱/۵۲و ۶۔۸)
- بالعموم ہر ملک/شہر کی فتح بیان کرنے سے پہلے اس کا محل وقوع وغیرہ بیان کرتے ہیں لیکن حوالے درج نہیں کرتے ہیں ممکن ہے کہ انہوں نے یہ ساری معلومات فتوح البلدان

سے لی ہوں۔ اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے جغرافیہ کی بعض انگریزی کتب بھی پیش نظر رہی ہو کہ حمص کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے اسے انگریزی میں ''امیسا'' کہتے ہیں۔ (۱/۱۲۳)

- مصادر کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی نشاندہی کرتے ہیں جیسے عراق کی فتح کے لئے بقول بلاذری ایک ہزار آدمیوں کا انتخاب مضافات سے کیا گیا تھا جبکہ دینوری نے ان کی تعداد پانچ ہزار لکھی ہے (۱/۴۷)، اسی طرح دینوری نے یزدگرد کا ۱۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہونا لکھا ہے جبکہ طبری نے اس کی عمر ۲۵ سال بیان کی ہے۔ (۱/۸۳)
- بسا اوقات مصادر میں مذکور اختلاف کے درمیان تطبیق کرتے ہیں جیسے بلاذری نے ایک لشکر کا جائے قیام ثعلبہ لکھا ہے جبکہ طبری نے زرود لکھا ہے، علامہؒ نے تطبیق کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ دونوں مقام آپس میں نہایت متصل اور قریب ہیں (۱/۸۵)، اسی طرح فتح مصر کے ضمن میں پائے جانے والے اختلاف کے درمیان تطبیق کرتے ہوئے لکھا ہے ''عمرو بن العاص کے ضمن میں ایسی حیلہ بازی کے اتہام کی کیا ضرورت ہے اولاً تو بلاذری وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ خط ان کو عریش ہی میں ملا، لیکن رفح میں ملاتب بھی کچھ حرج نہیں کیونکہ رفح خود مصر میں داخل ہے'' یہ تطبیق انہوں نے مقریزی کی روایت پر نقد کرتے ہوئے کی ہے (۱/۱۸۹)۔ اس کے علاوہ تنخواہوں کی تفصیل کے متعلق مختلف روایات کے پائے جانے اور ان میں حتی الامکان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۲/۸۹)
- مختلف مصادر کی موجودگی میں کسی ایک کتاب کی روایت کو ترجیحی طور پر ذکر کرتے ہیں جیسے واقعہ یرموک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ہے ''میں نے یہ تفصیلی واقعات فتوح الشام ازدی سے لئے ہیں لیکن ابو عبیدہ کا حمص چھوڑ کر دمشق چلا جانا ابن واضح عباسی اور دوسرے مؤرخوں نے بھی بیان کیا ہے (۱/۱۲۸)، اسی طرح شیرویہ کے بعد سلسلہ حکومت کی ترتیب کے اختلاف کو واضح کرتے ہوئے فردوسی کے بیان کو سب سے الگ قرار کیا ہے اور ابو حنیفہ دینوری کے بیان کو ترجیح دینے کی

وضاحت کی ہے۔ (۷۳/۱)

- مصادر کی غلطیوں کی نشاندہی جیسے حضرت خالدؓ کی معزولی کے سلسلہ میں ابن الاثیر کی غلطی کا ذکر (۱۵۰/۱)
- مصادر کی بعض روایات کو درایت کے اصولوں پر پرکھتے ہوئے ان کی تائید یا تردید کرتے ہوئے اختلافی مسائل میں روایات کو درایت کے اصولوں پر پرکھنے کی ضرورت کو بیان کیا ہے جیسے حضرت عمرؓ کے زہد وتقشف اور سخت مزاجی کے متعلق روایات کو درایت کے اصولوں پر پرکھنے کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ (۱۴/۱۔۱۷)
- بعض واقعات کی تفصیل متعدد مصادر سے نقل کرتے ہیں۔
- بعض مصادر ایسے ہیں جن کے قلمی نسخے انہوں نے قسطنطنیہ میں دیکھے تھے اور وہیں سے ضروری اقتباس نوٹ کر کے لائے تھے، ایسے مصادر میں ابن الجوزی کی سیرۃ العمرین، محمد بن خلف کی اخبار القضاۃ اور ابو ہلال عسکری کی محاسن الوسائل شامل ہیں۔ (۱۴/۱ حاشیہ)
- مصادر میں بعض ایسے مخطوطات بھی شامل ہیں جو ان کے ذاتی کتب خانہ میں تھے جیسے ابوالہلال عسکری کی کتاب الاوائل اور ابن رشیق کی کتاب العمدۃ۔ (۱۴/۱ حاشیہ)
- علامہ شبلی عصر حاضر کے ان اولین مصنفین میں سے تھے جو اپنے مصادر کا حوالہ مکمل طور پر نقل کرتے ہیں یعنی صفحہ، جلد کے ساتھ اس کا مطبع اور سن طباعت بھی ذکر کرتے ہیں تاہم ہر جگہ انہوں نے اس کی پابندی نہیں کی ہے۔
- مصادر کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الفاروق میں تاریخ الطبری، فتوح البلدان، کتاب الخراج، کنز العمال (بالعموم دیگر کتب کے حوالہ سے)، صحیحین، اسد الغابۃ، خطط الشام، موطاء امام محمد، سیرۃ العمرین، فتح الباری، مقدمۃ ابن خلدون، ازالۃ الخفاء وغیرہ کو بنیادی مصادر کی حیثیت حاصل ہے۔
- بسا اوقات صرف مصنف کا ذکر کتاب کا نام لئے بغیر کرتے ہیں (۵/۱، ۴۴/۲، ۵۵، ۱۲۰ وغیرہ) علامہ نے مقدمہ میں بعض مصادر کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کے حوالے کہیں

دائرہ کی عبارت موجود ہے کی نہیں دیئے جیسے ابوہلال عسکری کی کتاب محاسن الوسائل کا حوالہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔

- مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے متأخرین مؤرخین جیسے ابن الأثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفداء، نوری، سیوطی وغیرہ کی کتب کا بھی مطالعہ کیا تھا کیونکہ جس جامع انداز میں انہوں نے ان مشہور مؤرخین کی کتب پر تبصرہ کیا ہے وہ بغیر تفصیلی مطالعہ کے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مذکورہ مؤرخین میں ابن الأثیر، ذہبی، ابوالفداء اور سیوطی کے حوالے کتاب میں موجود ہیں باقیماندہ کتب میں ممکن ہے کوئی ایسی قابل ذکر بات نہ مل سکی ہو لہذا انہوں نے ان کتب کے حوالے درج نہیں کئے۔ (۸/۱) اسی طرح اصول درایت پر بحث کرتے ہوئے ابن حزم، ابن قیم حطابی، ابن عبدالبر کا ذکر کیا ہے ممکن ہے کہ ان کی کتب بھی ان کے پیش نظر رہی ہوں (۱۲/۱)

مذکورہ بالا سطور سے علامہ کے طریقۂ کار کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مصادر سے کس طرح استفادہ کیا ہے اور کتاب کی ترتیب میں کن امور کا لحاظ رکھا ہے، مندرجہ ذیل سطور میں ان مصادر کے مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ اس بات کی استیعاب کی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ان مصادر سے کس حد تک اور کہاں کہاں استفادہ کیا ہے تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ بعض حوالے چھوٹ گئے ہوں۔ مصادر کو مصنفین کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

۱۔ **ابن الاثیر جرزی:** ابن الاثیر جرزی کا شمار آٹھویں صدی کے اہم اور مستند علماء میں ہوتا ہے، انہوں نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں، ان کی دو کتابوں سے علامہ شبلیؒ نے الفاروق میں استفادہ کیا ہے:

- **اسد الغابة:** صحابہ کرام کے تراجم پر مشتمل اس کتاب کا شمار اسماء الرجال کی بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے، اس کا پہلا حوالہ حضرت زید کے ضمن میں دیا ہے کہ ان کے مفصل حالات مذکورہ کتاب میں ملیں گے۔ (۲۲/۱)

  ۔حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا حوالہ۔ (۳۰/۱)

-حضرت قرظ خزرجیؓ کا حضرت عمارؓ کے اسٹاف میں شامل ہونے کا حوالہ اس وقت دیا ہے جب مؤخر الذکر کو انہوں نے کوفہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ (۲/۲۳)

-مغیرہ بن شعبہ کو اعلیٰ منصب سے نوازنا۔ (۲/۲۴)

-عبداللہ بن ارقم کو میر منشی مقرر کرنا (۲/۲۵)

-حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ وہ عاملین کو فرامین جاری کرتے تھے اس معمول کا ذکر طبری کے حوالہ سے کرنے کے بعد لکھا ہے کہ **اسد الغابة** (تذکرہ حذیفہ بن الیمان) سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (۲/۲۷)

-محمد بن مسلمہ کو افسر تحقیقات مقرر کرنا۔ (۲/۳۱)

-حضرت عمرؓ کا حضرت ام کلثوم بنت فاطمہ سے شادی کرنا۔ (۲/۲۸۲)

-اس کتاب کے حوالے ذیل صفحات پر بھی مذکور ہیں:

۲/۵۹، ۶۷، ۱۲۴ (۲)، ۲۵، ۶۴، ۶۶، ۶۷، ۷۷، ۸۹، ۹۷ (۲)

- **الکامل:** اسلامی تاریخ نگاری کا ایک شاہکار جس میں مصنف نے اپنے عہد تک کے حالات رقم کئے ہیں اس کا تعارف علامہؒ نے ان الفاظ میں کرایا ہے "تاریخ ابن الأثیر کو علامہ ابن خلکان نے من خیار التواریخ کہا ہے اور در حقیقت اس کی قبولیت عام نے قدیم تصنیفیں ناپید کر دیں، لیکن جہاں تک زمانے کا اشتراک ہے ایک بات بھی اس میں طبری سے زائد نہیں مل سکتی، اسی طرح ابن الأثیر کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے انہوں نے اپنی تصنیف کا مدار صرف ابن الأثیر پر رکھا" (۱/۸) اس کتاب کے حسب ذیل حوالے ملتے ہیں:

-اصول درایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن الاثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ قبیلہ تغلب کے عیسائی اپنے بچوں کو اصطباغ نہ دینے پائیں لیکن یہی روایت تاریخ میں ان الفاظ سے مذکور ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں ان کے بچوں کو زبردستی اصطباغ نہ دیا جائے۔ (۱/۱۵)

مسئلہ اصطباغ کا دوبارہ ذکر کرتے ہوئے ابن الاثیر کی کوتاہیوں کو بیان کیا ہے

کہ اس کی وجہ سے متعدد غلط فہمیاں پیدا ہوئیں (۲/۱۵)
- حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا واقعہ۔ (۱/۳۰)
- فتوحات عمر کی تفصیل بیان کرنے سے عرب کے فارس وشام کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے عرب کے کچھ قبیلوں نے زیادہ طاقت وقوت حاصل کر کے بادشاہ کہلانے لگے لیکن بقول ابن الاثیران کی حقیقت یہ ہے کہ وہ رومی سلطنت کے صوبہ دار تھے (۱/۶۹)
- ۱۴ھ میں ہونے والی جنگ حمص میں جب ہرقل نے رومیوں کی مدد کے لئے فوج روانہ کی تھی تو اس کا راستہ سعد بن ابی وقاصؓ کی افواج نے روک دیا تھا جس کے نتیجہ میں حمص والوں نے مایوس ہو کر صلح کر لی تھی، یہ واقعہ انہوں نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ (۱/۱۲۴)
- حضرت خالد کی معزولی کے ضمن میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن الأ ثیر کے متضاد بیانات ہیں وہ ان پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں"............افسوس ہے کہ ابن الأ ثیر کو خود اپنی اختلاف بیانی کا بھی خیال نہیں، خود ہی ۱۳ھ کے واقعات میں خالد کا معزول ہونا لکھا ہے اور خود ہی ۱۷ھ کے واقعات میں ان کی معزولی کا الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک سے واقعات نقل کر دیئے ہیں" (۱/۱۵۰) علامہ نے یہاں کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے بلکہ متن میں ہی مذکورہ بالا عبارت لکھ کر گزر گئے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مؤرخین کے اقوال کو من وعن قبول نہیں کیا ہے بلکہ درایت سے کام لیتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔
- حضرت شہ بانو کے قصہ کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن الاثیر اور دیگر مؤرخین نے اس واقعہ کو نہیں بیان کیا ہے (۲/۱۵۸)
- حضرت عمرؓ کی حضرت ام کلثوم بنت فاطمہ سے شادی کا ذکر کرتے ہوئے چوتھا حوالہ دیا ہے۔ (۲/۲۸۲)

۲۔ابن اسحاق: ابن اسحاق کا شمار فن سیرت نگاری کے بانیان میں ہوتا ہے۔ اس فن کی ترویج و اشاعت میں انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے، محترم جناب طرابیشی صاحب نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''**رواۃ محمد بن اسحاق بن یسار فی المغازی**'' میں ان کے ذریعہ مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا ہے، اس کتاب کی روشنی میں راقم سطور نے ایک مقالہ لکھا ہے جو عنقریب ہی ''تحقیقات اسلامی'' علیگڑھ کے کسی شمارے میں شائع ہوگا۔

علامہ شبلیؒ نے سیرت ابن اسحاق کا نسخہ نہیں دیکھا تھا تاہم انہوں نے ایک قدیم فارسی ترجمہ کا مطالعہ ضرور کیا تھا جو ۶۱۲ھ میں سعد بن زنگی کے حکم سے کیا گیا تھا، اس ترجمہ کا ایک قدیم نسخہ الہ آباد کے کتب خانہ عام میں موجود تھا اس کا پہلا حوالہ غزوہ حنین میں حضرت عمرؓ کا آنحضور ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہنے کے ضمن میں دیا ہے (۱/۵۲) جبکہ دوسرا حوالہ فتح اجنادین کے ضمن میں دیا ہے کہ ''یہ واقعہ حسب روایت ابن اسحاق ۲۸ رجمادی الاولی ۱۳ھ/ ۶۳۴ء میں واقع ہوا'' (۱/۱۱۴) تاہم اس کا حوالہ نہیں دیا ہے صرف متن میں ذکر کر کے گذر گئے ہیں، اسی طرح یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ حوالہ انہوں نے کتاب مذکور کے فارسی ترجمہ کا ہی دیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ کس نسخہ کا حوالہ ہے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سیرت ابن اسحاق کا دائرہ صرف سیرت نبوی پر ہی محیط نہیں تھا کم ازکم خلافت عمرؓ کے واقعات اس میں مذکور تھے۔

۳۔ابن الانباری: ان کی کس کتاب سے استفادہ کیا ہے اس کی تعین مشکل ہے کیونکہ انہوں نے کتاب کا نام کئے بغیر قرآن کے سلسلہ میں خدمات فاروقی کا ذکر کرتے لکھا ہے کہ ''ان کے (حضرت عمرؓ) کے خاص الفاظ حسب روایت ابن الانباری یہ ہیں <u>**تعلموا اعراب القرآن کما تعلمون حفظه**''</u>

۴۔ابن بطوطہ: ابن بطوطہ مشہور مسلمان سیاح ہے جس نے اپنی ساری زندگی سیاحت میں گزار دی اور حاصل سفر کو اپنے سفر نامہ ''**تحفة النظار فی غرائب الامصار**

وعجائب الاسفار" میں پیش کیا ہے حضرت عمر نے کوفہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے(۸۱/۲)

۵۔ابن تیمیہ: ابن تیمیہ کا شمار مشاہیر علماء اسلام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر کتب لکھی ہیں اور گمراہ فرقوں کی تردید کرتے ہوئے اپنی زندگی گذاری۔ ان کی کتاب "منتقی الاخبار" کا حوالہ انہوں نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کرتے ہوئے دیا ہے جس میں انہوں نے حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ اہل عرب غلام نہیں ہو سکتے۔ (۱۵۵/۲)

۶۔ابن الجوزی: ابن الجوزی کا شمار اکابر علماء وفضلاء میں ہوتا ہے انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتب تصنیف کی تھیں جن میں سے ایک کتاب حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی سوانح حیات پر مشتمل ہے، اس کتاب کا نام انہوں نے "سیرۃ العمرین" تجویز کیا تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے بقول علامہ شبلیؒ "ان کے اخلاق اور عادات کو تفصیل سے لکھا ہے"۔ (۱۴/۱)

حضرت عمرؓ پر لکھی جانے والی مستقل کتب میں یہ کتاب اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے کافی اہمیت اور بنیادی حیثیت کی حامل ہے اس کتاب سے علامہ شبلیؒ نے الفاروق کے حصہ دوم میں حسب ذیل مقامات پر استفادہ کیا ہے:

- حضرت عمرؓ کا معلم وقاری حضرات کی تنخواہیں مقرر کرنا جن کا شمار حضرت عمرؓ کی اولیات میں ہوتا ہے۔ (۱۱۸/۲)
- علماء کے متعلق قول فاروقی "لا تکونوا عیالا علی المسلمین" اسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ (۱۸۴/۲)
- ان کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا، ایک بدو نے ان سے دست سوال دراز کیا، ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمات اس کتاب کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔ (۱۸۸/۲)
- اپنی غیر موجودگی کے وقت حضرت زید بن ثابتؓ کو اپنا جانشین مقرر کرنا اور واپسی

پر کچھ نہ کچھ جاگیر کے طور پر ان کو عطا کرنے کے ضمن میں اس کتاب کا آخری حوالہ درج کیا ہے۔ (۲/۲۶۶)

اس کتاب کے مزید حوالوں کے لئے دیکھئے: ۲/ ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۸۳، ۲، ۲۷

۷۔ابن حبان: ابن حبان متاخرین محدثین میں ایک اہم مقام ومرتبہ پر فائز ہیں۔ ان کی کتاب "کتاب الثقات" کا شمار اسماء الرجال کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے ہمان خانوں کی تعمیر (۲/ ۷۵) اور حضرت ام کلثوم بنت فاطمہؓ سے حضرت عمرؓ کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا حوالہ دیا ہے۔ (۲/۲۸۲)

۸۔ابن حجر عسقلانی: ابن حجر عسقلانی کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے ان ممتاز علماء وفضلاء میں ہوتا ہے جن کا تقریباً ہر ذی علم شخص پر احسان ہے اور وہ ان کا کسی نہ کسی طور پر خوشہ چیں ہے خصوصاً فتح الباری کے حوالہ سے، بقول علامہ ابن خلدون انہوں نے یہ کتاب لکھ کر امت کی جانب سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے بھی فتح الباری (مطبوعہ مصر) سے استفادہ کیا ہے اور اس کے حوالے سے دیگر مصادر میں مذکور معلومات بیان کی ہیں، علامہ شبلیؒ نے "فتح الباری" سے حسب ذیل مقامات پر استفادہ کیا ہے:

- سیرت نبوی کی اولین تصنیف نعالی موسی بن عقبہ کو قرار دیتے ہوئے فتح الباری کے مقدمہ کا حوالہ دیا ہے (۱/۴) حضرت عمر کی مواخاۃ کا ذکر کرتے ہوئے حاشیہ میں ابن حجر کے دو متضاد قول کا ذکر کیا ہے کہ مقدمہ فتح الباری میں انہوں نے اوس بن خولیؓ سے ان کی مواخاۃ کا ذکر کیا ہے کہ جب کہ اصابہ میں عتبان بن مالک کو ان کا اسلامی بھائی قرار دیا ہے اور اوس بن خولی کے حالات میں اخوت عمر کا ذکر بھی نہیں کیا ہے (۲/۳۲)
- غزوۂ احد میں ثابت قدم رہنے والے صحابہ کرامؓ کی تعداد کے متعلق مختلف روایات کا ذکر کرنے کے بعد فتح الباری میں مذکور تطبیق کا ذکر۔ (۱/۴۱)
- صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے اثرات کے ضمن میں اس کتاب کا

دوسرا حوالہ مذکور ہے۔(۱/۴۸)

- آنحضور ﷺ کی بیماری کی مدت کے سلسلہ میں سلیمان تیمی کی روایت کا ذکر (۱/۵۴)

- واقعہ قرطاس کا ذکر کرتے ہوئے اس کا حوالہ دیا ہے (۱/۵۶)

- سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش آنے والے واقعہ کو مسند ابو یعلی (۱/۶۰) اور حضرت امام مالک کی اس روایت سے بیان کیا ہے جو فتح الباری میں مذکور ہے۔(۱/۶۳)

- فتح الباری کے حوالہ سے عمر بن شبہ کی "کتاب المدینة" اور "خلاصة الوفاء فی اخبار دار المصطفی" میں مذکور روایات بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ کا قرض کیونکر ادا کیا گیا تھا۔(۱/۲۰۱-۲۰۲)

- حضرت عمرؓ کا اپنی مجالس میں مراتب کا لحاظ رکھنا۔(۲/۲۶۵)

علامہ ابن حجر کی دوسری کتاب "الاصابة" کا شمار اسماء الرجال کی بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کے حوالہ سے علامہ شبلیؒ نے حضرت خالدؓ کی معزولی کا ایک سبب بیان کیا ہے لیکن کتاب کا حوالہ دینے کی بجائے متن میں لکھا ہے "حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابة میں حضرت خالدؓ کے حال میں بتفصیل لکھا ہے"۔(۱/۱۵۱) اس کتاب کے حوالے حسب ذیل صفحات پر بھی موجود ہیں: ۱/۳۲، ۲/۱۱۸، ۱۲۵، ۱۳۲

۹۔ابن حوقل: ابن حوقل کی کتاب "المسالک والممالک" کا حوالہ مصر کے کل خراج کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے لیکن ابن حوقل کے بجائے ابوحوقل کا نام درج ہو گیا ہے (۲/۴۵) جبکہ دوسرے حوالہ کا تعلق براہ راست حضرت عمرؓ کی سوانح سے نہیں ہے بلکہ اس کتاب کا حوالہ انہوں نے اس ضمن میں دیا ہے کہ عہد فاطمی میں خلیفہ المعز لدین اللہ کے گورنر نے مصر کے لگان کی شرح دوگنی کردی تھی تاہم ۳۲ لاکھ دینار سے زیادہ وصول نہ ہو سکا تھا جب کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، جب حضرت عمرو بن عاصؓ وہاں کے گورنر تھے، وہاں کی آمدنی ۹۰ لاکھ دینار تھی، اس روایت کو نقل کرکے

انہوں نے یہ ثابت کیا ہے حضرت عمرؓ کا زمانہ کس قدر خوش حال تھا۔ (۴۶/۲)

۱۰۔ابن خلدون: ابن خلدون کا شمار چوٹی کے متأخرین علماء میں ہوتا ہے، علامہ شبلیؒ ان کے بہت زیادہ معترف تھے وہ فرماتے ہیں: ''ابن خلدون نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی اور اس کے اصول و آئین منضبط کئے لیکن اس کو اس قدر فرصت نہ ملی کہ وہ اپنی تاریخ میں ان اصولوں سے کام لے سکتا، اس کے بعد مسلمانوں میں علمی تنزلی کا ایسا سلسلہ قائم رہا کہ کسی نے پھر اس طرف خیال بھی نہ کیا''۔ (۱۰/۱) دوسری جگہ فرماتے ہیں ''......لیکن اس عام نکتہ چینی میں ابن خلدون کا نام شامل نہیں ہے، اس نے فلسفہ تاریخ کا فن ایجاد کیا اور اس پر نہ صرف متأخرین بلکہ مسلمانوں کی کل قوم ناز کرسکتی ہے''۔(۱/۹،۱۲)

علامہ شبلیؒ نے تاریخ ابن خلدون کے بجائے مقدمہ ابن خلدون سے استفادہ کیا ہے جس سے ''حضرت عمرؓ کے طریق حکومت و آئین انتظام کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں'' (۱۳/۱) اس کتاب کا پہلا حوالہ جنگ یرموک کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ''تعبیہ'' (طریقہ جنگ) کے طرز پر سب سے پہلے حضرت خالدؓ نے صف آرائی کی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ابن خلدون کی اس رائے کی تردید کی ہے جس میں انہوں نے اس کی ابتداء کا سہرا مروان بن حکم کے سر باندھا ہے۔ (۱۰۵/۲) حضرت عمرؓ نے امیر المؤمنین کا لقب کیوں اختیار کیا ہے، اس کا سبب بھی مذکورہ کتاب سے بیان کیا ہے۔(۱۶۸/۲)

۱۱۔ابن خلکان: فن ترجمہ نگاری میں ابن خلکان کو وہی حیثیت حاصل ہے جو تاریخ میں علامہ طبری کو حاصل ہے، انہوں نے اس فن کو اپنی کتاب ''وفیات الاعیان'' کے ذریعہ ایک اعلی مقام پر پہنچا دیا تھا۔ یہ کتاب فن ترجمہ نگاری کی اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے جس کے اسلوب کی پیروی متأخرین علماء کرتے رہے ہیں۔ علامہ شبلیؒ نے اس کتاب سے استفادہ کوفہ کے عہدہ داران کی فہرست تیار کرتے ہوئے کیا تھا۔ (۲۳/۲) دوسرا حوالہ حضرت شہ بانو کا قصہ بیان کرتے ہوئے دیا ہے کہ زمخشری کے حوالے سے

ابن خلکان نے یہ واقعہ غلاموں کے متعلق حضرت عمرؓ کے طرز عمل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دی ہے کہ ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے ان کا شمار بھی اہل کمال میں ہونے لگا تھا۔ امام زین العابدین کے حالات میں نقل کر دیا جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں (۲/۱۵۸) تیسرا حوالہ (۲/۱۶۱) آخری حوالہ حضرت عمرؓ کی اولاد ذکور کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن کے ضمن میں دیا ہے۔ (۲/۲۸۳)

۱۲۔ابن رشیق قیروانی: ''کتاب العمدة'' کا شمار عربی تنقید کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے، اس کتاب کے قلمی نسخہ سے علامہ شبلیؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کے شاعرانہ ذوق و دلچسپی کے ضمن میں استفادہ کیا ہے۔ (۲/ ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۰)

۱۳۔ابن سعد: ابن سعد کا شمار معتبر متقدمین علماء میں ہوتا ہے،ان کی کتاب ''طبقات ابن سعد'' صحابہ کرامؓ وتابعین عظامؒ کے حالات زندگی جاننے اور ان کی درجہ بندی کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کتاب سے علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کے بچپن وجوانی کے حالات نقل کئے ہیں کہ جب وہ دوران خلافت ''ضجنان'' نامی میدان سے گذرے جہاں وہ بچپن میں اونٹ چرایا کرتے تھے تو آبدیدہ ہوکر دونوں زمانہ کا موازنہ کیا تھا۔ (۱/۲۴)

-حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ کے ضمن میں بھی اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ (۱/۳۰)

-اس کتاب کے متعدد حوالے ملتے ہیں خصوصاً ''کنز العمال'' میں مذکور روایت کی تصدیق وتائید زیادہ تر اسی کتاب سے کی گئی ہے مثلاً ۱/ ۶۔۷،۱۶، ۴۱، ۶۸ (۲) ۲/ ۱۱۰،۱۹۲، ۲۷۰ وغیرہ۔

۱۴۔ابن أبی شیبہ: ابن ابی شیبة متاخرین محدثین میں ایک ممتاز درجہ پر فائز ہیں۔ ان کی کتاب ''المصنف'' کا شمار حدیث کے اہم مجموعوں میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے کئی مقامات پر اس کتاب سے استفادہ کیا ہے دور اس کے حوالے سے کنز العمال کی روایات کی تائید میں پیش کئے ہیں۔ (۱/ ۶۵، ۲/ ۱۵، ۱۶۰، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۵۹)

۱۵۔ابن عبدالبر: ابن عبدالبر کا شمار اندلس کے ممتاز ترین علماء ومحدثین میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''**الاستیعاب**'' کو اسماء الرجال میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب سے علامہ شبلیؒ نے الفاروق کے حصہ دوم میں کئی جگہ استفادہ کیا ہے جیسے عمرو بن معدی کرب اور طلحہ بن خالدؓ جیسے ناموران حرب وضرب کونعمان بن مقرنؓ کی ماتحتی میں دینے کے ساتھ انہیں یہ ہدایت دی تھی کہ انہیں کسی صیغہ کی افسری مت دینا کیونکہ ہر شخص صرف اپنا فن خوب جانتا ہے، (۲/۲۵) اسی طرح اس کے حوالہ سے انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عمالان کی گرانقدر تنخواہیں مقرر کی تھیں جیسے امیر معاویہؓ کی تنخواہ ایک ہزار دینار تھی، (۲/۳۴) اس کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ عاصی بن ہشام حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا۔ (۱/۳۷) ان کے علاوہ مزید چند مقامات پر علامہ شبلیؒ اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ (۲/۵۸، ۵۹ (۲) ۲۱۰، ۲۱۱)

۱۶۔ابن عبدربہ: اندلس کے اس مایۂ ناز ادیب وشاعر کی ''**العقد الفرید**'' عربی ادب کا ایک خوبصورت شاہکار ہے۔ بقول علامہ شبلیؒ اس میں حضرت عمرؓ کی خطبات منقول ہیں (۱/۱۳) چنانچہ انہوں نے خطبات عمرؓ کے متعلق مذکورہ کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے خطبات کا خاتمہ ہمیشہ ان فقروں پر ہوتا تھا ''**اللھم لا تدعنی فی غمرة ولا تاخذنی علی عرة ولا تجعلنی مع الغافلین**'' (۲/۲۴۵۔۲۴۶) اس کتاب کا پہلا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے جداعلی حضرت عدی قریش کے سفیر تھے (۱/۲۰۔۲۱) دوسرا حوالہ ہرمزان کے قبول اسلام کے واقعہ کونقل کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۱/۱۶۴)

دوسری جلد میں اس کا پہلا حوالہ ''صیغہ عدالت'' کی تفصیل نقل کرتے ہوئے دیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عدالت کے تمام اصولی احکام مرتب کئے تھے، انہیں ابن عبدربہ نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ (۲/۵۵، حاشیہ)

دوسرا حوالہ ''صیغہ فوج'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا کہ حضرت عمرؓ نے

فوج کی صحت وتندرستی قائم رکھنے کے لئے مختلف قاعدے مقرر کیۓ تھے جس میں سے ایک حالت کوچ کے متعلق تھا جسے ابن عبد ربہ نے مذکورہ کتاب (۴۹/۱) میں بعینہ نقل کیا ہے۔(۱۰۴/۲) تیسرا حوالہ ''سفارت'' کے ضمن میں دیا ہے کہ ''اس (سفارت) کا حال عقد الفرید وغیرہ میں بتفصیل ملتا ہے''۔(۱۸۵/۲)

۱۷۔ابن عساکر: متأخر مؤرخین میں ابن عساکر کو ایک اہم مقام حاصل ہے انہوں نے دمشق واہل دمشق کی تاریخ ''**تاریخ دمشق**'' کے نام سے لکھی ہے، جس نے انہیں شہرت دوام بخش دی ہے۔ یہ کتاب بھی علامہ شبلیؒ کے مصادر میں شامل ہے اور اس کے حوالے تاریخ ولادت، (۲۳/۱) زمانہ جاہلیت کے بعض اسفار کے واقعات (۲۷/۱) اور ایمان لانے کے ضمن میں مذکور ہیں۔(۳۰/۱)

اصول درایت کی تفصیل بیان کرتے ہوۓ دوجگہ اس کتاب کا نام مزید ذکر کیا ہے (۱۶، ۱۷)

۱۸۔ابن قتیبہ: علامہ شبلیؒ ان کا ذکر خیر کرتے ہوۓ لکھتے ہیں ''یہ نامور اور مستند مصنف ہے، محدثین بھی اس کے اعتماد اور اعتبار کے قائل ہیں، تاریخ میں اس کے مشہور کتاب معارف ہے .... یہ کتاب اگر چہ نہایت مختصر ہے لیکن اس میں ایسی مفید معلومات ہیں جو بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتیں''۔(۶/۱)

انہوں نے مذکورہ کتاب کا حوالہ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی حضرت زیدؓ کا ذکر کرتے ہوۓ دیا ہے کہ ان کے تفصیلی حالات اس کتاب میں مذکور ہیں۔(۲۲/۱) دوسرا حوالہ حضرت عمرؓ کے والد کا ممتاز قریشی ہونے کے ضمن میں ہے۔(۲۲/۱) تیسرا حوالہ شہ بانو کے قصہ کی تردید کرتے ہوۓ دیا ہے کہ اس واقعہ کا ذکر ابن قتیبہ ودیگر مؤرخین نے نہیں کیا ہے (۱۵۸/۲) حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے حضرت ابوشحمہ کو سزا دینے کا ذکر اسی کتاب کے حوالہ سے کیا ہے لیکن حاشیہ میں یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ ''ابوشحمہ کے قصہ میں واعظوں نے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں لیکن اس قدر صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو شرعی سزا دی اور اسی صدمہ سے انہوں نے انتقال کیا''۔(۱۷۴/۲۔۱۷۵) پانچواں حوالہ حضرت عمرؓ کا حضرت ام کلثوم بنت بن علی بن ابی طالبؓ سے شادی کرنے کے ضمن میں دیا ہے۔

(۲۸۲/۲) چھٹا حوالہ حضرت عمرؓ کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ''ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں حضرت عمرؓ کے پوتوں، پڑپوتوں اور نواسوں کا حال بھی لکھا ہے لیکن ہم اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کرتے ہیں''۔ (۲/۲۸۵)

۱۹۔ابن قیم: آٹھویں صدی ہجری کے اہم ترین وممتاز علماء ومحدثین میں علامہ ابن قیم کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے متعدد کتب بطور یادگار چھوڑیں ہیں جن میں سے سیرت نبوی پر ایک اہم کتاب ''زاد المعاد'' بھی ہے، اس کتاب کے اولین دو حوالے انہوں نے حضرت عمرؓ کی ''امامت اور اجتہاد'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیئے ہیں کہ وہ ذوی القربیٰ میں صرف نبوہاشم ونبوالمطلب کو حصہ دیتے تھے لیکن مصلحت کے اعتبار سے ان کے حصوں میں بھی کمی وبیشی کردی تھی۔ (۲/ ۲۲۸، ۲۲۹) تیسرا حوالہ ''فئ'' کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے نقطۂ نظر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا ہے (۲/۲۳۲) اور آخری حوالہ ''باغ فدک'' کے متعلق حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے ضمن میں دیا ہے۔(۲/۲۳۹۔۲۴۰)

۲۰۔ابن کثیر: ابن کثیر کا شمار متأخرین اہم مفسرین میں ہوتا ہے۔ ان کی تفسیر کا حوالہ علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ وہ دقیق مسائل جیسے خلافت، کلالہ، ربا میں وقتاً فوقتاً غور وخوض کرتے رہتے تھے۔ (۲/۲۱۵)

۲۱۔ابن مسکویہ: شیخ ابوعلی سینا کے معاصر اس مؤرخ کی کتاب ''تجارب الامم'' کے حوالہ سے انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ قدیم سلطنتوں کے حالات وانتظامات سے واقفیت حاصل کرتے تھے اور ان میں جو چیزیں مناسب اور بہتر معلوم ہوتیں ان کو اختیار کرتے تھے۔ (۲/۱۷۵)

اس کتاب کا مخطوطہ علامہ شبلیؒ نے کتب خانہ مسجد ایا صوفیہ قسطنطنیہ میں دیکھا تھا اور اس سے معلومات نقل کی تھیں۔ (۲/۱۷۵، حاشیہ)

۲۲۔ابن منظور: ابن منظور کا شمار اہم ترین ماہرین لغت میں ہوتا ہے، اس فن پر اس کی دسترس کا منھ بولتا ثبوت ان کی طویل کتاب لغت ''لسان العرب'' ہے۔ اس

کتاب کا حوالہ علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کے قائم کردہ محکمہ ''اہراء'' (رسد کا مستقل شعبہ) کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۱/۱۰۰)

۲۳۔ابن الندیم: مصنفین اور ان کی کتابوں کی فہرست سازی کی ابتداء کرنے کا سہرا ابن الندیم کے سر جاتا ہے، انہوں نے اپنی کتاب ''**الفہرست**'' میں پہلی بار علوم وفنون کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ان علوم وفنون کی اہم کتابوں اور مصنفین کا ذکر کیا ہے اور بہت سی نادر کتب کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں ہیں جو آج ناپید ہیں۔ علامہ شبلیؒ نے اس کتاب کا حوالہ قدیم کتب کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۱/۳۔۴)

۲۴۔ابن ہشام: فن سیرت نگاری کے امام ابن ہشام محتاج تعارف نہیں ان کی حسب ذیل کتب کے حوالے الفاروق میں ملتے ہیں۔

۱۔ کتاب التیجان: اس کتاب کا ذکر علامہ شبلیؒ نے عربوں میں تاریخ کی ابتداء کو بیان کرتے ہوئے کیا ہے (۱/۳) اس کے علاوہ ہشام کلبی کا بیان اس کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (۱/۶۸)

۲۔ سیرۃ ابن ھشام: سیرت کی اس مشہور کتاب کا حوالہ علامہ شبلیؒ نے عہد نبوی میں حضرت عمرؓ کے حالات زندگی اور ان کے کردار کو بیان کرتے ہوئے متعدد جگہوں پر دیا ہیں جیسے قبول اسلام (۱/۳۰) ہجرت مدینہ (۱/۳۱) عتبان بن مالکؓ کے ساتھ ان کی مواخاۃ (۱/۳۲) اذان کے سلسلہ میں آنحضور ﷺ کا خیال (۱/۳۳) عاصی بن ہشام کا ان کے ہاتھوں مارا جانا (۱/۳۷) غزوہ احد میں عمرؓ کا ثابت قدم رہنا اور آپ ﷺ کی مدافعت کرنا وغیرہ۔ (۱/۴۲۔۴۳)

اس کتاب کے حوالہ سے علامہ شبلیؒ نے عہد نبوی کے بھی بعض حالات بیان کئے ہیں جن کا تعلق حضرت عمرؓ کی زندگی سے نہیں ہے جیسے غزوہ بدر میں ان کے غلام حضرت مہجع کا سب سے پہلے شہید ہونا (۱/۳۷) غزوہ احد میں حضرت انسؓ کو کتنے زخم لگے تھے اور ان کی تعداد کتنی تھی۔ (۱/۴۱)

۲۵۔ابو اسحاق شیرازی: ابو اسحاق شیرازی کی کتاب ''طبقات الفقھاء'' سے حضرت

عمرؓ کے قضاء کے اصول و آئین پر مشتمل اس فرمان کو نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ گورنر کوفہ کے نام لکھا تھا جس میں صیغۂ عدالت کے تمام اصولی احکام درج تھے۔،(۵۴/۲) دوسرا حوالہ علم فقہ میں خدمات فاروقی کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے(۱۰/۲)

۲۶۔ابو حنیفہ دینوری: علامہ شبلیؒ نے ان کا اور ان کی کتاب ''الاخبار الطوال'' کا ذکر مقدمہ کتاب میں کیا ہے کہ دینوری نے خلفائے راشدین کی فتوحات میں سے عجم کی فتح کو تفصیل سے لکھا ہے (۶/۱) یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے فارسی حکومت کی ترتیب کے سلسلہ میں مؤرخین کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوں بلحاظ قدیم العہد اور فارسی النسل ہونے کے ان کے بیانات کو ترجیح دی ہے۔(۷۳/۱)

اس کتاب سے علامہ شبلیؒ نے فتوحات عمر کا ذکر کرتے ہوئے کئی مقامات پر استفادہ کیا ہے، جیسے اولین حوالے فتوحات عراق کے ضمن میں دیئے ہیں،(۷۳/۱،۷۴) واقعہ بویب کی تفصیل بیان کرنے کے علاوہ (۸۲/۱) تخت نشینی کے وقت یزدگرد کی عمر بھی اس کے حوالہ سے بیان کی ہے جو طبری کی بیان کردہ عمر سے الگ ہے،(۸۳/۱) اسی طرح اس کے حوالہ سے رستم کے قاتلوں کے نام بھی بیان کئے ہیں جبکہ بلاذری کے مطابق اس کے قاتل نامعلوم افراد تھے۔(۱۰۳/۱) جلد دوم میں بھی اس کا حوالہ ایرانی فوج کے لباس و ضروری ساز و سامان کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں اسلامی فوج بالکل تہی دامن تھی۔ (۵/۲) یہاں شاید علامہ شبلیؒ سے حوالہ دینے میں چوک ہوگئی ہے لہذا انہوں نے اس کتاب کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

۲۷۔امام بو داؤد: امام ابو داؤد کا شمار صحاح ستہ کے مصنفین میں ہوتا ہے ان کی کتاب ''کتاب السنن'' کے حوالے سے انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ غزوہ تبوک میں آدھا مال آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کا واقعہ مذکورہ کتاب میں فضائل ابو بکرؓ کے تحت منقول ہے لیکن غزوہ کی تعیین نہیں ہے جب کہ علامہ شبلیؒ اس

واقعہ کو حضرت عمرؓ سے منسوب کرتے ہیں۔ (۵۲/۱)

۲۸۔ ابو الفداء: ان کی کتاب "تقویم البلدان" کا حوالہ صرف اس ضمن میں دیا ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے بحر روم و بحر قلزم کو براہ راست ملا دینے کی اجازت حضرت عمرؓ سے مانگی تو انہوں نے انکار کر دیا تھا اور لکھ بھیجا کہ اگر ایسا ہوا تو یونانی جہاز میں آکر حاجیوں کو اڑا لے جائیں گے۔ بقول علامہ شبلیؒ "اگر عمرو بن العاصؓ کو اجازت ملی ہوتی تو نہر سوئیز کی ایجاد کا فخر درحقیقت عرب کے حصے میں آتا"۔ (۴۷/۲)

۲۹۔ ابو الفرج اصفہانی: عصر عباسی کے نامور ادباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی کتاب "الاغانی" کا شمار عربی ادب کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے بین السطور بہت سے تاریخی واقعات بھی بیان کئے ہیں جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ اولین حوالہ حضرت خنساءؓ کے متعلق حاشیہ میں تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۹۹/۱)

اس کے علاوہ چار حوالے حصہ دوم میں منقول ہیں، اولین حوالہ صیغہ تعلیم کے ضمن میں ہے کہ ابو سفیان نامی شخص اس کام پر مامور تھا کہ قبائل میں جا کر لوگوں کا امتحان لے اور جس کو قرآن کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اس کو سزا دے، (۱۱۸/۲) دوسرا حوالہ ان اشعار کو پڑھنے اور سننے کے ضمن میں ہے جو حضرت حسانؓ نے مشرکین و دیگر شعراء قریش کی ہجو میں کہے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان کو پڑھنے پڑھانے سے روک دیا کہ ان سے پرانی رنجشیں تازہ ہوتی ہیں۔ (۱۹۷/۲) تیسرا و چوتھا حوالہ حضرت زہیرؓ و نابغہ کے متعلق حضرت عمرؓ کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۲۴۹/۲، ۲۵۰)

۳۱۔ ابو نعیم اصفہانی: ان کی کتاب حلیۃ الاولیاء کا ذکر مقدمہ میں اصول درایت کو بیان کرتے ہوئے کیا ہے کہ اسی میں مذکور تمام روایات کو صحیح نہیں سمجھنا چاہئے (۱۷/۱)

۳۱۔ ابو ہلال عسکری: علامہ شبلیؒ نے ان کی دو کتابوں "کتاب الاوائل" اور "محاسن الوسائل إلی اخبار الاوائل" کا ذکر مقدمہ کتاب میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

ان میں حضرت عمرؓ کی اولیات کی تفصیل مذکور ہے (۱/۱۳) لیکن حوالے صرف اول الذکر کتاب کے نقل کئے ہیں۔ اولین حوالہ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی حضرت زیدؓ کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے سلسلہ میں دیا ہے۔ (۱/۲۱۔۲۲) دوسرا حوالہ خراج میں یزدگرد کے زمانہ میں ہونے والی تبدیلیوں اور حضرت عمرؓ کا ان کو سامنے رکھ کر خراج کی مقدار متعین کرنے کے سلسلہ میں دیا ہے۔ (۲/۳۹) تیسرا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ حضرت عمرؓ امتحان لینے کے بعد ہی قاضی کا تقرر کرتے تھے اور قاضی شریح کا واقعہ بیان کیا ہے (۲/۶۰) انہوں نے کتاب کے آخر میں حضرت عمرؓ کی اولیات بیان کرتے ہوئے دیا ہے اور حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ ''ان میں سے اکثر اولیات کتاب الاوائل لابی هلال العسکری اور تاریخ طبری میں یکجا مذکور ہیں، باقی جستہ جستہ موقعوں سے یکجا کی گئی ہیں''۔ (۲/۲۷۷)

اس کتاب کے مزید دو حوالے ملتے ہیں لیکن ان کا تعلق حضرت عمرؓ کے عہد سے نہیں ہے جیسے خلاف انصاف عمل کرنے والے اولین قاضی بلال بن ابی برد تھے جن کا تعلق بنوامیہ کے عہد خلافت سے ہے۔ (۲/۶۲) دوسرا حوالہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ان کے عہد تک مستقل بیت المال موجود نہیں تھا بلکہ جو مال غنیمت آتا تھا وہ اسے اسی وقت لوگوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ (۲/۶۸)

علامہ شبلیؒ نے ''محاسن الوسائل'' کا قلمی نسخہ قسطنطنیہ میں دیکھا تھا جبکہ ''کتاب الاوائل'' کا ذاتی قلمی نسخہ ان کے کتب خانہ میں تھا۔اول الذکر کتاب کا کوئی حوالہ مجھے نہیں مل سکا ہے۔

۳۲۔قاضی ابو یوسفؒ: فقہ حنفی کے سرخیل وامام قاضی ابو یوسفؒ محتاج تعارف نہیں، ان کے عظیم اور گوناگوں احسانات سے ملت کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی ہے۔ ان کی کتاب ''کتاب الخراج'' اپنے موضوع کی منفرد و یکتا تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اس کتاب سے متعدد مقامات پر استفادہ کیا ہے، خصوصاً طریق

حکومت اور آئین انتظام کے سلسلہ میں اسے بنیادی مصدر قرار دیتے ہوئے (۱/۱۳) اس کے حوالے بار بار دیتے ہیں جیسے ۱/۱۵، ۴۱، ۹۹، ۱۲۸، ۱۵۱، ۲/۲، ۸، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۶، (۲) ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۳، (۲) ۳۸، (۲) ۴۰، ۴۹، ۴۱، (۲) ۵۰، ۵۱، ۷۵، ۸۸، ۱۰۱، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۲۳، (۲) ۱۳۹، (۲) ۱۴۰، (۲) ۱۴۱، (۲) ۱۴۹، (۲) ۱۵۱، (۲) ۱۵۲، ۱۵۹، ۱۶۶، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۰، (۲) ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۳۷، (۲) ۲۴۵، ۲۵۷، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۹ اور ۲۷۵ وغیرہ، طوالت کے خوف سے ہم نے صرف صفحہ نمبر پر ہی اکتفا کی ہے۔

۳۳۔ احمد بن حنبلؒ: احمد بن حنبل کا شمار چند اہم ائمہ احادیث میں ہوتا ہے اور ان کی کتاب "**المسند**" کا شمار حدیث کے اہم مجموعوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا حوالہ الفاروق کے حصہ دوم میں ملتا ہے، اولین حوالہ حضرت حفصہؓ کا مال غنیمت میں حصہ مانگنے اور حضرت عمرؓ کے انکار کر دینے کے ضمن میں دیا ہے۔ (۲/۱۷۷) دوسرا حوالہ حضرت عمرؓ کی فقہ سے دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کلالہ کا مسئلہ اتنی بار دریافت کیا کہ آپ ﷺ نے دق ہو کر فرمایا کہ سورہ نساء کی اخیر آیت تیرے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ (۲/۲۱۴)

۳۴۔ احمد بن أبي يعقوب معروف بہ يعقوبي: علامہ شبلیؒ ان کی علمیت اور مؤرخانہ بصیرت کے بہت قائل تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مقدمہ کتاب میں لکھا ہے "مجھ کو اس کے حالات رجال کی کتابوں میں نہیں ملے لیکن اس کی کتاب خود شہادت دیتی ہے کہ وہ بڑے پایہ کا مصنف ہے چونکہ اس کو دولت عباسیہ کے دربار سے تعلق تھا اس لئے تاریخ کا اچھا سرمایہ بہم پہنچا سکا ہے"۔ (۱/۷) بسا اوقات ان کا نام ابن واضح عباسی نقل کرتے ہیں (۱/۱۲۸)

انہوں نے اس کی کتاب "تاریخ یعقوبی" کے اولین دو حوالے حضرت عمرؓ کے سفر بیت المقدس کے ضمن میں دیا ہے کہ وہ رجب ۱۶ھ میں مدینہ سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنا جانشین حضرت عثمانؓ کو بنایا تھا جبکہ طبری کے بقول

حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا، (۱/۱۴۳) تیسرا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ یعقوبی کے بقول حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مفتوحہ علاقہ سات صوبوں میں منقسم تھے (۲/۲۱) چوتھا حوالہ عہد فاروقی میں فارس کے انتظام کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ فارس وغیرہ میں انہوں نے تمام نوشیروانی نظام بحال رہنے دیئے تھے اس لئے صرف یہ بتادینا کافی ہے کہ یعقوبی کے بقول نوشیرواں کے عہد میں یہ ممالک عراق کے علاوہ تین بڑے حصوں میں منقسم تھے یعنی خراسان، آذربائجان اور فارس، (۲/۲۲) پانچواں حوالہ حضرت عمرؓ کے انتظامات خراج کے ضمن میں دیا ہے کہ خوبی بندوبست کی وجہ سے دوسرے ہی سال خراج کی مقدار آٹھ کروڑ سے دس کروڑ بیس ہزار درہم تک پہنچ گئی، (۲/۴۱) چھٹا حوالہ تنخواہوں اور وظائف کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تنخواہوں اور وظائف کے ذریعہ تقسیم کی جانے والی رقم تین کروڑ سالانہ تھی (۲/۷۰) ساتواں حوالہ حضرت عمرؓ کا مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے تنخواہیں مقرر کرنے کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ تنخواہوں کی تفصیل میں مختلف روایتیں ہیں، میں نے کتاب الخراج ص:۲۴، مقریزی ۱/۹۲، بلاذری ص: ۲۴۸، یعقوبی ص: ۱۷۵ اور طبری ۲۴۱۱ کے بیانات کو حتی الامکان مطابق کر کے لکھا ہے، (۲/۸۸) آٹھواں حوالہ حضرت عمرؓ کا فوجی صدر مقامات بنانے کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے "مؤرخ یعقوبی نے واقعات ۲۰ھ میں لکھا ہے کہ اس سال حضرت عمرؓ نے فوجی صدر مقامات قائم کئے لیکن مؤرخ نے صرف فلسطین، جزیرہ، موصل اور قنسرین کا نام لکھا ہے یہ صریح غلطی ہے" (۲/۹۰) نواں حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ انہوں نے رسہ کا مستقل محکمہ قائم کیا تھا (۲/۱۰۱) دسواں حوالہ شہ بانو کے قصہ کی تردید کرتے ہوئے دی ہے (۲/۱۵۸) گیارہواں حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ وہ زیادہ صاحب اثر لوگوں کو دار الخلافت سے باہر نہیں جانے دیتے تھے، (۲/۱۷۱) اسی سلسلہ میں حضرت

عمر بن عوفؓ کا نقل کیا ہے (۳/۱۷۱) بارہواں حوالہ ۱۸ھ میں پڑنے والے قحط کی مصیبت دور کرنے کے لئے انہوں نے جو انتظام کیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ (۲/۱۸۲) آخری حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ انہوں نے آزادی اور حق گوئی کو باقی رکھا تھا چنانچہ ایک واقعہ اس کتاب سے نقل کیا ہے (۲/۹۹)

۳۴۔ **علامہ ازدی:** علامہ ازدی کا شمار اہم مؤرخین میں ہوتا ہے خصوصاً انہوں نے شام کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ان کی کتاب "فتوح الشام" کے کئی حوالے علامہ شبلیؒ نے دیئے ہیں جیسے واقعہ فحل کا مکمل بیان اسی کتاب سے نقل کیا ہے (۱/ ۱۱۷۔۱۲۲) اور وضاحت کی ہے کہ "واقعہ فحل کی تفصیل "فتوح الشام" ازدی سے لی گئی ہے، طبری وغیرہ میں اس کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور واقعہ کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے"۔ (۱/ ۱۲۱۔۱۲۲) دوسرا حوالہ فتح حمص کے ضمن میں دیا ہے کہ اس فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے اس سال فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ (۱/ ۱۲۵) تیسرا و چوتھا حوالہ جنگ یرموک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے دمشق روانہ ہونے سے پہلے حمص اور دیگر مقبوضہ علاقوں کے رہنے والوں سے بطور جزیہ وصول کی گئی رقم واپس کرنے کا حکم دیا تھا جس کے گہرے اثرات وہاں کے رہنے والوں خصوصاً اہل حمص پر مرتب ہوئے، (۱/ ۱۲۸) پانچواں حوالہ جنگ یرموک میں مرنے والوں کی تعداد کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ازدی کے بقول ایک لاکھ آدمی مارے گئے تھے (۱/ ۱۳۹) چھٹا حوالہ معاہدہ بیت المقدس کے ضمن میں دیا ہے کہ وہ بمقام بیت المقدس لکھا گیا جب کہ طبری کے بقول وہ جابیہ میں لکھا گیا تھا، (۱/ ۱۴۴) ساتواں حوالہ حضرت عمرؓ کے نظام خبر رسانی و جاسوسی کے ضمن میں دیا ہے۔ (۲/ ۱۰۸) آخری حوالہ حضرت عمرؓ نے زمانہ میں اسلام قبول کرنے والے اشخاص کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ "مورخ ازدی جنگ یرموک کے حالات میں لکھتا ہے کہ جب رومیوں کی فوجیں یرموک میں اتریں تو وہ لوگ جاسوس بنا کر بھیجے جاتے تھے جو وہیں کے رہنے

والے تھے اور مسلمان ہوگئے تھے، ان لوگوں کو تاکید تھی کہ اپنا اسلام ظاہر نہ کریں تاکہ رومی ان سے بدگمان نہ ہونے پائیں''۔ (۲/۱۱۵)

۳۶۔علامہ ازرقی: علامہ ازرقی کا شمار بھی اہم مؤرخین میں ہوتا ہے خصوصاً تاریخ مکہ کے سلسلہ میں ان کی بات قول فیصل سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب ''**تاريخ مكة**'' کے دوحوالے اس کتاب میں مذکور ہیں: اولین حوالہ حضرت عمرؓ کے والد کے متعلق ہے کہ خاندان بنوعدی نے بنوعبدالشمس کی وجہ سے مجبوراً بنوسہم کے دامن میں پناہ لی تھی اس موقعہ پر ان کے والد خطاب نے آٹھ اشعار کہے تھے جنہیں علامہ ازرقی نے بعینہ نقل کیا ہے لیکن علامہ شبلیؒ نے ان میں سے صرف دوشعر نقل کئے ہیں (۱/۲۲۔۲۳) اور دوسرا حوالہ صفا میں موجود حضرت عمرؓ کی جائیداد کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۱/۲۳)

۳۷۔امام بخاریؒ: روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد اصح ترین کتاب "**صحيح البخاری**" کے مصنف کے احسانات سے امت کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی ہے، انہوں نے حدیث کا جو معیار قرار دیا وہی ردوقبول کا پیمانہ قرار پایا، اس کتاب میں مذکور کسی واقعہ کا مطلب یہ ہے کہ اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرلیا جائے، اس فضل میں امام مسلم کو چھوڑ کر کوئی ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اس کتاب سے متعدد مقامات پر استفادہ کیا ہے جن میں سے اکثر کا تعلق عہد نبوی میں حضرت عمرؓ کے حالات سے ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ انہوں نے کہاں کہاں اس کے حوالے دیئے ہیں: ۱/۱۶،۳۱،۳۳، (۲) ۴۶، ۴۸، ۵۵،۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۲، (۲) ۷۰، ۲۰۱، ۲/۱۳، ۳۲، ۱۴۰، ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۷۷، ۱۹۵، ۲۱۱، ۲۱۹، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۳، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۳، (۲)، ۲۶۴، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۵، (۲)، ۲۷۶، ۲۸۳ (۲) وغیرہ۔

غلاموں کے متعلق حضرت عمرؓ کے طرز عمل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے امام بخاری کی دوسری کتاب ''**الأدب المفرد**'' کے حوالہ سے لکھا ہے ''غلامی کا گھٹانا اور غلاموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرنا خود بانی اسلام ﷺ کا مقصد تھا

اور حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ اسی مقصد کی تعمیل تھی، امام بخاری نے **الادب المفرد** میں غلاموں کے متعلق آنحضرت ﷺ کے جو افعال و اقوال لکھے ہیں ان سے اس دعوی کی کافی تصدیق ہوتی ہے (۱۶۱/۲) دوسرا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری کیوں قبول کی تھی اس کا جواب انہوں نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (۱۶۹/۲)

۳۸۔**علامہ بشاری:** علامہ بشاری کا شمار ممتاز اسلامی جغرافیہ دانوں میں ہوتا ہے جس نے چوتھی صدی میں دنیا کا سفر کیا تھا (۸۳/۲)، علامہ شبلیؒ نے ان کی کتاب کا نام ذکر کئے بغیر صرف ''علامہ بشاری کی کتاب جغرافیہ'' لکھا ہے۔ اس کتاب کا حوالہ انہوں نے مصر میں مالگذاری وصول کرنے کے طریقہ کو بیان کرتے ہوئے دیا ہے کہ ''مقریزی نے یہ پوری تفصیل نقل کی ہے، دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۷۷، علامہ بشاری کی کتاب جغرافیہ صفحہ ۲۱۲ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے''، (۴۴/۲) دوسرا حوالہ ''نہر ابی موسیٰ'' کی کھدائی کے ضمن میں دیا ہے، یہاں بھی اس کا حوالہ ''فتوح البلدان'' کی تائید میں دیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں ''فتوح البلدان'' ص ۳۵۶ و ۳۵۷ میں اس کا حال تفصیل سے لکھا ہے، جغرافیہ بشاری میں بھی اس کا ذکر ہے''۔ (۷۲/۲) فسطاط و موصل کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بھی اس کتاب کا حوالہ دیا ہے فسطاط کے متعلق اس میں مذکور عبارت بھی نقل کی ہے۔ (۸۳/۲)

۳۹۔**بلاذری:** احمد بن یحییٰ بلاذری کی دونوں کتابیں۔ **فتوح البلدان** اور **انساب الاشراف** ۔ علامہ شبلیؒ کے مستقل مصادر میں شامل ہیں، مقدمہ کتاب میں انہوں نے مصنف اور ان کی کتابوں کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ مؤخر الذکر کا نسخہ انہوں نے قسطنطنیہ میں دیکھا تھا۔ (۷/۱)

ا۔**فتوح البلدان:** اس کتاب کے حوالہ جا بجا ملتے ہیں لہذا تفصیلات نہ بیان کرتے ہوئے صرف ان صفحات کے نمبر پر اکتفا کی جاتی ہے جن پر اس کتاب

کے حوالے درج ہیں :۱/ ۲۶، ۲۵، ۳،۷۳،۴، ۷۷، (۲) ۷۹، ۸۵، ۱۰۳، ۱۱۶، ۱۲۸، ۱۳۹، ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۵۷، ۱۷۵، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۲، ۱۹۵، ۲/ ۱۶، ۲۹، ۳۸، ۴۳، ۶۷، ۶۹، ۷۰، (۲) ۷۲، ۷۴(۲)، ۷۵(۲)، ۷۶، ۸۱، ۸۳، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۴(۲)، ۹۵، ۹۷، ۹۸ (۳) ۱۰۰، (۳) ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۷، ۱۴۶، ۱۵۱(۲)، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۷، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۳۶، ۲۶۶، ۲۷۵ وغیرہ

۲۔ انساب الأشراف: اس کتاب کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کا عکاظ کے دنگل میں کشتی لڑنا (۱/ ۲۵) ایمان لانا (۱/ ۳۰۔ ۲۹) اور غزوہ احد میں ثابت قدم نہ رہنا (۱/ ۴۲) منقول ہے آخر الذکر حوالہ کے متعلق علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ یہ روایت درایۃً وروایۃً دونوں اعتبار سے غلط ہے۔ (۱/ ۴۳) دوسرے حصہ میں اس کا حوالہ روایت حدیث کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا نقطہ نظر ذکر کرتے ہوئے دیا ہے (۲/ ۲۰۷۔ ۲۰۸) مجلس شوریٰ کے ایک جلسہ کا ذکر صرف بلاذری حوالے سے کیا ہے تاہم کتاب کا نام مذکور نہیں ہے، چونکہ انساب الأشراف میں حضرت عمرؓ کے حالات مذکور ہیں اس لئے اسے یہاں ذکر کیا گیا ہے اور آخری حوالہ فن فرائض کی ترتیب ودرستگی کے لئے رومی عیسائی کو مدینہ طلب کرنے کے ضمن میں دیا ہے۔ (۲/ ۲۶۲)

۴۰۔ امام بیہقیؒ: امام بیہقیؒ کا شمار کبار محدثین میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے ان کے حوالے درج کئے ہیں لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ ان کی کون سی کتاب ان کے پیش نظر تھی۔ یہ حوالے بھی انہوں نے کئی کتابوں کے ساتھ بیان کئے ہیں یا کسی کتاب کے حوالے جیسے **کنز العمال** سے ذکر کئے ہیں، ایک حوالہ آنحضرت ﷺ کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے (۱/ ۵۴) دوسرا قضاء کے اصول وآئین کے متعلق فرمان عمرؓ کے متعلق ہے (۲/ ۵۵) جب کہ تیسرا حوالہ اس مفصل وصیت کے متعلق ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ

کے لئے مرتب کی تھی۔ (۱۴۰/۲) اس کتاب کے مزید حوالے بھی مذکور ہیں:
۱/۱۶، ۴۱، ۱۶۰، اور ۲۱۷ وغیرہ

۴۱۔ **امام ترمذیؒ:** امام ترمذیؒ کا شمار صحاح ستہ کے مصنفین میں ہوتا ہے، ان کی کتاب ''سنن الترمذی'' کے حوالہ سے انہوں نے حاشیہ میں نقل کیا ہے کہ غزوہ تبوک میں آدھا مال حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا حالانکہ علامہ شبلیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت عمرؓ نے غزوہ تبوک میں آدھا مال آنحضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ (۵۲/۱)

۴۲۔ **جاحظ:** جاحظ کا شمار عصر عباسی کے صاحب اسلوب ادباء میں ہوتا ہے، ان کی کتاب ''البیان والتبین'' کو عربی زبان وادب میں کلاسیکل کا درجہ حاصل ہے، اس کتاب میں بقول علامہ شبلیؒ حضرت عمرؓ کے خطبے وغیرہ منقول ہیں۔ (۱۳/۱) اس کتاب کے حوالے بھی متعدد جگہوں پر مذکور ہیں، طوالت کے خوف کی وجہ سے صرف ان صفحات کا حوالہ دیا جارہا ہے جہاں جہاں اس کتاب کے حوالے مذکور ہیں تاہم اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہ حوالے ان کے خطبات، شعری ذوق اور شاعروں کے متعلق ان کے خیالات سے متعلق ہیں۔
(۲۴/۱، ۲۵، ۵۵/۲، ۸۷، ۱۴۰، ۲۴۴، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۱)

۴۳۔ **جمال الدین محدث:** ان کی کتاب ''روضۃ الاحباب'' سے علامہ شبلیؒ نے استفادہ کیا ہے۔عہد فاروقی میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کو مذہبی جیسے مساجد وغیرہ، فوجی جیسے قلعہ چھاونی وغیرہ اور ملکی جیسے دار الامارۃ وغیرہ میں تقسیم کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ مذکورہ مصنف کے بقول حضرت عمرؓ کے عہد میں تعمیر کی جانے والی مساجد کی تعداد چار ہزار تھی۔ (۷۴/۲، ۱۲۷)

۴۴۔ **امام دارمیؒ:** امام دارمی کا شمار ائمہ محدثین میں ہوتا ہے، ان کی کتاب ''المسند'' کا شمار احادیث کے اہم مجموعوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا اولین حوالہ ''صیغہ عدالت'' کے ضمن میں دیا ہے کہ انہوں نے قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا تھا

کہ ''مقدمات میں اول قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو، قرآن میں وہ صورت موجود نہ ہو تو حدیث اور حدیث نہ ہو تو اجماع و کثرت رائے کے مطابق اور کہیں پتہ نہ لگے تو خود اجتہاد کرو'' یہ فرمان انہوں نے کنز العمال کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ''مسند دارمی میں بھی یہ فرمان تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مذکور ہے'' پھر اس کے بعد فرمان کی عبارت نقل کی ہے۔ (۵۸/۲) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتوی دینے کے مجاز صرف ان کے اجازت یافتہ حضرات تھے ان کے علاوہ دیگر افراد کو وہ فتوی دینے سے روک دیتے تھے چنانچہ ایک دفعہ عبد اللہ بن مسعود کو بھی فتوی دینے سے روک دیا تھا۔ (۶۵/۲) تیسرا حوالہ حضرت ابی بن کعبؓ کے ضمن میں دیا ہے کہ جب وہ ایک مجلس سے اٹھے تو لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، اتفاق سے حضرت عمرؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو انہوں نے حضرت ابیؓ کو ایک کوڑا لگایا، انہوں نے تعجب سے وجہ پوچھی تو فرمایا ''وماتری فتنة للمتبوع ومذلة للتابع'' یعنی تم نہیں جانتے یہ امر متبوع کے لئے فتنہ اور تابع کے لئے ذلت ہے، (۱۹۶/۲) چوتھا حوالہ حضرت عمرؓ کا کثرت روایت سے روکنے کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے اور علامہ ذہبی کی طویل عبارت نقل کر کے بیان کیا ہے کہ ''مسند دارمی میں قرظہ بن کعبؓ کی روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ''حضرت عمرؓ کا یہ مطلب تھا کہ غزوات کے متعلق کم روایت کی جائے، اس سے فرائض و سنن مقصود نہیں''، (۲۰۷/۲) پانچواں حوالہ اجل صحابہ کرامؓ کا کثرت سے روایت نہ کرنے اور روایت کرتے وقت ان کی حالت کو بیان کرتے ہوئے دیا ہے، (۲۰۹/۲) علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کو قیاس کا موجد قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عام نقطہ کی تردید کی ہے کہ اس کے موجد حضرت معاذؓ تھے، (۲۲۲/۲) آخری حوالہ اس ضمن میں ہے کہ حضرت عمرؓ عبرانی سے بخوبی واقف تھے۔ (۲۵۳/۲) مزید حوالوں کے لئے دیکھئے: ۲/ ۱۲۰، ۲۱۰، ۲۱۵(۲)

۴۵۔امام دار قطنیؒ: امام دار قطنیؒ کا شمار اہم متاخرین محدثین میں ہوتا ہے، ان کی کس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے اس کی وضاحت انہوں نے نہیں کی ہے بلکہ قیاس کے متعلق حضرت عمرؓ کا قول نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے "یہ روایت دار قطنیؒ میں مذکور ہے، دیکھو ازالۃ الخفاء ص ۱۸۵" گویا اس بات کا امکان پیدا ہو جاتا ہے انہوں نے براہ راست اس سے استفادہ نہیں کیا تھا، ممکن ہے کہ انہوں نے ازالۃ الخفاء میں دیکھنے کے بعد اصل کی طرف رجوع کیا ہو، محض اس امکان کی بنا پر اسے مصادر شبلیؒ میں شامل کیا گیا ہے۔ (۲/۲۲۳)

۴۶۔امام ذہبیؒ: امام ذہبیؒ اپنی گوناگوں علمی خدمات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، ان کی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" کا شمار اسماء الرجال کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے بسا اوقات اس کا نام "طبقات الحفاظ" لکھا ہے (۲/۱۲۴، ۱۲۵) اس کا پہلا حوالہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فقہ کی تعلیم کے انتظام کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن غنمؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ ان دس اشخاص میں شامل تھے جو بصرہ میں فقہ کی تعلیم پر مامور تھے (۲/۱۲۴۔۱۲۵) اس کے علاوہ حسب ذیل صفحات ۲/ ۲۰۵، ۲۰۸ (۲)، ۲۱۲، ۲۱، ۶۵، ۸۳، ۸۴ پر بھی اس کے حوالے مذکور ہیں۔

علامہ ذہبی کی دوسری کتاب، تذحیب التہذیب کا حوالہ اولین سیرت نگار کی تعیین کرتے ہوئے دیاہ کہ یہ شرف موسیٰ عقبہ (/۱۴۱ھ) کو حاصل ہے)۲/۴)

ان کی تیسری کتاب طبقات القراء کا حوالہ حضرت ابو الدرداءؓ کے طریقہ تعلیم قرآن کو بیان کرتے ہوئے دیا ہے (۲/۱۱۹)

۴۷۔امام زرقانیؒ: امام زرقانیؒ کا شمار متأخرین علماء وفضلاء میں ہوتا ہے، انہوں نے "المواہب اللدینۃ" کی ایک تفصیلی شرح لکھی تھی۔ علامہ شبلیؒ نے اس کا حوالہ غزوہ خیبر سے پہلے ہونے والے ایک سریہ میں ہاتھ آنے والے مال غنیمت کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے تاہم پورے بیان میں حضرت عمرؓ کا کہیں کوئی ذکر نہیں

ہے۔ (۴۹/۱) دوسرا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ انہوں نے وہ درخت کٹوا دیا تھا جس کے نیچے آنحضورﷺ نے بیعت الرضوان لی تھی اورلوگ اس کی زیارت کے لئے آنے لگے تھے۔ (۱۹۲/۲)

۴۸۔**زمخشری**: زمخشری کا شمار چوٹی کے مفسرین میں ہوتا ہے، انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی کتب تصنیف کی ہیں جن میں ''ربیع الابرار''بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں مذکورحضرت شہر بانو کے قصہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس غلط قصہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمخشری نے جس کوفن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں ربیع الابرار میں اس کولکھا اورابن خلکان نے امام زین العابدین کے حال میں یہ روایت اس کے حوالہ سے نقل کردی، لیکن یہ محض غلط ہے اولا تو زمخشری کے سوا طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری، ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کونہیں لکھا اورزمخشری کافن تاریخ میں جوپایہ ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی قرائن اس کے بالکل خلاف ہیں۔ (۱۵۸/۲)

۴۹۔**امام زیلعیؒ**: امام زیلعیؒ کا شمار متأخرین محدثین میں ہوتا ہے، انہوں نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الھدایۃ'' میں مذکور احادیث کی تخریج ''الدرایۃ فی تخریج الھدایۃ'' کے نام سے کی ہے۔ اس کتاب کا حوالہ علامہ شبلیؒ نے ذمیوں کے جان ومال کے متعلق حضرت عمرؓ کے نظریہ کو بیان کرتے ہوئے دیا ہے کہ وہ ذمی کی جان ومال کومسلمانوں کی جان ومال کے برابر قرار دیتے تھے لہذا انہوں نے ایک مسلمان کوعیسائی مقتول کے وارثوں کے حوالہ کرنے کا حکم دیا تھا جسے ان لوگوں نے قصاص کے بدلہ میں قتل بھی کردیا تھا۔ (۱۳۸/۲)

۵۰۔**علامہ سخاویؒ**: متأخرین محدثین میں علامہ سخاویؒ بلند مقام پر فائز ہیں، ''فتح المغیث'' کا شمار اصول حدیث کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اس کتاب کا حوالہ امام شعبیؒ کا بیان نقل کرتے ہوئے دیا کہ حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ باہم ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے اور اسی

وجہ سے ان کے مسائل باہم ملتے جلتے ہیں، یہ قول انہوں نے حضرت عمرؓ کے تفقہ اور فقہ میں ان کے مقام ومرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ (۲/۲۱۲)

۵۱۔ علامہ سمہودیؒ: تاریخ مدینہ پر سند سمجھے جانے والے علامہ سمہودیؒ کا شمار اہم متأخرین علماء وفضلاء میں ہوتا ہے، ان کی کتاب **"خلاصة الوفاء"** مدینہ کی تاریخ پر سب سے اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کا پہلا حوالہ ربذہ کے مقام پر حضرت عمرؓ کی تیار کردہ اونٹوں وگھوڑوں کی چراگاہ کے ضمن میں دیا ہے۔ (۲/۹۲) دوسرا وتیسرا حوالہ مسجد نبوی میں حضرت عمرؓ کی توسیع اور مسجد نبوی سے متعلق دیگر امور کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ انہوں نے ''مسجد کی تجدید کے ساتھ ایک گوشہ میں ایک چبوترہ بھی بنوایا تھا اور لوگوں سے کہا کہ جس کو بات چیت کرنی یا شعر پڑھنا ہو، اس کے لئے یہ جگہ ہے'' (۲/ ۱۲۸۔۱۲۹) چوتھا حوالہ مسجد نبوی میں انتظام فاروقی کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ انہوں نے مسجد میں خوشبو اور بخور کا انتظام کیا تھا (۲/۱۲۹) پانچواں حوالہ حضرت عمرؓ کی سکونت کے متعلق ہے کہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ سے تین میل دور عوالی میں رہتے تھے، انہوں نے عوالی میں موجود مکان کو بیچ کر قرضہ ادا کرنے کی وصیت کی تھی، اس گھر کو حضرت معاویہؓ نے خریدا تھا اور زر قیمت سے قرض ادا کیا گیا تھا اس لئے یہ مکان مدت تک ''دارالقضاء'' کے نام سے مشہور رہا، (۲/۲۷۵) اور آخری حوالہ حضرت عمرؓ کی جائیداد ''ثمغ'' کے ضمن میں دیا ہے۔ (۲/۲۷۵)

۵۲۔ علامہ سیوطیؒ: علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا شمار اہم متأخرین محدثین ومفسرین میں ہوتا ہے، انہوں نے متعدد علوم وفنون میں اہم کتب یادگار چھوڑی ہیں، ان کی حسب ذیل کتب سے اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے:

ا۔ الاتقان: علوم القرآن کے موضوع پر اہم ترین کتب میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کی ان کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے جمع وترتیب قرآن کے ضمن میں کی تھیں۔ (۲/۱۱۷)

۲۔ **حسن المحاضرۃ:** مصر اور مصر کے علماء فضلاء کے حالات زندگی جاننے کے لئے یہ کتاب بہترین مصدر و مأخذ ہے۔ اس کا پہلا حوالہ عہد عمر میں فاتحین کے لئے زراعت کی ممانعت فاروقی کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ شریک غطفی نامی شخص نے مصر میں زراعت کی تھی تو حضرت عمرؓ نے اس کو بلا کر سخت مواخذہ کیا اور فرمایا کہ تجھ کو ایسی سزا دونگا کہ اوروں کو عبرت ہو، (۲/ ۴۸) حضرت عمرؓ کے حکم سے فسطاط اور بحر قلزم کے درمیان ایک نہر کھدوائی گئی تھی جس نے دریائے نیل کو بحر قلزم سے ملا دیا تھا، اس نہر کی وجہ سے مصری تجارت کو کافی فائدہ پہنچا تھا، علامہ شبلیؒ نے اس نہر کی تفصیلات مذکورہ کتاب سے نقل کی ہیں۔ (۲/۳/۷) حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں فقہ کی تعلیم کا جو انتظام کیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے حبان میں ابی جبلہ کو مصر میں فقہ کی تعلیم پر مامور کیا تھا (۲/۱۲۴)

۵۳۔ **امام شافعی:** امام شافعی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، علامہ شبلیؒ نے ان کی کتابوں سے استفادہ تو کیا ہے لیکن کتب کی وضاحت نہیں کی ہے وہ امامت واجتہاد کی بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ''خراج کی تشخیص، جزیہ کی تعیین، ام ولد کی خرید وفروخت وغیرہ وغیرہ مسائل کے متعلق امام شافعی نے اپنی کتابوں میں نہایت ادعاء کے ساتھ احادیث سے استدلال کیا ہے اور ان مسائل میں جہاں حضرت عمرؓ کا طریق مختلف ہے بڑی دی سے قدح کی ہے لیکن امام شافعی نے یہ نکتہ نظر انداز کیا کہ یہ امور منصب نبوت سے متعلق نہیں رکھتے اس لئے ان مسائل میں خود شارع علیہ السلام کی طرف سے ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہے'' (۲/۱۹۳)

امام شافعی کے ''الرسالۃ'' سے استفادہ کا اظہار بھی بین السطور سے ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں ''امام شافعی نے بے شبہ ایک رسالہ لکھا ہے جس میں اپنے چند اصول منضبط کئے ہیں'' (۲/۲۲۴) اسی طرح بسا اوقات امام شافعی کے اقوال دیگر کتب کے حوالے یا بغیر حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ جیسے ۲/ ۱۳۸،

۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۲۷ وغیرہ

۵۴۔ **علامہ طبریؒ:** علامہ شبلیؒ نے ان کا ذکر بھی مقدمہ میں کیا ہے کہ ان کا شمار حدیث وفقہ کے ائمہ میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے انہیں لوگوں نے مجتہدین کے زمرہ میں شمار کیا ہے، تاریخ میں انہوں نے ایک مفصل اور بسیط کتاب لکھی ہے (۱/۷) تیرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل مذکورہ کتاب گویا ''الفاروق'' کی ریڑھ کی ہڈی ہے، علامہ شبلیؒ نے قدم قدم پر اس سے فائدہ اٹھایا ہے، اس کتاب کے حوالے اتنے زیادہ مذکور ہیں جو مستقل مضمون کے متقاضی ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ حوالے اسی کتاب کے ہیں۔

۵۵۔ **ملا علی القاریؒ:** متأخر محدثین میں انہیں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے، انہوں نے سو سے زائد تصنیفات بطور یادگار چھوڑی ہیں ان کی کتاب "فتح القدیر" (حاشیہ ہدایہ) کا ذکر ''صیغہ عدالت'' کے ضمن میں کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رشوت سے روکنے کے لئے قضاۃ کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کی تھیں جیسے سلمان ربیعہؒ اور قاضی شریحؒ کی تنخواہ پانچ سو درہم ماہانہ تھی، (۲/۶۱) دوسرا حوالہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کے ضمن میں دیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو وہ اس مسلمان کو اس کے وارثوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ (۲/۱۳۸)

۵۶۔ **علی المتقی:** سرزمین ہند کے نامور محدثین میں ان کا شمار ہوتا ہے، فن حدیث میں ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں، ان کی کتاب ''کنز العمال'' کو عرب محدثین نے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے لیکن علامہ شبلیؒ اس کتاب میں حضرت عمرؓ کے متعلق مذکور تمام روایتوں کے صحت کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ انہیں گرمی محفل کا سبب سمجھتے تھے، وہ لکھتے ہیں: ''حضرت عمرؓ کے زہد وتقشف.......... کی سینکڑوں روایتیں مذکور ہیں.......... لیکن اس کے متعلق ان تمام روایتوں کو صحیح نہیں خیال کرنا چاہئے جو حلیۃ الاولیاء، ابن عساکر، کنز العمال، ریاض النضرۃ وغیرہ میں مذکور ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ چونکہ اس قسم کی روایتیں عموماً

گرمی محفل کا سبب ہوتی تھیں اور عوام ان کو نہایت ذوق سے سنتے تھے اس لئے ان میں خود بخود مبالغہ کا رنگ آ تا گیا ہے، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ جو کتابیں زیادہ مستند اور معتبر ہیں ان میں یہ روایتیں بہت کم پائی جاتی ہیں، اس لئے میں نے اس قسم کی جو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں ان میں بڑی احتیاط کی ہے اور **رياض النضرة وابن عساكر وحلية الاولياء** وغیرہ کی روایتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے''۔ (۱/۱۷)

علامہ شبلیؒ نے اس کتاب کے حوالے جہاں بھی ذکر کئے ہیں ان کی تائید میں دیگر مستند کتب کے حوالے بھی نقل کئے ہیں جیسے مجلس شوری کے کچھ افراد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''**كنز العمال بحواله ابن سعد**''، (۲/۱۴) مجلس شوریٰ کے ضمن میں ہی دوسرا حوالہ ''**كنز العمال بحواله مصنف ابن ابی شیبه**'' نقل کیا ہے، (۲/۱۵) تیسرا حوالہ حکیم بن حزامؓ کے ضمن میں دیا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے بار بار اصرار کے باوجود تنخواہ لینے سے انکار کر دیا تھا، (۲/۲۷) چوتھا حوالہ قاضی شریحؒ کے نام اس فرمان عمرؓ کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے جس میں انہوں نے قضاء کے اُصول بیان فرمائے تھے، اس حوالہ کو بھی مسند دارمی سے مستند کیا ہے، (۲/۵۸) پانچواں حوالہ ابن سعد کی روایت سے تائید کرتے ہوئے دیا ہے کہ دیگر اضلاع وصوبجات میں سال بھر خرچ کرنے کے بعد جو رقم بچ جاتی تھی وہ مدینہ منورہ کے بیت المال بھیج دی جاتی تھی اور ان بچی ہوئی رقومات کے متعلق عمال کے نام حضرت عمرؓ کے تاکیدی احکام آتے رہتے تھے، (۲/۷۰-۷۱) چھٹا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں ہر سال ۳۰ ہزار نئی فوج تیار ہو جاتی تھی، اس روایت کو موطاء امام مالک سے مستند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام مالک کے بقول ۴۰ ہزار فوج تیار ہو جاتی تھی (۲/۹۷) ساتواں حوالہ ''صیغہ مذہبی'' کے ضمن میں دیا ہے کہ جب ان کا غلام بار بار کہنے پر اسلام نہیں لایا تو فرمایا ''**لا اكراه فى الدين**'' اس کی تائید میں

ابن سعد کا ذکر کیا ہے، (۲/۱۱۰) اسی مضمون کو دوبارہ بھی نقل کیا ہے، (۲/۱۴۳) آٹھواں حوالہ حضرت عمرؓ کی ان کوششوں کے متعلق دیا ہے جو انہوں نے قرآن کی جمع وترتیب کے ضمن میں کی تھیں، جامعین قرآن کو حکم تھا کہ کسی لفظ کے تلفظ ولہجہ میں اختلاف پیدا ہو تو قبیلہ مضر کے لہجہ کے مطابق لکھا جائے کیونکہ قرآن مجید مضر ہی کی زبان میں اترا ہے، یہاں بھی کنز العمال کے ساتھ الاتقان کا حوالہ مذکور ہے، (۲/۱۱۷) حضرت عمرؓ صحابہ کرام کو قرآن کی تعلیم دینے کے لئے دور دراز ممالک میں بھیجا کرتے تھے، اس کے طریقۂ تعلیم اور اشاعت قرآن کے وسائل وغیرہ کا حوالہ بھی مذکورہ کتاب سے دیا ہے لیکن یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ در اصل یہ طبقات ابن سعد کی روایت ہے، (۲/۱۱۹، اس صفحہ پر کنز العمال کے تین حوالے مذکور ہیں) تعلیم قرآن کے متعلق حضرت عمرؓ کی کوششوں کے نتیجہ میں حفاظ کی تعداد بڑھ گئی تھی، حضرت عمرؓ کے ایک خط کے جواب میں سعد بن وقاصؓ نے لکھا تھا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ موجود ہیں، (۲/۱۲۰) اسی طرح حضرت عمرؓ کا یہ فرمان بھی اسی کتاب کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہو قرآن نہ پڑھانے پائے، (۲/۱۲۰) ذمیوں کے لباس ووضع کے متعلق فرمان عمرؓ کا ایک حصہ مذکورہ کتاب سے نقل کیا ہے، (۲/۱۴۷) ان مقامات پر تائیدی حوالہ مذکور نہیں ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ''کنز الأعمال میں بیہقی وغیرہ سے روایت منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے سرداران فوج کو یہ تحریری حکم بھیجا ''وتلزموهم المناطق يعنى الزنانير''، (۲/۱۴۸) اس کتاب سے امام شافعی سے مروی حضرت عمرؓ کا قول واصول ''لایسترق عربی'' (یعنی عرب کا کوئی آدمی غلام نہیں ہوسکتا ہے) بھی نقل کیا ہے جس سے دیگر ائمہ مجتہدین کو اختلاف تھا (۲/۱۵۵) اسی ضمن میں دوسرا قول بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابوموسی اشعریؓ کو یہ حکم بھیجا کہ کاشتکار یا پیشہ ور غلام نہ بنایا جائے، (۲/۱۵۷) غلامی کے سلسلہ میں ہی مستدرک حاکم، بیہقی،

مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ احکام دیئے تھے غلاموں کو بیچتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ اپنے عزیز واقارب سے علیحدہ نہ ہونے پائیں یعنی ایسا نہ ہو کہ ماں کسی اور کے ہاتھ بیچی جائے اور بیٹی کسی اور کے ہاتھ، (۲/۱۶۰) حضرت عمرؓ کے اصول مساوات کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس کا حوالہ دیا ہے، (۲/۱۶۷) بیت المال کی چیزیں استعمال کرنے سے حضرت عمرؓ کس قدر پرہیز کرتے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بیمار پڑے تو مسجد نبوی میں لوگوں سے جا کر کہا کہ ''اگر آپ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں''، (۲/۱۷۸) حضرت عمرؓ کی عادت کا ذکر اس کتاب کے حوالہ سے کیا ہے کہ وہ رعایا کی شکایتیں سننے کی خاطر صحن مسجد میں بیٹھ جاتے تھے جس کو جو کچھ کہنا وسننا ہوتا کہتا، کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے اٹھ جاتے تھے۔ (۲/۱۸۵) حضرت عمرؓ کا مشہور قول ''مذکم تعبد تم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا'' (یعنی تم لوگوں نے آدمیوں کو غلام کب بنالیا؟ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا) بھی اسی کتاب کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (۲/۱۹۸) حضرت عمرؓ عبرانی زبان سے واقف تھے لہذا وہ یہودیوں کے درس توریت میں شریک ہوا کرتے تھے اس کا ذکر بیہقی کی روایت سے مستند کرتے ہوئے کیا ہے، (۲/۲۵۴) حضرت عمرؓ کی ایک اور عادت شریفہ کا ذکر اس کتاب کے حوالہ سے کیا ہے کہ وہ اہل کمال کی قدردانی کیا کرتے تھے جیسے خارجہ بن حذافہؓ، عثمان بن ابی العاصؓ کے گرانقدر وظیفے اس بنا پر مقرر کئے کہ خارجہؓ بہادر اور عثمانؓ نہایت فیاض تھے، (۲/۲۶۶) مؤخر الذکر دونوں حوالوں میں کوئی تائیدی حوالہ مذکور نہیں ہے۔

حسب ذیل صفحات پر بھی اس کے حوالے ملتے ہیں ۲/ ۵۹، ۶۲، ۶۶، ۹۲، ۱۰۲، ۱۸۸

۵۷۔ **علامہ قرطبیؒ:** علامہ قرطبیؒ کا شمار اہم مفسرین میں ہوتا ہے ان کی کتاب ''الجامع

لاحکام القر آن'' کا شمار بنیادی تفاسیر میں ہوتا ہے تاہم علامہ شبلیؒ نے اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ ان کی کس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔''واقعہ قرطاس'' سے متعلق علامہ قرطبیؒ کی تاویل انہوں نے حاشیہ میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ تاویل لگتی ہوئی ہے لیکن بخاری و مسلم کی بعض روایتوں میں ایسے الفاظ ہیں جن میں اس تاویل کا احتمال نہیں''۔(۱/۵۶)

۵۸۔**علامہ قسطلانیؒ:** علامہ قسطلانیؒ کا شمار ممتاز متأخر سیرت نگاران رسول میں ہوتا ہے، ان کی کتاب ''المواھب اللدینة ''کا شمار اہم کتب سیرت میں ہوتا ہے۔اس کا حوالہ جنگ خیبر سے پہلے ایک سریہ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے، تاہم پورے بیان میں حضرت عمرؓ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔(۱/۴۹)ان کی دوسری کتاب **ارشاد الساری إلی شرح صحیح البخاری** کا حوالہ حضرت عمرؓ کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ وہ مشکل مسائل کو یادداشت کے طور پر لکھ لیتے تھے اور ہمیشہ ان پر غور کیا کرتے تھے بقول قسطلانی انہوں نے دادا کی میراث کے متعلق سو مختلف رائیں قائم کی تھیں۔(۲/۲۱۵)

۵۹۔**قضاعی:** علامہ شبلیؒ نے انہیں مؤرخ گردانا ہے(۲/۸۲) تاہم مجھے ان کے متعلق دیگر معلومات دستیاب نہ ہوسکیں علامہ شبلیؒ نے ان کا حوالہ فسطاط کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے دیا ہے۔(۲/۸۲)

۶۰۔**ماوردیؒ:** ان کی کتاب ''الاحکام السلطانیة''کا ذکر علامہ شبلیؒ نے اپنے مقدمہ میں ان کتب میں کیا ہے جن کے ذریعہ حضرت عمرؓ کے طریق حکومت وآئین انتظام کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔(۱/۱۳) اس کا پہلا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے کہ ابتداء میں حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کرنے والے صرف پانچ اشخاص تھے جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔(۱/۶۴)اس کتاب سے انہوں نے حصہ دوم میں چار جگہوں پر استفادہ کیا ہے، اولین حوالہ ''صیغہ

عدالت'' کے باب میں حضرت عمرؓ کے اس فرمان کے ضمن میں دیا ہے جو انہوں نے گورنر کوفہ ابوموسی اشعریؓ کے نام لکھا تھا جس میں قضاء کے اصول وآئین بیان کئے گئے تھے، (۲/۵۵) دوسرا حوالہ حرم محترم میں توسیع عمرؓ کا ذکر دیتے ہوئے دیا ہے کہ انہوں نے احاطہ کی دیوار کھنچوائی اور اس سے یہ بھی کام لیا کہ اس پر رات کو چراغ جلائے جاتے تھے، (۲/۱۲۷) تیسرا حوالہ عہد فاروقی میں جاری کئے جانے والے سکے کے تفصیلات بیان کرتے ہوئے دیا ہے، (۲/۱۳۴) چوتھا حوالہ مصنف کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے دیا ہے کہ ''محتسب کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو جو کھانے کمانے کے قابل ہوں اور باوجود اس کے صدقہ اور خیرات لیتے ہوں، تنبیہ وتادیب کرے'' علامہ موصوف نے اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے فعل سے استدلال کیا ہے اور لکھا ہے ''وقد فعل عمرؓ مثل ذلک بقوم من اهل الصدقة''. (۲/۱۸۳-۱۸۴)

مقدمہ میں شاید کاتب کی غلطی سے ماوردی کے بجائے ابن الوردی ہوگیا ہے۔(۱/۱۳)

۶۱۔**امام مالکؒ**: امام مالکؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، ان کی کتاب ''کتاب الموطاء'' کو بقول شاہ ولی اللہ دہلویؒ صحت کے اعتبار سے اولین مقام حاصل ہے۔ اس کتاب سے استفادہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے استنباط احکام کے اصول کو بیان کرتے ہوئے کیا ہے۔ (۲/۲۲۵) جب کہ دوسرا حوالہ ان کی مذہبی زندگی کے ضمن میں دیا ہے کہ معمول تھا رات کو نفلیں پڑھتے تھے جب صبح ہونے کو آتی تو گھر والوں کو جگانے اور یہ آیت پڑھنے ''وامر اهلک بالصلوٰة''۔ (۲/۲۵۹) اس کے حوالے حسب ذیل صفحات پر بھی ملتے ہیں: ۲/۹۷، ۱۲۲ (۲) ۲۶۰، ۲۷۴ صفحہ نمبر ۱۲۲ پر موطاء امام مالک کے بجائے موطاء امام محمد کی کتابت شاید غلطی سے ہوگئی ہے۔

۶۲۔**محب الطبری**: ان کا شمار متأخر مؤرخین میں ہوتا ہے، ان کی کتاب ''ریاض النضرة''

عشرہ مبشرہ کے حالات زندگی پر ایک اہم کتاب تصور کی جاتی ہے لیکن علامہ شبلیؒ اس میں مذکور روایات کی صحت پر مطمئن نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے اس کے حوالے درج نہیں کئے ہیں تاہم اس کا ذکر مقدمہ میں کیا ہے: ''ریاض النضرۃ للمحب الطبری'' میں بھی حضرت عمرؓ کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے لیکن اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں مذکور ہیں اس لئے میں نے دانستہ اس سے احتراز کیا ہے'' (۱/۱۴و۱۷) تاہم یہ بات محل تعجب ہے کہ اس کتاب سے تو انہوں نے احتراز کیا ہے لیکن اس کو بنیاد بنا کر لکھی جانے والی کتاب ازالۃ الخفاء کے متعدد حوالے نقل کئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا اعتراف بھی ملتا ہے کہ اس میں مذکور روایت کی تصدیق خاص طور پر دیگر مستند کتب سے کر لی گئی ہے۔ (۱/۱۹) مثلاً اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محبّ طبری نے ابو حذیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا معمول تھا کہ مجاہدین کے گھروں پر جاتے تھے اور عورتوں سے کہتے کہ تم کو کچھ بے زار سے منگوانا ہو تو میں لا دوں...... الخ'' (۲/۱۸۴۔۱۸۵) محبّ طبری وغیرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے افسروں کو عیسائی ملازم رکھنے سے بہت منع کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ شاہ صاحب نے بھی ان روایتوں کو قبول کر لیا ہے لیکن جس شخص نے محبّ طبری کی کتاب (ریاض النضرۃ) دیکھی ہے وہ پہلی نظر میں سمجھ سکتا ہے کہ ان کی روایتوں کا کیا پایہ ہے۔ ان بزرگوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ عراق، مصر، شام کا دفتر مالگذاری جس قدر تھا سریانی وقبطی وغیرہ میں تھا اور اس وجہ سے دفتر مالگذاری کے تمام عمال مجوسی یا عیسائی تھے۔ (۲/۲۶۲)

۶۳۔ **امام محمد بن حسن شیبانیؒ:** فقہ حنفی کے ممتاز عالم وفقیہ جن کے اقوال وفتاویٰ کا ایک معتد بہ حصہ فقہ حنفی میں موجود ہے۔ انہوں نے بھی حدیث کا ایک مجموعہ ''الموطا'' کے نام سے جمع کیا تھا جس کے متعدد حوالے علامہ شبلیؒ نے اس

کتاب میں نقل کئے ہیں، طوالت کے خوف سے صرف ان صفحات کے نمبر درج کئے جاتے ہیں جن پر اس کتاب کے حوالے مذکور ہیں: ۲/ ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۷، ۶۹، ۱۷۰، ۲۱۵، ۲۲۵ (۲)، ۲۲۶، ۲۷۱ (۲)، ۲۷۵، وغیرہ

ان کی دوسری کتاب " الجامع الصغیر " کا حوالہ ذمیوں کو حاصل ہونے والی مذہبی آزادی کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۲/ ۱۴۸)

ان کی تیسری کتاب "کتاب الآثار" کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے حضرت عمرؓ کا شمار عہد نبوی میں ان چھ افراد میں ہوتا تھا جن پر فقہ کا دار و مدار تھا۔ (۲/۲۱۲)

۶۴۔ **محمد بن خلف الوکیع:** ان کی کتاب "اخبار القضاۃ" کا ذکر علامہ موصوف نے ان کتب کے ضمن میں کیا ہے جن سے خاص صیغہ قضاء کے متعلق ان کا طریق عمل معلوم ہوتا ہے، (۱/۱۳) اس کا پہلا حوالہ "صیغہ عدالت" کے باب میں دیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابو موسی اشعریؓ کو لکھا تھا کہ جو شخص با اثر اور صاحب عظمت نہ ہو، قاضی نہ مقرر کیا جائے کیونکہ ہر عہدہ ایک رعب وداب کا محتاج ہوتا ہے، (۲/۵۴ و ۶۱) دوسرا حوالہ حضرت عمرؓ کے منتخب قضاۃ کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ انہوں نے جن کا انتخاب کیا تھا وہ اس حیثیت سے تمام عرب میں ممتاز تھے، جیسے زید بن ثابتؓ کو مدینہ کا قاضی مقرر کرنا۔ (۲/ ۵۹)

۶۵۔ **مسعودی:** علامہ شبلیؒ متقدمین مؤرخین میں ان کے علم وفضل کے بہت قائل تھے، فرماتے ہیں "ابوالحسن علی بن حسین مسعودی المتوفی ۳۸۶ فن تاریخ کا امام ہے، اسلام میں آج تک اس کے برابر کوئی وسیع النظر مؤرخ پیدا نہیں ہوا، وہ دنیا کی اور قوموں کی تواریخ کا بھی بہت بڑا ماہر تھا، اس کی تمام کتابیں ملتیں تو کسی اور تصنیف کی کچھ حاجت نہ ہوتی لیکن افسوس ہے کہ قوم کی بدمذاقی سے اس کی اکثر تصنیفات ناپید ہوگئیں" (۱/ ۷۔۸) اس کے بعد ان کی دو کتابوں "التنبیہ والاشراف" اور "مروج الذھب" کا ذکر انہوں نے مقدمہ میں کیا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے مقدمہ کتاب میں علامہ مسعودی کا ذکر جس طمطراق سے کیا ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی دستیاب کتب کے متعدد حوالے انہوں نے دیئے ہونگے لیکن تلاش بسیار کے باوجود دونوں کے بہت کم حوالے دستیاب ہو سکے۔ اول الذکر کتاب کا صرف ایک حوالہ ذمیوں کی وضع اور لباس کے متعلق حضرت عمرؓ کے احکامات پر تنقید کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے نقل کیا ہے، اسی حوالہ میں مروج الذهب کا بھی ذکر ہے۔ (۱۴۸/۲) اور مؤخر الذکر کا حوالے حضرت عمرؓ کے اسفار (۲۶/۱) اور حضرت عمرؓ کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ وہ حضرت عمر معدیکربؓ سے اکثر فنون حرب کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ (۲۶۸/۲)

سعودی کا حوالہ ایک جگہ اور مذکور ہے لیکن کتاب کے نام کی تصریح نہیں ہے جو اوصاف تھے وہ ان کے تمام عہدہ داروں میں پھیل گئے پھر نمونے کے طور پر حضرت سلیمان فارسیؓ...... وغیرہ کے نام اور ان کے اوصاف لکھے ہیں (۱۹۶/۲)

۶۶۔ **امام مسلمؒ**: امام بخاریؒ کے بعد فن حدیث میں امام مسلم کا مقام ومرتبہ آتا ہے جس پر تمام امت کا اتفاق ہے، ان کی کتاب بھی صحت کے اعلی مقام ومرتبہ کی حامل ہے اس لئے صحیح بخاری کے ساتھ جب اس کا ذکر کیا جاتا ہے صرف صحیحین لکھا جاتا ہے۔ جلد اول میں اس کتاب کے چار حوالے مذکور ہیں، اولین حوالہ حضرت عمرؓ کا خیبر کے مال غنیمت میں سے حاصل ہونے والی زمین کا اللہ کی راہ میں وقف کردینے کے ضمن میں ہے جو اسلام کی تاریخ میں اولین وقف ہے، (۵۰/۱) دوسرا حوالہ غزوہ حنین کے ضمن میں دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کا کوئی ذکر نہیں ہے، (۵۲/۲) تیسرا حوالہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے ناراضگی کے ضمن میں دیا ہے کہ اس زمانہ میں بار بار اجازت مانگنے پر بھی ان کی درخواست رد کردی جارہی تھی تو انہوں نے پکار کر کہا کہ میں بیٹی کی سفارش لیکر

نہیں آیا ہوں اگر آپ ﷺ فرمائیں تو ابھی جا کر گردن مار دوں آنحضرت ﷺ انہیں فوراً بلالیا..................الخ،(۵۳/۱) اور چوتھا حوالہ واقعہ قرطاس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا ہے۔(۵٦/۱،حاشیہ)

دوسری جلد میں بھی چار ہی حوالے ملتے ہیں جو ''امامت واجتہاد'' کے باب میں مذکور ہیں، جیسے قضاء وقدر کے متعلق حضرت عمرؓ کی رائے (۱۹۱/۲) نماز قصر کے متعلق اپنے شک واستعجاب کو دور کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ سے پوچھنا اور آپ ﷺ کا جواب میں یہ فرمانا کہ یہ اللہ کا انعام ہے، (۱۹۴/۲) رمل کے متعلق ان کا خیال، (۱۹۵/۲) اور روایت کے متعلق ان کا چھان بین کرنا۔ (۲۰۴/۲) اسکے حوالے حسب ذیل صفحات پر بھی موجود ہیں: ۵۵/۱، ۲۱۴/۲، ۲۵۷، ۲۸۳۔

٦۷۔مقریزی: علامہ شبلیؒ ان کی مؤرخانہ بصیرت کے بہت زیادہ معترف تھے وہ علامہ ابن خلدون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اسی طرح اس کا شاگرد علامہ مقریزی بھی نکتہ چینی کے بجائے مدح وستائش کا مستحق ہے''۔(۹/۱)

انہوں نے ان کی مشہور کتاب ''خطط الشام'' سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اور بار بار اس کے حوالے دیئے ہیں، اولین حوالہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا مصر کو فتح کرنے کی اجازت مانگنے کے ضمن میں ملتا ہے، (۱۸۸/۱۔۱۸۹) دوسرا حوالہ فتح اسکندریہ کے ضمن میں حضرت مسلمہؓ کی شجاعت اور دانش مندی کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے، (۱۹۳/۱) تیسرا حوالہ بھی اسکندریہ کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ یہ تمام تفصیل مقریزی سے لی گئی ہے، (۱۹۴/۱) حضرت امیر معاویہؓ (۴۳/۲۔۴۴) اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں مالگذاری کے وصولیابی کے قواعد (۴٦/۲) کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے عہد میں مالگذاری کی وصولیابی کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ مقریزی نے پوری تفصیل نقل کی ہے، (۴۴/۲) ان کے علاوہ متعدد مقامات پر اس کتاب کے حوالے

درج کئے گئے ہیں طوالت کے خوف سے ہم ان کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ حسب ذیل صفحات پر بھی اس کے حوالے موجود ہیں: ۲/۴۵(۲)، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۶۷(۲)، ۷۳، ۷۲، ۷۳، ۸۴، ۸۷، ۸۸، ۹۵(۲)، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۷(۲)، ۱۱۲(۲)، ۱۱۴(۲)، ۱۱۵(۲)، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۲، ۱۳۹، ۱۵۶، ۱۵۹، وغیرہ۔

علامہ مقریزی کی دوسری کتاب **"النقود الاسلامية"** کا حوالہ عہد فاروقی میں جاری کئے جانے والے سکہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا ہے۔ (۲/۱۳۴)

مقریزی کی تیسری کتاب **"تاريخ مصر"** کے حوالے سے حضرت عمرؓ کی تحریروں وانشاء کے نمونے نقل کئے ہیں (۲/۲۴۶) لیکن اس کتاب سے مراد ان کی کونسی کتاب ہے اس کی تعیین مشکل ہے کیونکہ انہوں نے مصر کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھی ہیں جس کی وجہ سے وہ مؤرخ مصر کہلاتے ہیں۔

۶۸۔میدانی: علامہ شبلیؒ نے ان کا ذکر مقدمہ میں کیا ہے کہ ''میدانی نے ''کتاب الامثال'' میں ان کے حکیمانہ مقولہ نقل کئے ہیں'' اوراس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ کتاب بھی میرے پیش نظر رہی ہے۔(۱/۱۴) اس کے حوالے سے انہوں نے حضرت عمرؓ کے بعض حکیمانہ مقولے نقل کئے ہیں (۲/۲۵۵)

۶۹۔امام نسائی: امام نسائی کا شمار صحاح ستہ کے مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کی ''کتاب السنن'' کا حوالہ پہلی جلد میں غزوہ احد میں ثابت قدم رہنے والے افراد کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے (۱/۴۱) دوسری جلد میں بھی صرف ایک جگہ اسکا حوالہ مذکور ہے جو مسئلہ خمس کے ضمن میں حضرت عمرؓ کے فیصلہ کو واضح طور پر پیش کرتی ہے۔(۲/۲۲۹)

۷۰۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ: شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، ان کی کتاب حجة الله البالغة اپنے موضوع کی منفرد و یکتا کتاب سمجھی جاتی ہے، انہوں نے

خلفائے راشدین کے حالات زندگی کو ''ازلۃ الخفاء'' نامی کتاب میں بیان کیا ہے، اس کتاب کا شمار بھی ان کی اہم کتب میں ہوتا ہے، علامہ شبلیؒ اس کے متعلق رقمطراز ہیں ''شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب نے ''ازالۃ الخفاء'' میں ان کے فقہ اور اجتہاد پر اس مجتہدانہ طریقے سے بحث کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں'' (۱/۱۴) ایک طرف اتنے بلند پایہ الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف اس کی حیثیت یہ کہتے ہوئے مجروح کردی ہے کہ ''ریاض النضرۃ للمحب الطبری'' میں بھی حضرت عمرؓ کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے لیکن اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں مذکور ہیں اس لئے میں نے دانستہ اس سے احتراز کیا ہے'' (۱/۱۴) مزید فرماتے ہیں ''جو کتابیں روایت کی حیثیت سے کم رتبہ ہیں مثلاً ''ازالۃ الخفاء''، ''ریاض النضرۃ'' وغیرہ، ان کا جہاں حوالہ دیا ہے اس بنا پر دیا ہے کہ خاص اس روایت کی تصدیق اور معتبر کتابوں سے کرالی گئی ہے''۔ (۱/۱۹)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مذکور بالا دونوں کتابوں سے انہوں نے بار بار استفادہ کیا ہے حتی کہ کتاب کا خاتمہ بھی ازالۃ الخفاء سے ایک عبارت نقل کر کے کیا ہے جس میں حضرت عمرؓ کی ''جامعیت کمالات'' کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

استاذ گرامی قدر محترم جناب پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کا مقالہ ''شاہ ولی اللہ اور الفاروق'' شامل کتاب ہے، جس میں انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ علامہ شبلیؒ نے کہاں کہاں ان سے استفادہ کیا ہے، لہٰذا تکرار سے بچنے کی خاطر ان کتب کے تفصیلی حوالہ جات سے صرف نظر کیا گیا ہے۔

۱۷۔ **یاقوت حموی:** مسلم جغرافیہ دانوں میں یاقوت حموی کا شمار اہم و اعلیٰ مقام کے حامل افراد میں ہوتا ہے، ان کی کتاب ''معجم البلدان'' صرف اسلامی ممالک کے جغرافیہ اور محل وقوع کو ہی نہیں بیان کرتی ہے بلکہ ہر علاقہ کے نامور افراد کے

متعلق معلومات کا ایک اچھا خاصہ سرمایہ بھی فراہم کرتی ہے جس نے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اولین حوالہ عراق کی مالگذاری کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں وصول کی جانے والی مجموعی رقم ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ درہم تھی، (۴۲/۲) دوسرا حوالہ ان ۹۰/ لاکھ دینار کے ضمن میں ہے جو بطور خراج مصر سے حاصل ہوتا تھا لیکن یہ حوالہ حضرت عمرؓ کے بجائے حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں وصول کی جانے والی رقم کے سلسلہ میں مذکور ہے، (۴۶/۲) کوفہ وبصرہ کے حالات لکھتے ہوئے حاشیہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کوفہ وبصرہ کے حالات طبری، بلاذری اور معجم البلدان سے لئے ہیں، (۸۱/۲) چوتھا حوالہ موصل کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ''اسکی وسعت اور عظمت کے حالات معجم البلدان اور جغرافیہ بشاری وغیرہ میں تفصیل سے ملتے ہیں: (۸۳/۲) پانچواں حوالہ جیزہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دیا کہ یہاں بڑے بڑے محدث پیدا ہوئے ان میں سے بعض کے نام معجم البلدان میں مذکور ہیں (۸۴/۲) چھٹا حوالہ فتح دمشق کے موقع پر وہاں کے بشپ اردکون کا حضرت خالدؓ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرنے کے ضمن میں دیا ہے، (۱۱۳/۲) اور آخری حوالہ عہد عمرؓ میں تعلیم وتعلم کے ضمن میں کی گئی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے دیا ہے کہ ان کے عہد میں کتابت کی بھی تعلیم ہوتی تھی، لیکن حاشیہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ''معجم میں اس روایت کو حضرت ابوبکرؓ کے عہد کی نسبت لکھا ہے، لیکن خود صاحب معجم نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس وقت تک یہ مقامات فتح نہیں ہوئے تھے''۔(۱۱۸/۲)

دیگر مصادر: علامہ شبلیؒ نے عربی کتب کے علاوہ دیگر زبانوں جیسے فارسی، فرنچ، انگریزی کتب سے بھی استفادہ کیا تھا، فارسی کتابوں میں ''ازالۃ الخفاء'' اور سیرت ابن اسحاق کے فارسی ترجمہ کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، انگریزی کی کسی کتاب کی صراحت تو نہیں ملتی لیکن بین السطور سے، خصوصاً جہاں ممالک کا جغرافیہ

بیان کیا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے انگریزی کتب بھی رہی ہونگی، مثلا دیباچہ میں رقمطراز ہیں ''جلد اول کے آخر میں اسلامی دنیا کا ایک نقشہ شامل ہے...... یہ نقشہ اصل میں جرمن کے چند لائق پروفیسروں نے طیار کیا تھا لیکن چونکہ وہ ہماری کتاب کے بیانات سے پورا پورا مطابق نہیں ہوتا تھا اس لئے ہم نے اصل کتاب کے حاشیہ میں موقع بموقع ان اختلافات کی طرف اشارہ کیا ہے (دیباچہ:۴) لیکن یہ نقشہ ہمارے سامنے موجود نسخہ میں شامل نہیں ہے۔

اس نظریہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے پروفیسر رینکی کو عہد حاضر کا اہم مؤرخ گردانتے ہوئے اس کے متعلق کسی پروفیسر کا قول نقل کیا ہے جس سے اس کی شخصیت کا امتیازی پہلو ظاہر ہوتا ہے، قوی امید ہے کہ انہوں نے یہ قول کسی انگریزی کتاب سے ہی لیا ہوگا، اسی طرح جہاں حضرت عمرؓ کی نافذ کردہ اصلاحات وقوانین عدالت وقضاء کا ذکر کیا ہے اس کا موازنہ رومن امپائر کے قوانین سے کرتے ہوئے مشہور رومن اسکالر سیسرو کا قول ان کے متعلق نقل کیا ہے کہ ''یہ (رومن) قوانین تمام فلاسفروں کی تصنیفات سے بڑھ کر ہیں'' (۲/۵۵) مزید ایک جگہ لکھا ہے ''ایک عیسائی مشہور مؤرخ لکھتا ہے'' (۲/۱۷۳) ان تصریحات سے بھی مذکورہ نظریہ کی تائید ہوتی ہے، تاہم حتمی طور سے یہ کہنا مشکل ہے کہ انگریزی کے کن مصادر سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔

علامہ شبلیؒ فرنچ بھی جانتے تھے لہذا انہوں نے مسلمانوں کے نظام مالگذاری پر لکھی گئی ایک فرنچ کتاب سے بھی استفادہ کیا ہے جس کے مصنف Prof Berchem ہیں۔ علامہ شبلیؒ نے جہاں حضرت عمرؓ کے عہد میں مال گذاری کی تفصیلات بیان کی ہیں وہاں مذکورہ کتاب کے تین حوالے درج کئے ہیں۔ (۲/۴۳،۴۶،۴۸)

مذکورہ بالا فہرست مصادر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کس قدر جانفشانی ومحنت سے یہ کتاب تصنیف کی تھی، ان مصادر کو اگر فن وار تقسیم کیا جائے تو

انہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، سیرت نبوی، اصول فقہ، اصول حدیث، جغرافیہ، ادب عربی، اسماء الرجال، لغت وغیرہ جیسے علوم وفنون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

الفاروق کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے محض ان مصادر سے استفادہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان مصادر میں مذکور غلطیوں کی نشاندہی اور روایات کی تنقیح بھی کی ہے جس نے اس کتاب کی اہمیت دوبالا کر دی ہے۔

مقدمہ کتاب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کس قدر محنت وجانفشانی سے ان مصادر کو تلاش کر کے استفادہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مصادر میں شامل بعض مخطوطات جیسے "سیرۃ العمرین"، "اخبار القضاۃ" اور "محاسن الوسائل" کے نسخے انہوں نے قسطنطنیہ میں دیکھے تھے اور ان سے ضروری معلومات نقل کر لی تھیں۔ اسی طرح مسعودی کی کتب "اخبار الزمان" اور "کتاب الاوسط" کی تلاش میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانے چھان مارے تاکہ ان کی مدد سے حضرت عمرؓ کے اسفار وغیرہ کی تفصیل بیان کی جاسکے کیونکہ علامہ مسعودی نے "مروج الذهب" میں لکھا ہے کہ میں نے ان سفروں کی تفصیل اپنی کتاب "اخبار الزمان" اور "کتاب الاوسط" میں لکھی ہے۔ محض اس بیان کی وجہ سے انہوں نے ان کتب کی تلاش میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کردیں۔ لیکن کامیاب نہ ہوسکے، (۱/۲۶۔۲۷) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ مصادر کے حصول کیلئے کس قدر کوشاں رہتے تھے، ان کی یہی لگن تھی جس نے "الفاروق" کو وہ مقام ومرتبہ عطا کر دیا ہے جو آج تک اس موضوع پر لکھی جانے والی کسی کتاب کو حاصل نہ ہوسکا۔

☆☆☆

الفاروق اور ازالۃ الخفاء

مفتی مشتاق احمد تجاروی☆

"ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اہم ترین تصنیفات میں سے ہے۔ اس کتاب میں شاہ ولی اللہ نے خلافت سے متعلق اصولی مباحث اور خلفاءِ راشدین کی خلافت کا اثبات نیز شریعت مطہرہ کی تدوین واشاعت میں ان کے کردار پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی نظر میں خلفاءِ راشدین کی خلافت اصولِ دین میں سے ہے، اس لئے انہوں نے دین میں خلفاء کے مقام اور شریعت کی تدوین وتشکیل میں ان کے کردار پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے، پوری میراثِ اسلامی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے "کتاب عديم النظير في بابه"

اردو میں خلفاءِ راشدین کے موضوع پر جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے ازالۃ الخفاء اس کے بنیادی مراجع میں شامل ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے حالات پر پہلی کتاب سراج الدین احمد، ایڈیٹر سرمور گزٹ کی "سیرۃ الفاروق" ہے جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی۔ انہوں نے بھی ازالۃالخفاء کو اپنے بنیادی مراجع میں شمار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی قابل قدر اور بیش بہا کتاب ازالۃالخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور سرولیم میور کی انگریزی تاریخوں کا جو انہوں نے خلافت پر لکھی ہیں مشکور ہوں۔"[1]

علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنی کتاب الفاروق میں اس کتاب سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور الفاروق کا ایک باب "حضرت عمرؓ کے فقہ واجتہادات" کے سارے مباحث اسی کتاب سے اخذ کئے ہیں، اور اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس پر اضافہ ممکن نہیں لکھا ہے:

"شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں ان کے اجتہادات پر اس مجتہدانہ طریقے سے

بحث کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں''۔[۲]

فقہ واجتہادات کے علاوہ بھی شبلی نے ان کی کتاب سے استفادہ کیا ہے خاص طور پر اصولی نوعیت کے مباحث کا انحصار بالعموم ازالۃ الخفاء پر ہے۔

خلیفہ کے منصب اور دین میں اس کی حیثیت سے متعلق جو رائے شاہ ولی اللہ کی ہے وہی رائے علامہ شبلی کی بھی ہے۔ علامہ شبلی نے اس رائے پر نہ تبصرہ کیا ہے اور نہ قرآن وسنت یا قدماء کی تحریروں سے اس کی تائید کی ہے بلکہ محض شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے اسے مبرہن کیا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

''امامت کا منصب درحقیقت نبوت کا ایک شائبہ ہے اور امام کی فطرت قریب قریب پیغمبر کی فطرت کے واقع ہوتی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں''۔

''وازمیان امت جمعے ہستند کہ جوہر نفس ایشاں قریب بجواہر انبیاء مخلوق شدہ وایں جماعۃ دراصل فطرتِ خلفاء انبیاء اند درامت''[۳]

حدیث کے بارے میں حضرت عمر کی خدمات، اصول دین اور درایت وتخریج سے متعلق تمام مباحث شبلی نے ازالۃ الخفاء سے اخذ کئے ہیں۔ بعض اصولی نوعیت کے مختلف فیہ امور میں بھی شاہ ولی اللہ کی رائے کو نقل کردیا اور مزید کسی دلیل وبرہان کی تلاش نہیں کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرت عمرؓ کے خطبات وفرامین سے متعلق لکھتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے:

''حضرت عمرؓ نے خطبوں میں، تحریری ہدایتوں میں، فرامین میں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق جو اصولی مسائل بیان کئے ہیں وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کے احکام ہیں، گو انہوں نے آنحضرت ﷺ کا نام نہ لیا ہو۔[۴]

حضرت عمرؓ کے فرامین کی یہ حیثیت محدثین اور فقہاء کی نظر میں نہیں ہے اس کے باوجود شبلی نے اس کو تسلیم کیا اور بطور دلیل ازالۃ الخفاء کی ایک عبارت نقل کردی۔

روایتِ حدیث کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے شاہ ولی اللہ کے تجزیہ کو بنظر استحسان نقل کیا ہے لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کی روک ٹوک اور ضبط واحتیاط سے اگرچہ یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ

حدیثیں کم روایت کی گئیں۔ لیکن جس قدر روایت کی گئیں وہ ہر قسم کے احتمالات سے بے داغ تھیں ان کے بعد احادیث کو بہت وسعت ہوگئی لیکن اعتماد وقوت کا وہ پایہ نہ رہا۔ شاہ ولی اللہ نے نہایت سچ لکھا ہے ''ہر چند جمیع صحابہ عدول اند وروایت ہمہ مقبول، عمل بموجب آنچہ روایت صدوق از ایشاں ثابت شود لازم، امادرمیاں آنچہ حدیث وفقہ در زمن فاروق اعظم بود آنچہ بعد وے حادث شدہ فرق مابین السمٰوات والارض است'' [5]

حضرت عمرؓ کی فقہ وفتاوی اور بعد کے زمانوں پر ان کے اثرات کے بارے میں علامہ شبلی نے شاہ ولی اللہ کے تجزیے کو درست تسلیم کر کے اسے نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''فقہ کے جس قدر مسائل حضرت عمر سے بروایت صحیحہ منقول ہیں، ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے، ان میں سے تقریباً ایک ہزار ایسے ہیں جو فقہ کے مقدم اور اہم مسائل ہیں اور ان تمام مسائل میں ائمہ اربعہ نے ان کی تقلید کی ہے، شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں'' وہم چنیں مجتہدین او درین مسائل فقہ تابع مذہب فاروق اعظم اند وایں قریب ہزار مسئلہ باشد'' [6]

علامہ شبلی نے حضرت عمر کے مناقب اور فضائل سے متعلق روایات جہاں دیگر کتب سے اخذ کی ہیں وہیں بعض روایات ازالۃ الخفاء کے حوالے سے بھی روایت کی ہیں، مثلاً ایک جگہ عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر تمام عرب کا علم ایک پلہ میں رکھا جائے اور عمر کا علم دوسرے پلہ میں تو عمر کا پلہ بھاری رہے گا'' اس مقولہ کو ازالۃ الخفاء کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ابن مسعودؓ کا ایک دوسرا مقولہ ہے کہ ''عمرؓ کے ساتھ ایک ساعت بیٹھنا ایک سال کی عبادت کے برابر ہے'' یہ بھی ازالۃ الخفاء کے حوالے سے ہے۔

علامہ شبلی نے ازالۃ الخفاء کے باضابطہ حوالے تقریباً چالیس مقامات پر دیئے ہیں اہم بات یہ ہے کہ تمام حوالے حضرت عمرؓ کے علوم ومعارف اور فقہ وحدیث

میں ان کی خدمات کے بارے ہیں۔ تاریخی واقعات کے سلسلہ میں شبلی نے اصل مراجع پر اعتماد کیا ہے، کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے اس کی وضاحت کردی ہے کہ حالات وواقعات کے سلسلہ میں ثانوی مآخذ استعمال نہیں کئے گئے ہیں اور اگر کہیں ان کا حوالہ آیا ہے تو دوسری کتابوں سے تصدیق کے بعد آیا ہے، انہوں نے لکھا ہے۔

''جو کتابیں روایت کی حیثیت سے کم رتبہ ہیں مثلاً ازالۃ الخفاء اور ریاض النضرۃ وغیرہ ان کا حوالہ جہاں دیا ہے اس بنا پر دیا ہے کہ خاص اس روایت کی تصدیق معتبر کتابوں سے کرالی گئی تھی'' [۷]

شبلی کی الفاروق کے برخلاف سراج الدین احمد نے اپنی کتاب سیرۃ الفاروق میں ازالۃ الخفاء پر مکمل اعتماد کیا ہے اور احوال وواقعات علوم ومعارف سب میں ازالۃ الخفاء کے حوالے دیئے ہیں ان کی کتاب میں ازالۃ الخفاء کے تقریباً دو سو حوالے موجود ہیں۔

علامہ شبلی نے ازالۃ الخفاء پر اعتماد کیا ہے اور اس کی بہت سی باتوں کو بلا تنقید نقل کیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے ازالۃ الخفاء پر مطلقاً تنقید نہ کی ہو، اول تو شبلی اس کو ثانوی مرجع قرار دیتے ہیں۔ دوم اس کی تاریخی حیثیت کو غیر معتبر قرار دیتے ہیں چونکہ اس کا بنیادی مرجع ریاض النضرۃ ہے اور اس میں رطب ویابس سب طرح کی روایات ہیں اس لئے اس پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

شبلی نے ازالۃ الخفاء کے بعض مقامات پر تاریخی اعتبار سے تنقید کی ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''محبّ طبری وغیرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے افسروں کو عیسائیوں کے ملازم رکھنے سے بہت منع کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی ان روایتوں کو قبول کرلیا ہے لیکن جس شخص نے محبّ طبری کی کتاب (ریاض النضرۃ) دیکھی ہے وہ پہلی نظر میں سمجھ سکتا ہے کہ ان کی روایتوں کا کیا پایہ ہے'' [۸]

شبلی نے بعض واقعات ازالۃ الخفاء سے نقل کئے ہیں وہ کسی دوسری معتبر کتاب

میں نہیں مل سکے اس طرح کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر حضرت عمرؓ اور حضرت زبیرؓ نے ایک جگہ دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کو پسپا کیا، لیکن اس معرکہ میں ان کی عصر کی نماز فوت ہوگئی، حضرت عمرؓ نے اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا، آپؐ نے فرمایا کہ آج میں نے بھی عصر نہیں پڑھی'' اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد شبلی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ازالۃ الخفاء کے علاوہ کسی دیگر مستند کتاب میں مذکور نہیں ہے۔[9]

لیکن اس طرح کی تنقید صرف استثنائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی ازالۃ الخفاء سے بہت متأثر تھے۔ اگر چہ انہوں نے تقریباً چالیس جگہ باضابطہ حوالہ دیا ہے لیکن پوری کتاب پر ازالۃ الخفاء کے اثرات ہیں۔ خاص طور پر خاتمہ کتاب ازالۃ الخفاء کے زیر تأثر لکھا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ ازالۃ الخفاء کی ایک عبارت کی شرح ہے، شبلی نے آخر میں اس عبارت کو نقل کر دیا لکھتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ صاحب نے حضرت عمرؓ کی اس خصوصیت (یعنی جامعیت کمالات) کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، اور ہم اس سے اپنی کتاب کو ختم کرتے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔''

''سینہ فاروق اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن، کہ درہائے مختلف دارد۔ در ہر درے صاحب کمالے نشستہ در یک در مثلاً سکندر ذو القرنین باآں ہمہ سلیقہ ملک گیری وجہاں ستانی وجمع جیوش، وبرہم زدن اعداء، در در دیگر نوشیر وانے باآں ہمہ رفق ولین ورعیت پروری وداد گستری (اگر چہ ذکر نوشیرواں در مبحث فضائل حضرت فاروق سوء ادب است) ودر درِ دیگر امام ابو حنیفہ یا امام مالکے باآں ہمہ قیام بہ علم فتوی واحکام ودر درِ دیگر مرشدے مثل سید عبد القادر جیلانی یا خواجہ بہاؤ الدین ودر درِ دیگر محدثے بروزن ابو ہریرہ وابن عمر ودر درِ دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فرید الدین عطار ومردماں گردا گرد این خانہ ایستادہ اند وہر محتاج حاجت خود را از صاحب فن درخواست می نماید کامیاب می گردد۔[10]

☆☆☆

حواشی

۱۔ سراج الدین احمد: سیرۃ الفاروق

۲۔ شبلی نعمانی: الفاروق، دارالمصنفین طبع ۱۹۵۶، ص: ۱/۱۴

۳۔ الفاروق، ص: ۲/۱۹۰

۴۔ الفاروق، ص: ۲/۲۰۲

۵۔ الفاروق، ص: ۲/۲۰۹

۶۔ الفاروق، ص: ۲/۲۱۷

۷۔ الفاروق، ص: ۱/۱۹

۸۔ الفاروق، ص: ۲/۲۶۲

۹۔ الفاروق، ص: ۱/۴۵

۱۰۔ الفاروق، ص: ۲/۲۹۰۔۲۹۱

☆☆☆

الفاروق اور شاہ ولی اللہؒ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

تہذیب وعلم کی دنیا میں لین دین کی روایت بڑی مستحکم ہے۔ بعد والے اپنے اگلوں سے جو کچھ لیتے ہیں اس میں اپنا اضافہ کر کے اپنے جانشینوں کو دیتے ہیں۔ بیشتر صرف لین دین کے گماشتے اور کارندے ہوتے ہیں۔ لیکن چند اپنے اپنے زمانے اور وقت میں اسلاف کے ورثہ میں اپنے عطایا سے چار چاند لگانے والے بن جاتے ہیں۔ یہ عبقری شخصیات ہوتے ہیں جو آباء واجداد کے ورثہ میں ایسا منفرد، مفید اور مہتم بالشان اضافہ کرتے ہیں کہ خود حوالہ بن جاتے ہیں اور ان کے عطایا علمی وتہذیبی میراث کا جوہری حصہ جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہتا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۴/ شوال ۱۱۱۴/ ۲۱/ فروری ۱۷۰۳ء۔ ۲۹/ محرم ۱۱۷۶/ ۲۰/ اگست ۱۷۶۲) اگر چہ بارہویں/ اٹھارہویں صدی کے بہت متاخر عبقری تھے تاہم اسلامیات کے باب میں بالخصوص بعض دوسرے علوم وفنون میں بالعموم وہ بزرگ اسلاف کی مانند ناگزیر مفکر اور مؤلف بن گئے ہیں اور ان کی تالیفات حوالہ کے مراجع ومصادر۔ فکرِ اسلامی کی ہر شاخ میں ان کی انفرادیت وعبقریت کے آثار اتنی کثرت سے اور اتنے محققانہ ملتے ہیں کہ ان کے جانشینوں کیلئے ان سے احتراز واجتناب ان کی کم نظری کی دلیل بن جاتی ہے۔

ان کی وفات کے تقریباً ایک صدی کے اندر پیدا ہونے والے ایک دوسرے عبقری تھے: مولانا شبلی نعمانیؒ (ذوالقعدہ ۱۲۷۴/ مئی ۱۸۵۷۔ ۲۸/ ذوالحجہ ۱۳۳۲۔ ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴) جو اپنے علمی عطایا میں ایسی ہی انفرادیت وعبقریت کے حامل تھے۔ بالخصوص تاریخ رجال اسلام میں ان جیسا بلند پایہ تذکرہ نگار اور صاحب تحقیق ونظر گذشتہ صدی میں تو پیدا نہیں ہوا اور بقول ان کے ابھی کئی صدیوں تک ان کے عطایا بالخصوص سیرۃ النبی ﷺ اور الفاروق کا حریف

نہیں پیدا ہوگا۔ چودھویں صدی ہجری کے اس عبقری نے اپنے بارہویں صدی کے پیشر و عبقری سے الفاروق میں جو استفادہ کیا ہے اس نے جانشینِ قدر شناس کی علمی و تحقیقی دیانت پر اور سلفِ مکرم کی فکری و علمی جلالت پر مہرِ تصدیق و تحسین ثبت کردی۔

الفاروق میں شبلی نے شاہ ولی اللہ سے حصہ اول میں بہت معمولی استفادہ کیا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے البتہ حصہ دوم میں استفادہ شبلی کو معتد بہ کہا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب کی صرف دو کتابوں۔ ازالۃ الخفاء اور حجۃ اللہ البالغۃ۔ سے ان کی روایات، تبصرے اور تجزیے قبول کئے ہیں اور ان میں بھی اول الذکر سے زیادہ اور مؤخر الذکر سے کہیں کہیں۔ اور ایسا ہونا قرین قیاس ہی نہیں مطابق واقعہ ہے کیونکہ ازالۃ الخفاء حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت وکمالات کا نادر خزینہ ہے اور وہی الفاروقِ شبلی کا موضوع ومضمونِ گسترانہ۔ اگر چہ بیشتر مقامات پر شبلی نے تائید وتصدیق اور استناد کے لئے مواد ولی اللہی اخذ وقبول کیا ہے لیکن کہیں کہیں وہ تنقید وتغلیط کے فرض سے بھی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ کیونکہ محققین ومفکرین آنکھ بند کرکے اسلاف کرام کی پیروی نہیں کرتے، نہ عداوت ومخالفت میں حدِ اعتدال وانصاف سے گذرتے ہیں۔

حصہ اول بلکہ دیباچہ میں شبلی گرامی نے اصولِ تذکرہ وتاریخ نویسی پر بحث کی ہے۔ اپنے مآخذ ومصادر کی فہرست کے اواخر میں تحسین وتنقید کا امتزاج پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں ان (حضرت عمرؓ) کے فقہ اور اجتہاد پر اس مجتہدانہ طریقے سے بحث کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں .... '' (الفاروق ۱/۱۴) دوسرے حصہ میں اسی بات کو مزید منقح کیا ہے: ''مصنفِ ابن ابی شیبہ وغیرہ میں یہ مسائل منقول ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کی مدد سے فقہ فاروقی پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر ازالۃ الخفاء میں شامل کردیا ہے''۔ (الفاروق ۲/ ۲۱۷)

تحسین کے بعد تنقید شبلی بھی اسی ولی اللہی کتاب مستطاب سے متعلق ہے: ''..... ریاض النضرۃ للمحب الطبری میں بھی حضرت عمرؓ کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اسی کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے، لیکن اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں مذکور ہیں، اس لئے میں نے دانستہ اس سے احتراز کیا'' (الفاروق ۱/۱۴)

اپنے حوالہ کی کتابوں میں ان دونوں پر پھر تنقید کی ہے: ''جو کتابیں روایت کی حیثیت سے کم رتبہ ہیں مثلاً ازالۃ الخفاء اور ریاض النضرۃ وغیرہ ان کا جہاں حوالہ دیا ہے، اس بنا پر دیا ہے کہ خاص اس روایت کی تصدیق اور معتبر کتابوں سے کرالی گئی تھی'' (الفاروق ۱/ ۱۹) اہل ذمہ کے باب میں غیر معتبر روایات پر تنقید کرتے ہوئے پھر نقد شاہ سے کام لیا ہے: ''........افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی ان روایتوں کو قبول کرلیا ہے لیکن جس شخص نے محبّ طبری کی کتاب (ریاض النضرۃ) دیکھی ہے، وہ پہلی نظر میں سمجھ سکتا ہے کہ ان روایتوں کا کیا پایہ ہے، ان بزرگوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ عراق، مصر، شام، کا دفتر مالگذاری جس قدر تھا سریانی وقبطی وغیرہ میں تھا اور اس وجہ سے دفتر مالگذاری کے تمام عمال مجوسی یا عیسائی تھے........'' (الفاروق ۲/۲۶۲)

انتظام ورفاہِ عام

مولانا شبلی نے شاہ ولی اللہ کی بعض معلومات اور تجزیے حضرت عمر فاروقؓ کے انتظام وانصرام یا رفاہِ عام کے کاموں سے متعلق نقل کیے ہیں اور ان کی تصویب کی ہے۔ عمال کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کرنے کی حکمت فاروقی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ...... ''تنخواہیں علیٰ قدر مراتب بیش قرار تھیں، صوبہ داروں کی تنخواہ پانچ پانچ ہزار تک ہوتی تھی اور غنیمت کی تقسیم سے جو ملتا تھا، وہ الگ، چنانچہ امیر معاویہؓ کی تنخواہ ہزار دینار ماہوار یعنی پانچ ہزار روپے تھی'' اس کے لئے ابن عبدالبر کی الاستیعاب کے علاوہ ازالۃ الخفاء دوم، ۷۱ کا حوالہ حاشیہ میں دیا ہے۔ (الفاروق ۲/۳۴)

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان شاہراہ پر حضرت عمر فاروق نے ۱۷ھ کے حج کے بعد ''ہر ہر منزل پر چوکیاں اور سرائیں اور چشمے طیار'' کرائے اور شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء سے ایک پورا اقتباس نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

> ''ازان جملہ آنکہ سالے بقصد عمرہ بہ مکہ محترمہ توجہ فرمود ونزدیکِ مراجعت امر فرمود تادر منازلے کہ مابین حرمین واقع اند سایہا وبناہہا سازند وہر چاہے کہ اپناشتہ شدہ باشد آں را پاک کنند وصاف نمایند

ودر منازلِ کم آب چاہہا را کنند تا بر حجاج باستراحتِ تمام قطعِ مراحل میسر شود''

مولانا شبلی نے اس کا حوالہ حاشیہ میں نہیں دیا ہے۔ (الفاروق ۲/ ۷۶)

مذہبی تنظیم وتنسیق سے متعلق بعض بیاناتِ شاہ الفاروق میں منقول ہوئے ہیں اگرچہ انکے قدیم ترین مصادر ومراجع کا حوالہ ملتا ہے اور مولانا شبلی نے ان میں سے بعض کو بیان بھی کیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ولایات اور صوبوں میں عوام وخواص کی تعلیم۔ بالخصوص دینی تعلیم وتربیت۔ کے لئے متعدد اکابر صحابہ کو روانہ فرمایا تھا اور ہر ایک کو مخصوص علاقہ میں متعین کیا تھا یہ حکمت فاروقی کی دلیل تھی۔ مولانا شبلی نے تعلیم حدیث کے باب میں حکمت فاروقی اجاگر کرنے کیلئے شاہ صاحب کی عبارت نقل کی ہے: ''حضرت عمرؓ نے اگرچہ حدیث کی ترویج میں نہایت کوشش کی لیکن احتیاط کو ملحوظ رکھا اور یہ کہ ان کی دقیقہ سنجی کی سب سے بڑی دلیل ہے، وہ بجز مخصوص صحابہ کے عام طور پر لوگوں کو روایت حدیث کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''چنانکہ فاروق اعظم عبد اللہ بن مسعود را با جمعے بکوفہ فرستاد، ومعقل بن یسار وعبد اللہ بن معقل وعمران بن حصین را بہ بصرہ، وعبادہ بن صامت وابو درداء را بہ شام وبہ معاویہ بن ابی سفیان کہ امیر شام بود، قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیث ایشان تجاوز نکند'' (بحوالہ ازالۃ الخفاء جزء دوم صفحہ ۶، الفاروق ۲/ ۲۱-۱۲۰)

مولانا شبلی نے ایک دوسرے سیاق میں یہی اقتباس پورا کا پورا پھر نقل کیا ہے جو تعلیم حدیث ہی سے متعلق حکمت فاروقی کو اجاگر کرتا ہے۔ (الفاروق ۲/ ۲۰۱، بحوالہ ازالۃ الخفاء صفحہ ۶ حصہ دوم)

تعلیم قرآن مجید کی بابت مولانا شبلی نے حضرت شاہ صاحب کی روایات تو نقل نہیں کیں لیکن اس کی ترویج وترقی کے باب میں شاہ صاحب کا ایک مختصر تبصرہ ضرور نقل کیا ہے...... ''قرآن مجید کی حفاظت اور اس کی تعلیم وترویج.......... کے متعلق جو کوشش (حضرت عمر نے) کیں ان کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب نے نہایت صحیح لکھا کہ

''امروز ہر کہ قرآن میخواند از طوایف مسلمین منتِ فاروق اعظم در گردن اوست''

یہ بھی ازالۃ الخفاء کی عبارت ہے لیکن شبلی نے نہ تو کتاب کا نام لکھا ہے اور نہ ہی حصہ وصفحہ کا حوالہ دیا ہے (الفاروق ۲/۱۱۶)

فقہیات کا باب ازالۃ الخفاء میں سب سے زیادہ مفصل ہے ظاہر ہے کہ وہ شاہ ولی اللہؒ کا تحقیقی موضوع تھا جس پر وہ مدتوں سے لکھنے کی سوچ رہے تھے اور ازالۃ الخفاء کی تدوین وتالیف کے وقت جب ان کو موقعہ میسر آیا فقہ فاروقی پر پورا ایک رسالہ بلکہ ایک جامع کتاب تالیف کر کے اسی میں شامل کردی۔ مولانا شبلی نے سب سے زیادہ اسی سے متعلق افادات ولی اللہی نقل کئے ہیں اور ان کی وجہ بھی ظاہر باہر ہے۔ جستہ جستہ حوالوں اور اقتباسوں کے علاوہ مولانا مرحوم نے تعلیم فقہ سے متعلق مختلف اقتباسات ایک جگہ جمع کردئے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

''اس کی پوری تفصیل شاہ ولی اللہ صاحب نے نہایت خوبی سے لکھی ہے۔ ہم اس کے جستہ جستہ فقرے جو ہماری بحث سے متعلق ہیں اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

''مع ہذا بعد عزم خلیفہ بر چیزے مجال مخالفت نبود، در جمیع این امور شذر وندر نمی رفتند، وبدوں استطاع رائے خلیفہ کارے را مصمم نمی ساختند، لہذا درین عصر اختلافِ مذاہب وتشتت آراء واقع نشد، ہمہ بر یک مذہب وبر یک راہ مجتمع۔

چوں ایام خلافت خاصہ بالکلیہ منقرض شد، وخلافت عامہ ظہور نمود، علماء در ہر بلدے مشغول بافادہ شدند: ابن عباسؓ در مکہ فتویٰ می دہد، وعائشہ صدیقہؓ وعبد اللہ بن عمرؓ در مدینہ حدیث را روایت می نمایند، وابو ہریرہؓ اوقاتِ خود را براکثارِ روایت حدیث مصروف می سازد۔

بالجملہ درین ایام اختلافِ فتاویٰ پیدا شد، یکے را بر رائے دیگر اطلاع نہ، واگر اطلاع شدہ مذاکرہ واقع نہ، واگر مذاکرہ بمیان آمد ازاحتِ شبہ وخروج از مضیق اختلاف بفضائے اتفاق میسر نہ۔

اگر تتبع کنی روایت علماء صحابہ کہ پیش از انقراضِ خلافتِ خاصہ از عالم گذاشتہ اند بغایت کم یابی۔ وجمعی کہ بعد ایام خلافت ماندہ اند ہرچہ روایت کردہ اند، بعد ایام خلافت

روایت کردہ اند۔

ہر چند جمیع صحابہ عدول اند و روایت ایشان مقبول و عمل بموجب آنچہ بروایت صدوق ازیشاں ثابت شود لازم، اما درمیان آنچہ از حدیث وفقہ در زمن فاروق اعظم بود، وآنچہ بعدوے حادث شدہ فرق مابین السمٰوات والارض است۔'' (ازالۃ الخفاء، دوم ص: ۱۴۰ بحوالہ الفاروق ۲/ ۲۶۔ ۱۲۵) (آخری پیراگراف مولانا شبلی نے دوبارہ عہد فاروقی میں قلتِ روایات مگران کے بلند پایہ ہونے کے باب میں نقل کیا ہے: الفاروق ۲/ ۲۰۹)

ازالۃ الخفاء کا یہ طویل اقتباس تعلیم فقہ سے زیادہ روایتِ احادیثِ نبوی اور اختلافِ فقہائے اسلام اوران کے زمانی معیار واعتبار سے متعلق ہے۔ وہ اتفاقِ امت اور اختلافِ مذاہب کے بنیادی اسباب کوبھی اجاگر کرتا ہے۔شاہ ولی اللہؒ کے بنیادی نکات سے مولانا شبلی کوکلی اتفاق ہے۔اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خلیفۂ اسلام حضرت عمر فاروقؓ کے عزم بالجزم کی بنا پر تمام امور میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔

۲۔ عمر فاروقؓ کی اجازت کے بغیر کوئی کام مصمم طور سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔اگر حالات زمان ومکان کے جبر سے کوئی کام انجام دے بھی لیا گیا تو خلیفۂ اعظم کی مہر تصدیق لازمی تھی ورنہ کام القط۔

۳۔ لہٰذااس عہدِ میمنت میں مذاہب کا اختلاف ہوا، نہ آراء فقہیہ میں رنگارنگی آئی۔ نتیجتاً سب لوگ ایک فقہی مذہب پر متفق اورایک راہِ مذہب پر قائم ودائم رہے۔

۴۔ خلافتِ خاصہ کے مبارک زمانہ کے پورے طور سے خاتمہ کے بعد جب خلافتِ عامہ کا ظہور ہوا تو علماء کرام ہر شہر وعلاقہ میں افادہ میں، تعلیم وتربیت یا فتاویٰ دینے میں مشغول ہوگئے:

(ا) حضرت عبداللہ بن عباس مکہ میں فتویٰ دیتے تھے۔

(ب) حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن عمر مدینہ میں حدیث روایت کرتے تھے۔

(ج) حضرت ابو ہریرہ روایتِ حدیث زیادہ سے زیادہ کرنے میں اپنے اوقات لگاتے تھے۔

۵۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں فتاویٰ کا اختلاف ظاہر ہوا۔ پھر ایک مفتی کو دوسرے کی خبر نہ تھی اور اگر خبر تھی تو باہم مذاکرہ وتبادلہ خیال نہ ہوا اور اگر تبادلہ خیال ہوا بھی تو شبہات کا ازالہ نہ ہوا اور اختلاف کی تنگنائے سے اتفاق کی فضائے بسیط میں آنا نصیب نہ ہوا۔

۶۔ اگر تحقیق وتلاش کی جائے کہ خلافتِ خاصہ کے عہد سے قبل وفات پانے والے صحابہ علماء کی روایات کتنی ہیں تو وہ بہت کم ملیں گی۔ روایات کی قلت ضرور ہوئی مگر ان کا پایۂ اعتبار بلند تھا اور بقول شبلی "وہ ہر قسم کے احتمالات سے بیداغ تھیں"

۷۔ خلافت خاصہ کے بعد باقی رہ جانے والی جماعتِ صحابہ نے جو کچھ روایت کیا وہ خلافتِ خاصہ کے عہد کے بعد ہی کیا اس دور میں "احادیث کو بہت وسعت ہوگئی لیکن اعتماد اور قوت کا وہ پایہ نہ رہا"

۸۔ ہر چند کہ تمام صحابہ عادل ترین (عدول) ہیں اور ان کی روایات مقبول، اور جو کچھ رسول اکرم ﷺ سے ان کی روایت ثابت ہے اس پر عمل بھی لازم وواجب ہے تاہم حضرت فاروق اعظم کے زمانے میں جو کچھ ان کے پاس سرمایۂ حدیث وفقہ تھا اس میں اور جو کچھ بعد میں ظہور میں آیا اس میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

مولانا شبلی نے الفاروق میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اس قیمتی تحلیل وتجزیہ کو تاریخی روایات اور تجزیاتی مطالعات سے پختہ تر، مستحکم تر اور مدلل ترین بنایا ہے۔ تعلیم فقہ اور فتویٰ نویسی کے باب میں مولانا مرحوم نے حضرت عمر فاروق اعظم کی حکمت عملی بدلائل لکھی ہے کہ ہر شہر وعلاقہ میں "منتخب روزگار فقہاء صحابہ" متعین کیے گئے تھے۔ (الفاروق ۲/ ۶۰۔ ۵۹)

ازالۃ الخفاء ہی کے حوالے سے مؤلف الفاروق نے خلافتِ فاروقی کے طریقہ وروش اور حکمتِ عملی واضح کیا کہ "عام اجازت نہ ہو، بلکہ خاص خاص قابل لوگ افتاء کے لئے

نامزد کردئے جائیں تاکہ ہر کس وناکس غلط مسائل کی ترویج نہ کرسکے، حضرت عمرؓ نے اس تخصیص کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ جن لوگوں کو انہوں نے افتاء کی اجازت دی مثلاً حضرت علی، حضرت عثمان، معاذ بن جبل، عبد الرحمٰن بن عوف، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو ہریرہ اور ابودرداء وغیرہ ان کے سوااور لوگ فتوے دینے کے مجاز نہ تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب۔ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں:

''سابق وعظ وفتوی موقوف بود، بر رائے خلیفہ بدون امر خلیفہ وعظ نمی گفتند، وفتویٰ نمی دادند، وآخر بغیر توقف بہ رائے خلیفہ وعظ می گفتند وفتویٰ می دادند''

تاریخوں میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جن لوگوں کوفتویٰ کی اجازت نہ تھی انہوں نے فتوے دیئے تو حضرت عمر نے ان کو منع کردیا۔ چنانچہ ایک دفعہ عبداللہ بن مسعود کے ساتھ بھی یہ واقعہ گذرا۔ بلکہ ان کو یہاں تک احتیاط تھی کہ مقرر شدہ مفتیوں کی بھی جانچ کرتے رہتے تھے (حضرت ابو ہریرہ کا باقاعدہ امتحان لیا اور صحیح فتوی پر آئندہ کے لئے مجاز کیا۔ الفاروق ۲/ ۶۵۔۶۴ بحوالہ مسند دارمی وازالۃ الخفاء، ص: ۱۳۰)

مؤلفِ الفاروق کا ایک نظریۂ کمال یہ ہے کہ'' فقہ کا فن تمامتر حضرت عمر کا ساختہ پرداختہ ہے'' (الفاروق ۲/ ۲۱۰) اور اسی سے متصل دوسرا نظریہ یہ ہے کہ''فقہ کے جس قدر سلسلے آج اسلام میں قائم ہیں سب کا مرجع حضرت عمر کی ذاتِ بابرکات ہے'' کیونکہ تمام فقہی مراکز۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، شام۔ اور''ان کے فقہ کے بڑے بڑے شیوخ اور بانی فن'' جیسے حضرات عبداللہ بن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابو درداءؓ، معاذ بن جبلؓ اور حضرت علیؓ سب کے سب سوائے حضرت علیؓ کے حضرت عمرؓ ہی کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے اور فنِ فقہ میں ان کے پروردہ اور تعلیم یافتہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ عمرؓ کے ساتھ ایک ساعت کا بیٹھنا میں سال بھر کی عبادت سے بہتر جانتا ہوں'' (الفاروق ۲/ ۲۱۱ بحوالہ ازالۃ الخفاء ۲۱۹ حصہ اول واستیعاب)

فتویٰ دینے پر قدغن اور مفتیوں کی قلت تعداد کا حوالہ عہد نبوی اور دورِ صدیقی میں

بھی ملتا ہے۔ گویا کہ یہ کارِ نبوت اور طریقِ نبوی کا تعامل وتسلسل تھا جو عہدِ فاروقی میں بھی جاری رہا۔ مولانا شبلی نے ان روایات پر کہ عہدِ نبوی میں صرف چار حضرات فتویٰ دیتے تھے یا چھ صحابہ کرام مفتی تھے بحث کرتے ہوئے ایک اور نظریہ ایجاد کیا کہ مفتیوں میں دو طرح کے طبقات تھے۔ عام مسائل میں زیادہ حضرات فتوے دیتے یا علمی آراء سے آگاہ کرتے تھے لیکن اجتہاد واستنباط پر مبنی فتاویٰ دینے کے مجاز صرف چھ حضرات ہی تھے کیونکہ اس کے لئے صرف احادیث کا جاننا کافی نہیں فقہِ حدیث کا ماہر ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر یہ چھ حضرات "فن کے بانی اور امام تھے" شاہ ولی اللہ دہلوی نے صرف چار صحابہ کرام۔ عمرؓ وعلیؓ وابن مسعودؓ وابن عباسؓ۔ تک مجتہدین صحابہ کی تعداد محدود کردی ہے۔ مؤلف الفاروق نے حجۃ اللہ البالغہ سے اپنی بات کو یوں مدلل کیا ہے:

"واماغير هؤلاء الاربعة فكانوا يرون دلالة ولكن ما كانوا يميزون الركن والشرط من الآداب والسنن ولم يكن لهم قول عند تعارض الاخبار وتقابل الدلائل الا قليلا كابن عمر وعائشة وزيد بن ثابت ...."

یعنی ان چار کے سوا باقی جو لوگ تھے وہ مطالب سمجھتے تھے لیکن آداب وسنن اور ارکان وشرائط میں امتیاز وتفریق نہیں کرسکتے تھے۔ اور جہاں حدیثیں متعارض ہوتی تھیں۔ اور دلائل میں تقابل ہوتا تھا وہاں وہ (بجز بعض بعض موقعوں کے) دخل نہیں دیتے تھے، مثلاً ابن عمر، عائشہ، زید بن ثابت" (الفاروق ۲/ ۱۳۔۲۱۲ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ ۱۳۷)

آخری جملے کا ترجمہ زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعارض روایات اور تقابل دلائل کے معاملہ میں ان کے پاس کوئی قول نہیں ہوتا تھا سوائے بعض حضرات کے جن میں ابن عمر، عائشہ اور زید بن ثابت شامل تھے۔

مجتہدین صحابہ اور فقہاء عہدِ فاروقی کی تعلیم وتربیت میں حضرت عمر فاروق کے کردار

سے شبلی مرحوم نے بہت مفصل ومدلل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ سب کے سب حضرت عمر کے پروردہ تھے۔ اور ان میں سے بعض بزرگوں کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبلؓ کو خود حضرت عمر نے تعلیم وروایت کے لئے شام بھیجا تھا لیکن ان کا ۱۸ھ میں انتقال ہوگیا اس جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے: ''حدیث او چندان باقی نماند۔'' عبد اللہ بن مسعود اورابو موسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے خاص شاگردوں میں تھے۔ ابوموسیٰ اشعری کو حضرت عمر اکثر تحریر کے ذریعہ حدیث وفقہ کے مسائل تعلیم کرتے رہتے تھے۔ زید بن ثابت بھی دراصل حضرت عمر کے مقلد تھے۔شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں: ''وزید بن ثابت نیز در اکثر متبع اوست'' (الفاروق ۲/ ۲۱۴ بحوالہ ازالۃ الخفاء ۸۱ و ۸۳ بالترتیب حصہ دوم) فتوحاتِ فاروقی کی وسعت کے نتیجہ میں بہت سے لوگ اور علاقے اسلام میں داخل ہوئے اور اسی اعتبار سے نت نئے، مسائل پیدا ہوتے گئے۔ بلادِ اسلامی کے مفتیان کرام ان سے نمٹتے اور جب مشکل سے دو چار ہوتے تو حضرت عمرؓ سے رجوع کرتے۔''فتوی پوچھنے والوں میں ....عبد اللہ بن مسعو، عمار بن یاسر، ابوموسیٰ اشعری، ابوعبیدہ بن جراح، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ شامل تھے۔ حضرت عمر اگر چہ خود بہت بڑے فقیہ تھے اور تنہا ان کی رائے بھی فتوی کے لئے کافی ہوسکتی تھی تاہم احتیاط کے لئے وہ اکثر مسائل کو عموماً صحابہ کی مجلس میں پیش کرتے تھے اور ان پر نہایت آزادی اور نکتہ سنجی کے ساتھ بحثیں ہوتی تھیں......شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

كان من سير ة عمر انه كان يشاور الصحابة ونيا ظرهم حتى تنكشف الغمة وياتيه الثلج، فصار غالب قصاياه وفتاواه متبعة فى مشارق الارض ومغاربها.......

حضرت عمر کی عادت تھی کہ صحابہ سے مشورہ اور مناظرہ کرتے تھے یہاں تک کہ پردہ اٹھ جاتا تھا اور یقین آجاتا تھا۔اسی وجہ سے حضرت عمر کے فتووں کی تمام مشرق ومغرب میں پیروی کی گئی''۔ (الفاروق ۲/ ۲۱۶ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ بلا قید جزء وصفحہ)

مولانا شبلی حضرت عمر کے اجماعی فتاویٰ سے مزید بحث کرتے ہوئے لکھا

ہے کہ'' ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے تقریباً ہزار مسئلے ایسے ہیں جو فقہ کے مقدم اور اہم مسائل ہیں اور ان تمام مسائل میں ائمہ اربعہ نے ان کی تقلید کی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں: ''وہمچنیں مجتہدین در این مسائل فقہ تابع مذہب فاروق اعظم اند واین قریب ہزار مسئلہ باشد تخمیناً.......'' (الفاروق ۲/ ۲۱۷ بحوالہ ازالۃ الخفاء حصہ دوم ۸۴؛ نیز الفاروق ۲/ ۲۲۶

اجماعی فتاویٰ فاروقی اور صحابہ کرام سے فقہی مشاورت کا بیان قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج سے مزید مدلل کرنے کے بعد سارق (چور) کی حد پر مشورہ کیا اور صحابہ کا اجماع حاصل کیا۔ لیکن اس سے زیادہ مشکل اورزیادہ اہم مسئلہ غسل جنابت کا تھا صحابہ کرام میں اس بابت اختلاف ہوا تو ''تمام مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور یہ مسئلہ پیش کر کے سب سے رائے طلب کی۔ لوگوں نے مختلف رائیں دیں۔ اس وقت فرمایا: انتم اصحاب بدر وقد اختلفتم فمن بعد کم اشد اختلافا یعنی جب آپ لوگ اصحاب بدر میں ہو کر آپس میں مختلف الرائے ہیں تو آئندہ آنے والی نسلوں میں اور سخت اختلاف ہوگا۔ چنانچہ ازواج مطہرات سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا اور ان کی رائے قطعی قرار پا کر شائع کی گئی۔'' مولانا مرحوم نے یہ متفقہ فیصلہ ازالۃ الخفاء کے حوالے سے لکھا ہے (الفاروق ۲/ ۱۲۳)

شاہ ولی اللہ دہلوی اور بعض دوسرے معتبر مآخذ کی بنیاد پر مؤلف الفاروق نے عہدِ فاروقی کے ایک مستقل وغیر مبدل طریقے پر بحث کی ہے کہ خلیفہ دوم فقہاءِ امصار اور مفتیانِ بلاد کی ہدایت ورہنمائی کے لئے اپنے دار الخلافہ سے نئے پیش آنے والے مسائل وامور کے باب میں فتاویٰ اور فقہی فیصلے ارسال فرماتے رہتے تھے۔ ان فتاویٰ خلیفہ پر تمام فقہاء صحابہ، مفتیان کرام اور قضاۃ بلاد اور عوام وخواص سب کو عمل کرنا لازمی تھا۔ وہ محض انفرادی فتاویٰ نہ تھے۔ بلکہ وہ سب سے بڑے فقیہ (افقہ امت) تھے، وہ قرآن مجید کے ناسخ منسوخ کے سب سے بڑے عالم تھے اور سب سے بڑے امام وقت بھی۔ شاہ صاحب کی ازالۃ الخفاء اور دوسری کتب مثلاً استیعاب، کنز العمال اور اخبار القضاۃ وغیرہ کی بنا پر فقہِ عمر فاروقؓ کو مرتب کیا جا سکتا ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں اس کا ایک نقش اول بطور نمونہ شامل کر دیا

ہے۔اس فقہِ فاروقی کو اصلاً قانون فاروقی یا قانونِ اسلامی قرار دینا چاہئے کہ وہ امت اسلامی اور صحابہ کرام کا اجماعی قانون تھا جو سب کیلئے ناگریز تھا۔ (الفاروق ۲/ ۶۰۔۵۹ نیز ۲/ ۵۸۔۵۴ ومابعد، نیز۲/ ۲۱۰ ومابعد)

الفاروق کے مؤلفِ علام نے متعدد مسائل وفتاویٰ کا ذکر بھی کیا ہے جو حضرت عمر فاروق نے فقہاء امصار کو بھیجے تھے۔ان میں سے بعض کو شاہ ولی اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ۱۴ھ/ ۶۳۵ء میں نماز تراویح کی جماعت کے ساتھ قیام کے علاوہ زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام مفصل لکھ کر ابو موسیٰ اشعری اور دیگر افسرانِ ملکی کے پاس بھیجے۔اس تحریر کا عنوان جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے امام مالک کے حوالے سے نقل کیا ہے یہ تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: ''**ھذا کتاب الصدقة** الخ'' ایسے متعدد مسائل کا بیان دوسرے مآخذ کی بنیاد پر بھی کیا ہے۔ (الفاروق ۲/ ۱۲۲ ومابعد)

الفاروق کے مؤلفِ گرامی کا یہ بھی پختہ یقین ہے کہ اصولِ فقہ یعنی مسائل کی تفریع واستنباط کے اصول وضوابط بھی حضرت عمر فاروق نے مدون ومرتب کرنے کی داغ بیل ڈالی تھی ''سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ سے جو اقوال وافعال منقول ہیں وہ کلیۃً مسائل کا مآخذ ہو سکتے ہیں یا ان میں کوئی تفریق ہے۔شاہ ولی اللہ صاحب نے اس بحث پر حجۃ اللہ البالغہ میں ایک نہایت مفید مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے جو افعال اور اقوال مروی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو منصبِ نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ: **ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا** یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے وہ لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز ہو۔ دوسرے وہ جن کو منصبِ رسالت سے تعلق نہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

انما انا بشر اذا امرتکم بشیٔ من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشیٔ من رائی فانما انابشر

یعنی میں آدمی ہوں۔اس لئے جب میں دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اس کو لو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔اس کے بعد شاہ ولی للہ صاحب لکھتے

ہیں کہ آنحضرتؐ نے طب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا، یا جو افعال آنحضرتؐ سے عادۃً صادر ہوئے، نہ عادۃ اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً، یا جو باتیں آنحضرتؐ نے مرغوبات عرب کے موافق بیان کیں مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث، یا جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے موافق اختیار کیں مثلاً لشکر کشی اور اس کے بہت سے احکام، یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ (الفاروق ۲/ ۱۸۔۲۱۷ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ ۱۳۳) مولانا شبلی نے اس کے معاً بعد ایک دوسرا اسی سے وابستہ اصول بیان کیا ہے کہ ''شاہ ولی اللہ صاحب نے احادیث کے مراتب میں جو فرق بتایا ہے اور جس سے کوئی صاحبِ نظر انکار نہیں کرسکتا، اس تفریق مراتب کے موجد دراصل حضرت عمر ہیں'' اور صحیح بخاری کے حوالہ سے اسے مدلل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے عبد اللہ بن ابی کے جنازہ پر نماز پڑھنی چاہی تو حضرت عمر نے کہا: آپ منافق کے جنازہ پر نماز پڑھتے ہیں'' مولانا مرحوم نے اس موقعہ پر نہیں لکھا کہ رائے عمر کے موافق وحی الٰہی بھی آئی تھی۔ البتہ بہت سے دوسرے اقوال اختلافی اور فتاوی عمری کا واضح ذکر کیا ہے۔ (الفاروق ۲/ ۱۹۔۲۱۸ ومابعد۔ آگے صفحہ ۲۲۰ پر وحی الٰہی سے موافقات فاروقی کا مختصر حوالہ موجود ہے)

مراتبِ احادیث کا علم دراصل تفقہِ حدیث کے ملکہ پر مبنی ہے۔ مولانا شبلی نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالے سے سنتِ عادی اور سنتِ تعبدی کا فرق واختلاف اور اطلاق وانطباق میں ان کے مدارج کو بخوبی بیان کیا ہے۔ اور مثالوں سے ان کو مدلل کرنے کے بعد ایک بحث یہ چھیڑی ہے کہ فاروقِ اعظم نے احادیث نبوی کی تحقیق وتدقیق اور اشاعت وتبلیغ میں تو سعی بلیغ کی مگر خود روایت حدیث میں زیادہ حصہ نہیں لیا'' چنانچہ کل وہ مرفوع احادیث جو ان سے مروی ہیں ستر سے زیادہ نہیں'' اس خیال یا تبصرہ کو صحیح ماننے کے باوجود وہ محدثین کا ایک مسلمہ اصول بیان کرتے ہیں کہ ''صحابی جب کوئی ایسا مسئلہ بیان کرے جس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہیں تو گو وہ رسول اللہ ﷺ کا نام نہ لے لیکن مطلب یہی ہوگا کہ اس نے رسول اللہؐ سے سنا ہے۔ اور واقع میں یہ اصول بالکل عقل کے مطابق ہے'' مولانا مرحوم مزید فرماتے ہیں کہ ''اس اصول کی بنا پر حضرت عمرؓ نے خطبوں میں'' تحریری ہدایتوں میں، فرامین میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق جو اصولی مسائل بیان کئے وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ

کے احکام ہیں گو انہوں نے آنحضرت ﷺ کا نام نہ لیا ہو"۔

"شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: ہفتم آن کہ مضمونِ احادیث در خطبِ خود ارشاد فرمانید تا اصل حدیث بآں موقوف خلیفہ قوت یابد یا ر اینکہ بغور سخن نمی رسند در بند آن کہ در متفق علیہ از حضرت صدیق نشد مگر شش حدیث، واز فاروق اعظم بہ صحت نرسید مگر قریب ہفتاد حدیث۔ این رانمی فہمند ونمی دانند کہ حضرت فاروق تمام علم حدیث را اجمالاً تقویت دادہ واعلانِ نمودہ" (الفاروق،۲،۲۰۲)

"احادیث میں فرقِ مراتب" پیدا کرنا حضرت فاروق اعظم کی فضیلت کا اصلی کارنامہ ہے۔ انہوں نے الاہم فالاہم کے اصول کے تحت "تمام تر توجہ ان احادیث کی روایت اور اشاعت پر مبذول کی جن سے عبادات یا معاملات یا اخلاق کے مسائل مستنبط ہوتے تھے۔ جو حدیثیں ان مضامین سے الگ تھیں ان کی روایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا۔ اس میں ایک بڑا نکتہ یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے وہ اقوال وافعال جو منصبِ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ جو بشری حیثیت سے ہیں باہم مخلط نہ ہونے پائیں شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"باستقراء تام معلوم شد کہ فاروق اعظم نظرِ دقیق وتفریق میانِ احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع وتکمیل افراد بشر تعلق دارد، از غیر آں مصروف می ساخت۔ لہذا احادیث شمائل آنحضرت ﷺ واحادیث سننِ زوائد در لباس وعادات، کمتر روایت می کرد بدو وجہ: یکے آنکہ لہٰذا از علوم لطیفیہ وشرعیہ نیست وتحمل کہ چوں اہتمام تام بروایت آں بکار برند۔ بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدی مشتبہ گردد۔" (الفاروق ۲/۳۔۲۰۲ بحوالہ ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص:۱۴۱)

مولانا شبلی اسی نکتہ پر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ " حضرت عمرؓ نے ان حدیثوں کی روایت کا بھی اہتمام نہیں کیا جن میں الفاظ مخصوصہ کے ساتھ دعائیں منقول تھیں، حالانکہ بہت سے بزرگوں کی روایتوں میں بڑا دفتر اسی قسم کی حدیثوں کا ہے اس کی وجہ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس بات کو جانتے تھے کہ دعا کے قبول وعدم قبول کا مدار

خلوص وتضرع پر ہے نہ کہ الفاظ پر۔" (الفاروق ۲/ ۲۰۳ بحوالہ ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص: ۱۴۱)

فقہِ حدیث نے فقہ کے فن کو جنم دیا اور اس کے اصول کو بھی۔ مؤلفِ الفاروق نے ان دونوں فنون کے آغاز کی حقیقت حضرت عمر فاروقؓ کے تفقہ حدیث میں تلاش کی ہے اور اس کو دوسرے معتبر وقدیم محققینِ فنون کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالے سے بھی مدلل کیا ہے۔ ان میں بعض کا ذکر اوپر مراتبِ احادیث وغیرہ کے بحث میں آچکا ہے۔ دوسرے اصولِ فقہ میں ایک قیاس کا اصول ہے جسے بالعموم حضرت معاذ بن جبلؓ کی مشہور حدیث کی بناپر ثابت کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نے قیاس کی دو لازمی شرائط کا جو اصولیین کی مقرر کردہ ہیں حضرت عمرؓ کے ایک فرمان میں سراغ لگایا ہے۔ اصولِ شروط میں سے اول یہ ہے کہ قیاس پر مبنی مسئلہ کے لئے کوئی نص نہ ہو اور دوسری یہ ہے کہ "مقیس اور مقیس علیہ میں علت مشترک ہو۔" شاہ ولی اللہ نے امام دارقطنی کے حوالے سے ایک فرمانِ فاروقی کا متن نقل کیا ہے جو حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام قضاء کے بارے میں بھیجا گیا تھا۔ اس میں الفاظ فاروقی یوں منقول ہیں:

"**الفهم الفهم فيما يختلج فى صدرک مما لم يبلغک فى الكتاب والسنة۔ واعرف الامثال والاشباه، ثم قس الامور عند ذلک**"

جو چیز تم کو قرآن وحدیث میں نہ ملے اور تم کو اس کی نسبت شبہ ہو اس پر غور کرو اور خوب غور کرو، اس کے ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو دریافت کرو، پھر ان سے قیاس کرو۔"

(الفاروق ۲/ ۲۲۴-۲۲۲ بحوالہ ازالۃ الخفاء، ص: ۸۶)

مولانا شبلیؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کے ایک دوسرے مقولہ۔ حکیمانہ قول۔ ایک اور اصولِ حدیث اور اصولِ فقہِ حدیث وضع کرلیا ہے، لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ "اکثر کہا کرتے تھے:

لا تنظروا الى صلوٰة امرء ولا صيامه ولكن انظروا الى عقله وصدقه

یعنی آدمی کی نماز وروزہ پر نہ جاؤ بلکہ اس کی سچائی اور عقل کو دیکھو

ایک دفعہ ایک شخص نے ان کے سامنے کسی کی تعریف کی۔ فرمایا کہ تم سے کبھی

معاملہ پڑا ہے۔اس نے کہا نہیں۔ پوچھا: کبھی سفر میں ساتھ ہوا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔فرمایا کہ تو تم وہ بات کہتے ہو جو جانتے نہیں۔احادیث کے باب میں بڑی غلطی جو لوگوں سے ہوئی تھی یہی تھی کہ اکثر محدثین جس شخص کو ظاہر میں زاہد و پارسا دیکھتے تھے ثقہ سمجھ کر اس سے روایت شروع کردیتے تھے ....'' (الفاروق ۲/ ۵۹۔۲۵۸ یہ'' قول (تعریف والا) ازالۃ الخفاء حصہ دوم صفحہ ۱۹۷ میں نقل کیا ہے۔'')

مولانا شبلی نے اگرچہ حضرت عمر فاروق کی مذہبی زندگی کے بارے میں بالخصوص نماز کے تعلق سے دو واقعات شاہ صاحب کے اعتبار و سند پر نقل کئے ہیں لیکن اس سے مسائلِ فقہ کا استنباط بھی کیا ہے۔''ایک دفعہ اقامت ہو چکی تھی اور صفیں درست ہو چکی تھیں کہ ایک شخص صف سے نکل کر انکی طرف بڑھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے........بعض اوقات جہاد وغیرہ کے اہتمام میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ نماز میں بھی وہی خیال بندھا رہتا تھا۔خود ان کا قول ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور فوجیں تیار کیا کرتا ہوں۔ایک اور روایت ہے کہ میں نے نماز میں بحرین کے جزیرہ کا حساب کیا۔ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے۔یہ آیت:'' فلیعبدوا رب ھذاالبیت'' آئی تو کعبہ کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔شاہ ولی اللہ صاحب نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ نماز میں اس قدر اشارہ کرنا جائز ہے۔............ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کی ہے کہ مرنے سے دو برس پہلے متصل روزے رکھنے شروع کئے تھے لیکن انہیں کی یہ روایت بھی ہے کہ ایک شخص کی نسبت سنا کہ صائم الدھر ہے تو اس کے مارنے کیلئے درّہ اٹھایا'' (الفاروق ۲/ ۶۰۔۲۵۹ بحوالہ ازالۃ الخفاء، بحوالہ مصنف بن ابی شیبہ ص: ۹۰، ص: ۹۳، حصہ دوم ص: ۹۵ ایضا، ص: ۱۰۲)

مؤلف الفاروق نے حضرت عمرؓ کی مذہبی زندگی کے متعدد واقعات و روایات شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء سے نقل کی ہیں۔ وہ ان کے ذاتی عمل کے ساتھ ان کی فقہی روش اور اجتماعی سماجی بصیرت کی بھی آئینہ دار ہیں اور اس اعتبار سے ان سے مسائل فقہیہ کا استنباط کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ان میں بعض واقعات و روایات کا تعلق عیسائی رعایا اور اہلِ ذمہ سے ان کے تعلقات و روابط سے ہے۔ ان کو فقہاء و محدثین نے اپنے فقہی ابواب و مسائل کے تحت

روایت کیا ہے۔

"..........امام بخاری اور امام شافعی نے روایت کی ہے کہ: توضأ من ماء فی جرّ نصرانیة یعنی حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی عورت کے گھڑے کے پانی سے وضو کیا۔ بغوی کی روایت اس سے زیادہ صاف ہے: توضأ عمر من ماء فی جر نصرانیة .... بغوی نے حضرت عمر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عیسائی جو پنیر بناتے ہیں اس کو کھاؤ......حضرت عمرؓ نے معاہدات میں یہ قاعدہ داخل کردیا تھا کہ جب کسی مسلمان کا گذر ہوتو عیسائی اس کو تین دن مہمان رکھیں.......حضرت عمر کا یہ حال تھا کہ مرتے مرتے بھی عیسائی اور یہودی رعایا کو نہ بھولے چنانچہ ان کی نسبت رحم اور ہمدردی کی جو وصیت کی وہ صحیح بخاری و کتاب الخراج وغیرہ میں مذکور ہے۔شاہ ولی اللہ صاحب نے اس امر کو حضرت عمر کے محاسن وفضائل میں شمار کیا ہے کہ وہ اہل ذمہ (یعنی وہ عیسائی اور یہودی جو مسلمانوں کے ملک میں رہتے تھے) کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے خاص الفاظ یہ ہیں: "وازاں جملہ آنکہ باحسان اہل ذمہ تاکید فرمود" (الفاروق ۲/ ۲۶۱ بحوالہ ازالۃ الخفاء، ص: ۸۸ جلد دوم، ص: ۱۳۸، صفحہ ۳۷ جلد دوم بالترتیب تمام حوالے ازالۃ الخفاء سے ہیں)

صاحبِ الفاروق نے اس بابِ خاص میں شاہ صاحب پر نقد بھی کیا ہے:" محبّ طبری وغیرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر اپنے افسروں کو عیسائیوں کے ملازم رکھنے سے بہت منع کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی ان روایتوں کو قبول کرلیا ہے۔ لیکن جس شخص نے محبّ طبری کی کتاب (ریاض النضرۃ) دیکھی ہے وہ پہلی نظر میں سمجھ سکتا ہے کہ ان روایتوں کا کیا پایہ ہے....."مولانا شبلی نے اس کے بعد ثابت کیا ہے کہ عراق، مصر، شام کے دفتر مالگذاری کے تمام عمّال مجوسی یا عیسائی تھے کیونکہ وہ سریانی یا قبطی وغیرہ میں تھا۔ (الفاروق ۲/ ۲۶۲ بحوالہ کتاب الخراج وانساب الاشرف وغیرہ)

اگر چہ مولانا شبلی نے ایک صحابی کی شراب نوشی کے واقعہ کو حضرت عمرؓ کی "علمی صحبتوں" کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے اور مفسرینِ کرام تفسیرِ قرآن کے ضمن میں بیان کرتے ہیں تاہم وہ واقعہ قرآن مجید سے استنباطِ احکام کے ذیل میں آتا ہے اور اس اعتبار

سے فقہی مسئلہ بن جاتا ہے۔ واقعہ مختصر طور سے یہ ہے کہ ایک مہاجر صحابی شراب نوشی کے جرم میں پکڑے آئے تو انہوں نے قرآن مجید کی سورہ کی آیت کریمہ "**لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصٰلحات جناح فیما طعموا**" (یعنی جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کئے انہوں نے جو کچھ کھایا (پیا) ان پر الزام نہیں) سے استدلال کیا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بدر، خندق، حدیبیہ اور دیگر غزوات میں ساتھ رہے ہیں اس لئے اس آیت کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔ حضرت عمر کی ایماء سے حضرت عبداللہ بن عباس نے بتایا کہ یہ معافی پچھلے زمانے سے متعلق ہے اور شراب کی تحریم کی آیت کریمہ: **یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ**" کے بعد شراب نوشی قابلِ مواخذہ ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت ابن عباس کی تصدیق فاروقی اور خطا کار صحابی کی سزایابی کا ذکر نہیں کیا لیکن وہ مراجع سے ثابت ہے۔ (الفاروق ۲/ ۶۴-۲۶۳ بحوالہ ازالۃ الخفاء وبروایت حاکم، ص: ۲۱۳) شاہ صاحب کے حوالے سے بخاری کی روایت اسی ضمن میں نقل کی ہے کہ "حضرت عمر کے اہل مجلس اور اہل مشورت علماء تھے خواہ بوڑھے ہوں یا جوان" اور شاہ صاحب کا جملہ نقل کیا ہے: "**کان مجلس عمر مغتصا فی القراء**" اور تبصرہ کیا ہے کہ "فقہ کا بہت بڑا حصہ جو منقح ہوا اور فقہ عمری کہلاتا ہے انہی علمی مجلسوں کی بدولت ہوا" حضرت عبداللہ بن عباس کی کمسنی کے باوجود ان کو شریک مجلس ومذاکرہ کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی، تربیت اور تفقہ میں کردار فاروقی کا ذکر بھی شاہ صاحب کے حوالہ سے کیا ہے (الفاروق ۲/ ۲۶۴ بحوالہ ازالۃ الخفاء، ص: ۱۱۹، بہ روایات بخاری، بغوی)

حضرت عبداللہ بن عباس کی خوردسالی کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے علم وعقل کے باب میں حضرت عمر فاروق کا ایک قول بھی نقل کیا ہے جو صرف حکیمانہ مقولہ کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ ایک اصول وقاعدہ بھی بن جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "علم سن کی کمی یا زیادتی پر نہیں ہے" (الفاروق ۲/ ۲۶۵ بحوالہ ازالۃ الخفاء روایت بغوی، ص: ۱۱۹)

مولانا شبلی نے اسی طرح حضرت عمرؓ کی "زندہ دلی" کے عنوان سے لکھا ہے کہ "کبھی کبھی موقع ملتا تھا تو زندہ دلی کے اشغال سے جی بہلاتے تھے،" حضرت ابن عباس سے

رات بھر اشعار پڑھوایا کئے ....،، رات کے گشت کے دوران گانے کی آواز آتی تو.... دیر تک کھڑے سنتے رہے..........،حضرت عبد اللہ بن زبیر کی چہل دیکھتے رہے، حضرت رباح سے حدی گانے سنتے رہے........ ،، آخر میں البتہ خدا کے ذکر یا قرآن مجید سنتے،،سفرحج میں ایک سوار گاتا جاتا تھا۔لوگوں نے حضرت عمر سے کہا کہ آپ اس کو منع نہیں کرتے۔فرمایا کہ گانا شتر سواروں کا زاد راہ ہے،،....حضرت خوات بن جبیر سے دوران سفر رات بھر ان کے اپنے اشعار کا گانا سنتے رہے،، (الفاروق ۲/۲۷۰۔۲۷۱ ازالۃ الخفاء، ص: ۲۰۲،ص: ۱۹۸، ایضا بحوالہ ابوعمر، ص:۲۰۸) بظاہر یہ سب زہد وتقشف کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر شاہ ولی اللہ جیسے،، صاحبان نظر،، کی نگاہ میں وہ ،،مباحات،، میں شمار ہوتا ہے جو فقہ کا عنوان ہونے کے ساتھ زندگی اور خوش زیستن کا باب جانفزا بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک محبوب ومخصوص موضوع خلافتِ اسلامی کا نظریہ ارتقاء اور عمل ہے۔ اور وہ صاحبِ الفاروق کا بھی ایک محبوب ترین موضوع بحث ہے۔ کیونکہ ان کے ممدوح اعظم نے خلافتِ صدیقی کے انعقاد وتکمیل میں بالخصوص اور نظریہ خلافت کے ارتقاء واطلاق میں بالعموم کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ مولانا شبلی نے خلافت صدیقی کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع مہاجرین وانصار پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد خلافت کے تین گروہ دعوے دار تھے (۱) بنو ہاشم حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور حضرت موصوف کا بھی یہی خیال تھا (۲) مہاجرین حضرت ابوبکر صدیق کو اپنا سردار وخلیفہ بنانا چاہتے تھے جبکہ انصار حضرت سعد بن عبادہ کے لئے کوشاں تھے۔ مولانا مرحوم نے بڑی تفصیل اور دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق کی حکمت واقدام کی بنا پر حضرت ابوبکر اولین خلیفۂ اسلام مقرر ہوگئے مگر بنو ہاشم نے ان کی خلافت تسلیم نہ کی اور حضرت فاطمہ کے گھر میں جمع ہوکر ،،سازشیں،، کرتے رہے۔ حضرت عمر نے ان کو سختی سے روکا اور بزور بیعت صدیق لینی چاہی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ: ،، زبیر وجمعے از بنوہاشم در خانہ حضرت فاطمہ جمع شدہ در باب نقض خلافت مشورہ ہا بکاری بردند،، (الفاروق ۲/۱۶۳ ومابعد وباب سقیفہ بنی ساعدہ اول ۶۵۔ ۵۹) مؤلف الفاروق کی خلافت پر بحث زیادہ تر شاہ صاحب کی ازالۃ الخفاء (حصہ دوم ۲۹

ومابعد) سے ماخذ ومستفاد ہے۔

مؤلفِ الفاروق نے ''امامت اور اجتہاد'' کے باب میں نظریۂ خلافت وامامت سے بہت عمدہ بحث کی ہے اور اس کا آغاز شاہ صاحب کے بیان وتبصرہ سے کیا ہے ''امامت کا منصب در حقیقت نبوت کا ایک شائبہ ہے اور امام کی فطرت قریب قریب پیغمبر کی فطرت کے واقع ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :

واز میان امت جمعے ہستند کہ جو ہر نفس ایشاں قریب بجو ہر انبیاء مخلوق شدہ، این جماعہ در اصل فطرت خلفائے انبیاء اند در امت۔'' (الفاروق ۲/ ۱۹۰ بحوالہ ازالۃ الخفاء اول صفحہ ۹)

مولانا شبلی نے حضرت عمر کی مجتہدانہ شان اور حکیمانہ امامت پر بڑی عمدہ بحث کی ہے اور اصول وارکان سے نظر ہٹ جانے کو گمراہی کا سبب بتایا ہے اور اس ضمن میں قضا وقدر اور تعظیم شعائر اللہ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر علانیہ کہا تھا کہ ''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ فائدہ، پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان،'' صلح حدیبیہ پر رسول اکرم ﷺ '' نے ایک درخت کے نیچے لوگوں سے جہاد پر بیعت لی تھی اس بنا پر یہ درخت متبرک سمجھا جانے لگا اور لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر اس کو جڑ سے کٹوادیا''، ''ایک دفعہ سفر حج سے واپس آرہے تھے، راستہ میں ایک مسجد تھی جس میں ایک دفعہ آنحضرتؐ نے نماز پڑھی تھی۔ اس خیال سے لوگ اس کی طرف دوڑے۔ حضرت عمر نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اہل کتاب انہی باتوں کے بدولت تباہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی یادگاروں کو عبادت گاہ بنالیا........، (الفاروق ۲/ ۹۲۔۱۹۱ بحوالہ ازالۃ الخفاء، حصہ دوم ۹۰۔۹۱)

نبوت کی حقیقت اور نبی کے اقوال وافعال کی منصب نبوت سے نسبت وتعلق پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ ''شریعت کے متعلق بہت بڑا اصول جو حضرت عمر نے قائم کیا یہ تھا کہ شریعت کے تمام احکام مصالح عقلی پر مبنی ہیں۔'' جبکہ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں عقل کو دخل نہیں۔ اول خیال ''علم اسرار الدین'' کی بنیاد ہے۔ یہ علم اگر چہ اب

ایک مستقل فن بن گیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اسی فن میں ہے .... حضرت عمر اسی .... اصول کے قائل تھے اور وہ سب سے پہلے شخص ہیں جس نے علم اسرار الدین کی گویا بنیاد ڈالی۔شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ نے اس علم سے بحث کی اور اس کے وجود ظاہر کئے۔'' مولانا مرحوم نے وفاتِ نبوی کے وقت تمام بزرگوں کی عمروں ''کا کچا پن'' ظاہر کر کے لکھا ہے کہ'' یہ سب بزرگ اس علم کے ترقی دینے والے ہوں گے لیکن اولیت کا منصب حضرت عمر ہی کو حاصل ہوگا.......'' (الفاروق ۲/ ۹۴-۱۹۳)

مؤلفِ الفاروق نے متعدد روایات وواقعات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ'' حضرت عمر مسائلِ شریعت کی نسبت ہمیشہ مصالح اور وجوہ پر غور کرتے تھے اور اگر ان کے خیال میں کوئی مسئلہ خلافِ عقل ہوتا تھا تو رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرتے تھے''۔ مولانا شبلی نے اس کے بعد سفر میں نمازِ قصر کے حکمِ الٰہی : **لیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا** کی وجوہ ومصالح سے بحث کر کے لکھا ہے کہ'' جب راستے مامون ہوگئے تب بھی قصر کا حکم باقی رہا۔ حضرت عمرؓ کو اس پر استعجاب ہوا اور آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ اب سفر میں قصر کیوں کیا جاتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ خدا کا انعام ہے۔'' (الفاروق ۲/ ۱۹۴ بحوالہ مسلم)

شاہ ولی اللہ کے حوالے سے حج کے طواف میں رمل کی سنت پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ'' اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ سے مکہ تشریف لائے تو کافروں نے مشہور کیا کہ مسلمان ایسے نحیف اور کمزور ہوگئے کہ کعبہ کا طواف بھی نہیں کر سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر رمل کا حکم دیا۔ اس کے بعد یہ فعل معمول بہ ہوگیا چنانچہ ائمہ اربعہ اس کو حج کی ایک ضروری سنت سمجھتے ہیں۔ لیکن حضرت عمر نے صاف کہا: ''**مالنا وللرمل، انما کنا رأینا بہ المشرکین وقد اھلکھم اللہ**'' یعنی'' اب ہم کو رمل سے کیا غرض؟ اس سے مشرکوں کو رعب دلانا مقصود تھا، سو ان کو خدا نے ہلاک کردیا'' حضرت عمرؓ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے رمل کے ترک کا ارادہ بھی کرلیا تھا لیکن

پھر آنحضرت ﷺ کی یادگار سمجھ کر رہنے دیا۔ عبداللہ بن عباسؓ جو حضرت عمرؓ کے خاص تربیت یافتہ تھے ان سے کہا گیا کہ ''لوگ رمل کو سنت سمجھتے ہیں تو کہا کہ غلط سمجھتے ہیں۔'' (الفاروق ۲/۹۵۔ ۱۹۴ بحوالہ ازالۃ الخفاء، ص: ۱۹۵، حصہ دوم، حجۃ اللہ البالغہ)

مولانا شبلیؒ کے فکر و نظر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجزیہ وتبصرہ کا ختام المسک ان کے خاتمہ الفاروق میں نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں: شاہ ولی اللہ صاحب نے حضرت عمرؓ کی اس خصوصیت (یعنی جامعیتِ کمالات) کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور ہم اسی پر اپنی کتاب کو ختم کرتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''سینۂ فاروقِ اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن کہ در ہائے مختلف دارد، در ہر درے صاحب کمالے نشستہ: در یک در مثلاً سکندر ذوالقرنین باآںہمہ سلیقۂ ملک گیری وجہاں ستانی وجمع جیوش وبرہم زدنِ اعداء، در درِ دیگر نوشیر وانے باآن ہمہ رفق ولین ورعیت پروری وداد گستری (اگر چہ ذکر نوشیر واں در مبحث فضائل حضرت فاروقؓ سوء ادب ست)

ودر درِ دیگر امام ابوحنیفۂ یا امام مالکے باآں ہمہ قیام بہ علم فتوی واحکام،

ودر درِ دیگر مرشدے مثل سیدی عبدالقادر جیلانی یا خواجہ بہاء الدین،

ودر درِ دیگر محدثے بروزن ابوہریرہؓ وابن عمرؓ،

ودر درِ دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فرید الدین عطار،

ومردمان گرداگرد این خانہ ایستادہ اند، وہر محتاجے حاجت خود را از صاحبِ فن درخواست می نماید وکامیاب می گردد۔'' (الفاروق ۲/۲۹۱)

☆☆☆

حضرت عمر فاروقؓ کا فہم قرآن

علامہ شبلیؒ کی الفاروق کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

علامہ شبلیؒ کی تصنیف الفاروق کی اشاعت کو سو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی شہرت، عظمت اور اہمیت میں کچھ بھی کمی نہیں آئی ہے، اردو زبان میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں اور اس کے بعد بھی، لیکن کوئی کتاب اس کے مقام ومرتبہ کو نہ چھو سکی۔

یہ کتاب دو حصوں میں ہے، پہلے حصے میں ''حضرت عمرؓ کے نام ونسب اور ولادت سے لے کر وفات تک کے حالات، واقعات اور فتوحات ملکی بالتفصیل درج ہیں'' جب کہ ''حصۂ دوم میں حضرت عمرؓ کے تمام ملکی، مالی، فوجی اور مذہبی انتظامات کی تفصیل ہے، پھر ان کے ذاتی اخلاق وعادات اور علمی کمالات کا تذکرہ ہے اور خصوصاً ان کے مجتہدانہ کارناموں کو نہایت شرح وبسط سے لکھا گیا ہے'' علامہ شبلی نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی ومحنت کا تماشا گاہ ہے''[1] اس حصے میں ایک عنوان ''صیغۂ مذہبی'' کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مختلف علوم وفنون کی اشاعت کے لئے کیا تدبیریں اختیار کیں اور کیا انتظامات کئے۔ ایک دوسرے عنوان ''ذاتی حالات اور اخلاق وعادات'' کے تحت ان کی علمی عظمت اور مختلف علوم میں ان کی مہارت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں اس کتاب کے حوالے سے قرآن اور اس کے علوم کی اشاعت کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی کوششوں اور خدمات، اور قرآن کے فہم اور اس سے استنباط کے سلسلے میں ان کے مقام ومرتبہ پر کچھ روشنی ڈالنی مقصود ہے۔

''صیغۂ مذہبی'' کے تحت علامہ شبلی نے پچیس صفحات (۱۱۹۔۱۴۳) میں قرآن، حدیث

۱۔ الفاروق، شبلی نعمانی، فرید بک ڈپو دہلی، ص: ۱۸

اور فقہ کی تعلیم عام کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کی کوششوں کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے چھ صفحات تعلیم قرآن کے سلسلے میں ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں تدوینِ قرآن کا عظیم الشان کام حضرت عمرؓ کے اہتمام اور توجہ سے ہوا۔ اس کے تفصیلی تذکرے کے بعد اس سلسلے میں ان کی دیگر کوششوں کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

''اس وقت قرآن مجید کی حفاظت اور صحت کے لئے چند امور نہایت ضروری تھے: اول یہ کہ نہایت وسعت کے ساتھ اس کی تعلیم شائع کی جائے اور سیکڑوں ہزاروں آدمی حافظ قرآن بنادیئے جائیں تاکہ تحریف وتغیر کا احتمال نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ اعراب اور الفاظ کی صحت نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھی جائے۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کی بہت سی نقلیں ہوکر ملک میں کثرت سے شائع ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ نے ان تینوں امور کو اس کمال کے ساتھ انجام دیا کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہ تھا'' [۱]

آگے ان کی تفصیلات ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تمام ممالک مفتوحہ میں ہر جگہ قرآن مجید کا درس جاری کیا، بچوں کی تعلیم کے لئے مکتب قائم کئے اور ان میں معلم وقاری مقرر کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کیں، حفاظ صحابہ کو مختلف علاقوں میں بھیجا تاکہ وہاں جاکر قرآن کی تعلیم دیں، چند سورتیں جن میں احکام وفرائض مذکور ہیں انہیں یاد کرنا سب کے لئے لازمی قرار دیا، بطور ترغیب وتشویق قرآن مجید پڑھنے اور یاد کرنے والوں کے لئے تنخواہیں مقرر کیں، فوجیوں کے لئے بھی قرآن پڑھنا لازمی قرار دیا۔

''امامت واجتہاد'' کے عنوان کے تحت علامہ شبلی نے حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، انہوں نے حضرت عمرؓ کے بارے میں احادیث کی تحقیق وتفحص، کثرتِ روایت سے اجتناب اور ممانعت، نئے اور دقیق مسائل میں غور وخوض اور صحابہ کے ساتھ اجتماعی مشورہ اور قرآن وحدیث سے احکام کے استنباط وغیرہ کے پہلوؤں پر مفصل اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کی یہ بحث تقریباً چوّن صفحات (۲۰۶۔ ۲۵۹) پر مشتمل ہے۔ اس بحث سے علم حدیث اور علم فقہ میں حضرت عمرؓ کا مقام بہت نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے، دورانِ بحث

۱۔ الفاروق ۲/ ۱۲۸۔ ۱۲۹

علامہ شبلی نے اس طرح کے جملے متعدد مرتبہ دہرائے ہیں:

''حدیث وفقہ کا فن درحقیقت تمام تر ان کا ساختہ وپرداختہ ہے۔ صحابہ میں اور لوگ بھی محدث اور فقیہ تھے......... لیکن فن کی ابتداء حضرت عمرؓ سے ہوئی اور فن کے اصول وقواعد اول انہی نے قائم کیے''[۱]

''فقہ کا فن تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ وپرداختہ ہے، اس فن سے متعلق ان کی قابلیت اور افضلیت کا تمام صحابہ کو اعتراف تھا''[۲]

علامہ شبلی نے ''فہم قرآن'' کا کوئی عنوان قائم نہیں کیا ہے۔ اس لئے سیرتِ فاروقؓ کا یہ پہلو زیادہ نمایاں نہیں ہو پایا ہے۔ لیکن انہوں نے جستہ جستہ بعض واقعات نقل کئے ہیں جن سے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے، انہی متفرق واقعات کو یکجا کر کے مربوط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

حضرت عمرؓ قرآن میں مستقل غور وتدبر کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی یا کہیں ابہام محسوس کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرلیا کرتے تھے۔ الفاروق میں اس سلسلے کی دو مثالیں ملتی ہیں:

''سفر میں قصر کا حکم اس بنا پر تھا کہ ابتدائے اسلام میں راستے محفوظ نہ تھے اور کافروں کی طرف سے ہمیشہ خوف کا سامنا رہتا تھا۔ چنانچہ قرآ مجید میں خود اس کا اشارہ ہے **إذا ضربتم فی الأرض فلیس علیکم جناح أن تقصروا من الصلوٰۃ إن خفتم أن یفتنکم الذین کفروا** (النساء۔۱۰۱) لیکن جب راستے مامون ہوگئے تب بھی قصر کا حکم باقی رہا۔ حضرت عمرؓ کو اس پر تعجب ہوا اور آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ اب سفر میں قصر کیوں کیا جاتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ خدا کا انعام ہے''[۳]

''کلالہ'' یعنی وہ مرد یا عورت جو بے اولاد مرجائے اور اس کے بھائی یا بہن ہوں تو اس کی میراث کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کو تسلی نہیں ہوئی تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس قدر بار بار دریافت کیا کہ آپؐ دق آگئے اور فرمایا کہ سورۂ نساء کی اخیر آیت

۱۔ الفاروق، ۲/ ۲۱۶۔۲۱۷ ۲۔ ایضاً، ۲/ ۲۲۷

۳۔ ایضاً، ۲/ ۲۱۰ بحوالہ صحیح مسلم

تیرے لئے کافی ہو سکتی ہے[1]

قرآن میں مستقل غور وتدبر کے نتیجے میں حضرت عمرؓ کو علوم قرآن کے معاملے میں صحابہ کرام کے درمیان امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''فتویٰ دینا اس شخص کا کام ہے جو قرآن کے ناسخ ومنسوخ جانتا ہو۔ لوگوں نے پوچھا: ایسا کون شخص ہوسکتا ہے؟ فرمایا: عمر بن الخطابؓ''[2]

ایک وقعہ جس کا تعلق اگر چہ ایک فقہی مسئلے سے ہے لیکن اس سے حضرت عمرؓ کی قرآن فہمی پر روشنی پڑتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے صریح حکم کی تنسیخ یا تخصیص ''خبر واحد'' سے کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ واقعہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق بائن دے دی جائے اس کو عدّت کے زمانے تک نان ونفقہ اور مکان ملنا چاہئے یا نہیں؟ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ فرماتی ہیں کہ ان کے شوہر نے انہیں طلاق دی تو حضور نے انہیں سکنیٰ اور نفقہ کا حق نہیں دیا[3] لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی یہ روایت قبول نہیں کی اور فرمایا:

لانترک کتاب اللہ وسنة نبینا صلی اللہ علیہ وسلم بقول امرأة لا ندری لعلها حفظت أو نسیت، لها السکنیٰ والنفقة، قال اللہ عزّ وجل: لا تخرجو هن من بیو تهن ولا یخرجن إلاّ أن یا تین بفاحشة مبینة (الطلاق۔۱)[4]

''جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکان ملنا چاہئے اور مکان کے ساتھ نفقہ خود ایک لازمی چیز ہے''

الفاروق میں یہ واقعہ دو مقامات پر مذکور ہے[5]

۱۔ الفاروق، ۲/۲۳۲، بحوالہ مسند احمد، ۱/ ۲۷۔۲۸، یہ حدیث صحیح مسلم، کتاب الفرائض باب میراث الکلالة میں بھی مروی ہے۔

۲۔ ایضاً ۲/ ۲۲۷۔۲۲۸، بحوالہ سنن الدارمی، مقدمہ، باب فی الذی یفتی الناس فی کل ما یستفتی

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقة ثلاثا لا نفقة لها، یہ حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے

۴۔ صحیح مسلم، حوالہ سابق، جامع ترمذی ابواب الطلاق، باب ماجاء فی المطلقة ثلاثا لا نفقة لها ولا سکنیٰ

۵۔ الفاروق ۲/۲۲۲، ۲۳۹

علامہ شبلی نے حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت کی دو مثالیں دی ہیں اور ان پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان سے بھی حضرت عمرؓ کی قرآن فہمی پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک مسئلہ خمس کا ہے۔ سورۂ انفال میں ہے: **واعلموا أنما غنمتم من شئ فأن لله خمسه وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل** (آیت: ۴۱) اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خمس میں رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں کا بھی حصہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت علیؓ بلکہ تمام اہل بیت کا اس مسئلہ پر اتفاق تھا۔ حضرت عمرؓ کی نسبت لوگوں کا بیان ہے کہ وہ قرابت دارانِ پیغمبر کو مطلقاً خمس کا حق دار نہیں سمجھتے تھے[1] علامہ شبلیؒ نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے استدلال کے نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ آیت سے مجموعی طور پر خمس کے مصارف کا علم ہوتا ہے۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فرداً فرداً ہر گروہ میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

۲۔ خود حضور خمس میں سے اپنے تمام ذوی قربیٰ کو نہیں دیتے تھے بلکہ صرف بنو ہاشم اور بنو مطلب کو دیتے تھے اور ان سب کو بھی مساویانہ نہیں بلکہ حسب مصلحت وضرورت دیتے تھے۔

آخر میں فرماتے ہیں: ''قرآن مجید کے فحویٰ اور آنحضرت ﷺ کے طریق عمل کو منطبق کر کے دیکھو تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ بالکل قرآن وحدیث کے مطابق تھا''[2]

دوسرا مسئلہ ''فے'' کا ہے۔ یعنی وہ زمین یا جائیداد جس کو مسلمانوں نے فتح کیا ہو، اس سے متعلق غزوۂ بنی نضیر ۵ھ کے موقع پر یہ آیت اتری: **ما افاء الله علی رسوله من اهل القری فلله وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل .... للفقراء المهاجرین الذین اخرجوا من دیارهم واموالهم .... والذین تبوّؤ الدار والایمان من قبلهم .... والذین جاءوا من بعدهم.........**

۱۔ ایضاً، ۲/ ۲۴۵۔۲۴۶

۲۔ ایضاً، ۲/ ۲۴۹

(الحسر: ۷۔۱۰)

شام وعراق جب فتح ہوئے تو لوگوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ ممالک مفتوحہ ان کو تقسیم کردئے جائیں لیکن حضرت عمرؓ نے نہ مانا۔ انہوں نے آیت مذکورہ بالا سے استدلال کیا اور آیت کے الفاظ **والذین من بعدھم** پڑھ کر فرمایا کہ ''یہ تو تمام آئندہ آنے والوں کے لئے ہے اور اس بنا پر یہ ممالک تمام لوگوں کا حق ٹھہرے۔ پھر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ میں موجودہ لوگوں کو تقسیم کردوں اور ان لوگوں کو محروم کردوں جو آئندہ پیدا ہوں گے''۔[1]

الفاروق میں حضرت عمرؓ کی قرآن فہمی کی بعض اور مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ علامہ شبلی نے ''ذاتی حالات'' کے تحت ''علمی مجلسیں'' کے زیر عنوان لکھا ہے:

''حضرت عمرؓ کی ایک مجلس میں اصحاب بدر جمع تھے حضرت عمرؓ نے مجمع صحابہ کی طرف خطاب کر کے کہا کہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ سے کیا مراد ہے؟ بعضوں نے کہا: خدا نے حکم دیا ہے کہ جب فتح حاصل ہوجائے تو ہم خدا کا شکر بجالائیں، بعض بالکل چپ رہے۔ حضرت عمرؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا، اس میں آنحضرت ﷺ کی وفات کی طرف اشارہ ہے'' حضرت عمرؓ نے فرمایا: جو تم نے کہا یہی میرا خیال ہے''۔[2]

'ایک اور دن صحابہ کا مجمع تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بھی شریک تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس آیت کے معنی پوچھے:

ایود احدکم ان تکون له جنة من نخیل واعنا ب تجری من تحتها الانهار له فیها من کل الثمرات واصابه الکبر وله ذریة ضعفاء فاصابها اعصار فیه نار فاحترقت (البقرة، ۲۶۶)

لوگوں نے کہا: خدا زیادہ جانتا ہے.......... حضرت عمرؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا: ''خدا نے ایک کام کرنے والے شخص کی تمثیل دی ہے'' اس سے زیادہ نہ بتا سکے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''یہ اس آدمی کی تمثیل ہے جس کو خدا نے دولت ونعمت

۱۔ الفاروق ۲/۲۵۲۔۲۵۳، بحوالہ کتاب الخراج، ابو یوسف ص: ۱۵

۲۔ ایضاً ۲/۲۸۳، بحوالہ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النصر باب قولہ ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً

دی کہ خدا کی بندگی بجالائے لیکن اس نے نافرمانی کی تو اس کے اچھے اعمال بھی برباد کردیئے''۔[۱]

مفسرین نے تفسیر قرآن میں خود قرآن، پھر حدیث وسنت کے بعد تیسرا مقام آثار صحابہ کو دیا ہے اوران سے استفادہ پر زور دیا ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت عمر فاروقؓ کی روایات اور آثار تفسیر قرآن کے بہت سے مقامات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں مثلاً سورۂ تحریم کی آیت: **ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما ، وان تظھرا علیہ فان اللہ ھو مولٰہ وجبریل وصالح المومنین ، والملئکۃ بعد ذلک ظھیر** (نمبر۔ ۴) میں ازواج مطہرات میں سے کن دو کی طرف اشارہ ہے، اس کا علم ہمیں حضرت عمرؓ ہی کے ذریعے ہو پاتا ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''میں عمر بن الخطابؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا مگر ان کی ہیبت سے ایک سال تک اس کی ہمت نہ کرسکا، یہاں تک کہ حج کے لئے ان کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے موقع پاکر ان سے دریافت کیا کہ وہ کون سی ازواج مطہرات ہیں جنہوں نے (قرآن کے الفاظ میں) نبی ﷺ کے خلاف ''جتھ بندی'' کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: حفصہؓ اور عائشہؓ۔ پھر انہوں نے تفصیل سے اس آیت کی شان نزول اور واقعہ کا پس منظر بیان کیا''۔[۲]

علامہ شبلیؒ نے بالکل طور پر لکھا ہے کہ مؤرخین نے عموماً جنگوں، فتوحات اور حکمرانوں کے حالات لکھنے کی طرف توجہ کی ہے اور متعلقہ عہد کے سماجی اور ثقافتی احوال سے اعراض کیا ہے، میں نے سیرتِ فاروق پر عربی اوراردو کی بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں۔ ان میں قرآن مجید کی تدوین، حفاظت اور اشاعت کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی خدمات کا تو کچھ تذکرہ ملتا ہے لیکن ان کے فہم قرآن اور تفسیر قرآن سے متعلق،

۱۔ ایضاً، ۲/۲۸۳، بحوالہ صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب قولہ ایود احدکم ان تکون لہ جنۃ

۲۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ التحریم، باب تبتغی مرضات ازواجک، صحیح مسلم

ان کی روایات اور آثار پر مطلق روشنی نہیں پڑتی۔ علامہ شبلیؒ نے اگر چہ اس عنوان کے تحت کہیں یکجا نہیں لکھا ہے، لیکن الفاروق میں اس موضوع پر جو معلومات جستہ جستہ مختلف مقامات پر موجود ہیں وہ فہم قرآن میں حضرت عمرؓ کے مقام ومرتبہ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

☆☆☆

الفاروق اور علمِ حدیث

محمد اسلام عمری

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ نے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقِ اعظم کی سیرت پر الفاروق کے نام سے جو عظیم کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب واقعی ایک عظیم شاہکار اور اپنی افادیت کے لحاظ سے وقیع ہے۔ آج سے ایک صدی قبل یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی سوانح کا جس ترتیب سے نقشہ کھینچا ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ موصوف نے اس کتاب کی تیاری اور ترتیب میں بڑی محنت سے کام لیا ہے، تاریخ کی کتابوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح پر جہاں سے بھی مواد ملا ہے وہاں سے اخذ کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خلافت اسلامیہ کے کاز کو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جس قدر وسعت ملی شاید ایسی وسعت کسی دوسری سلطنت میں نہیں ملی۔ اسلامی سلطنت کو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بہت بڑھاوا ملا حضرت عمرؓ کے کارناموں کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کرنے کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا باعظمت کام علامہ شبلیؒ سے لیا۔ علامہ موصوف نے اس کتاب کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا نام ونسب، تعلیم وتربیت، قبول اسلام اور ان کی فتوحات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ تاریخ داں حضرات سے یہ مخفی نہیں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے زمام اقتدار سنبھالتے ہی دار السلطنت مدینہ منورہ کے چاروں طرف فتوحات کا جو طویل سلسلہ شروع کیا اس کو بڑی دور تک چلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام بہت تیزی سے شام، ایران، مصر اور فلسطین تک پہونچ گیا، ان ممالک کے فتح کرنے میں کیسی دشواریاں پیش آئیں اور ان میں کیا طریقہ اپنایا ان سب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا آسان اور مؤثر ذریعہ الفاروق کا مطالعہ ہے، اس کتاب

کے مطالعہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی پوری زندگی ذہن میں آجاتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں حضرت عمر فاروقؓ کا نام سنہرے حروف سے لکھا ہوا ہے، آپ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں، تلاش بسیار کے باوجود علامہ شبلیؒ کو بھی اس سلسلہ میں مایوسی ہوئی لیکن علامہ موصوف کا مقصد تصنیف حضرت عمر فاروقؓ کے کارناموں کو بیان کرنا تھا نہ کہ ان کی ابتدائی زندگی کو بیان کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ حضرت عمر فاروقؓ کی فضیلت، اہمیت اور کارناموں کا ذکر کرتے ہیں تو انکا قلم بڑا رواں اور تیز ہو جاتا ہے، شریعت اسلامیہ میں حضرت عمرؓ کی اولیات کا ایک روشن باب ہے۔ اس پر الگ سے ایک طویل مقالہ کی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ کی فقاہت صلاحیت اور خدمات سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں جابجا اس کے نمونے دوران مطالعہ نظر آئیں گے۔ اس وقت الفاروق کا مطالعہ اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں علامہ موصوف نے فن حدیث سے کیسے کام لیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کا کیا طریقہ رہا ہے۔ اس میں کئی باتیں پیش نظر ہیں۔ یہاں ایک ترتیب سے چند نکتے پیش کئے جا رہے ہیں۔

ا۔ اذان کی ابتداء

کتب احادیث میں بکثرت یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو وہاں باقاعدہ نماز جماعت سے پڑھی جانے لگی۔ نماز کے وقت پر لوگوں کو جمع کرنے کا کوئی خاص طریقہ نہ تھا اس لئے آپ نے صحابہ کرام سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ہر نماز کے وقت آدمی بھیج کر اعلان کر دیا جائے رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ ص: ۳۵ جلد اول۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے یہ واقعہ صحیح بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے۔ حالانکہ صحیح واقعہ اس طرح ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں اذان کے کسی طریقۂ کار پر اتفاق نہ ہوا تو مجلس برخاست ہوگئی اسی رات حضرت ابو محذورہؓ نامی ایک صحابی نے خواب دیکھا کہ ایک شخص کے ہاتھ میں ناقوس ہے انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس کو فروخت کرو گے، اس

نے کہا تم اس کو لے کر کیا کرو گے، انہوں نے کہا میں اس کے ذریعہ نماز کے اوقات کا اعلان کروں گا، اس پر اس شخص نے کہا میں اس سے بہتر طریقہ تم کو بتاتا ہوں پھر اس نے اذان کے یہ کلمات بتائے۔ صحابی مذکور نے صبح سویرے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنا خواب بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ کلمات بہت پسند آئے۔ آپ نے حضرت ابو محذورہؓ کو حکم دیا کہ تم یہ کلمات حضرت بلالؓ کو بتاتے جاؤ اور وہ بلند آواز سے اس کو ادا کرتے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت بلالؓ کی آواز سنتے ہی حضرت عمر فاروقؓ دوڑے ہوئے آئے اور خدمت نبوی میں عرض کیا خدا کی قسم میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کی موافقت تو ثابت ہوتی ہے لیکن اولیت ثابت نہیں ہوتی حالانکہ علامہ موصوف نے لکھا ہے کہ "حضرت عمرؓ کے لئے اس سے زیادہ کیا فخر کی بات ہو سکتی ہے کہ یہ شعارِ اعظم ان ہی کی رائے کی وجہ سے قائم ہوا" ص: ۳۶

۲۔ جنگِ احد سے فرار کا واقعہ

علامہ شبلیؒ نے علامہ بلاذریؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "حضرت عمرؓ نے جب اپنی خلافت کے زمانہ میں لوگوں کے روزینے مقرر کیے تو ایک شخص کے روزینے کے متعلق لوگوں نے کہا کہ ان سے زیادہ مستحق آپ کے فرزند عبد اللہ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا نہیں کیوں کہ اس کا باپ احد کی لڑائی میں ثابت قدم رہا تھا اور عبد اللہ کا باپ (یعنی عمرؓ) نہیں رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف نے بادل نخواستہ اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ پھر محدثانہ شان سے علامہ بلاذری کی اس روایت پر بحث کی ہے۔ اس کی سند پر کلام کیا ہے لکھا ہے "یہ روایت قطع نظر اس کے کہ درایۃً غلط ہے کیوں کہ معرکۂ جہاد سے بھاگنا ایک ایسا ننگ تھا جس کو کوئی شخص علانیہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا اصول درایت کے لحاظ سے بھی ہم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے علامہ موصوف نے جن رواۃ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے ان میں عباس بن عبد اللہ الباکسا اور عنیض بن اسحاق ہیں اور یہ دونوں مجہول الحال ہیں" ص: ۴۶

۳۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بیعت

صلح حدیبیہ تاریخ اسلام اور عہد نبوی کا ایک بڑا ہی اہم واقعہ ہے۔ جن شرائط پر یہ صلح ہوئی تھی حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر اور جاہ وجلال کے مالک صحابی کے لئے بظاہر نا قابل قبول تھا۔ بہر حال حدیبیہ کی صلح ہوگئی دوسرے سال مسلمان فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہوئے جس نے امان مانگا اسے امان ملا باقی لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوگئے۔ صفا پہاڑی پر چڑھ کر آپ نے بیعت لی۔ مردوں سے بیعت لیتے وقت آپ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے تھے اور لوگ اسی پر اپنا قول وقرار پیش کرتے تھے لیکن جب عورتوں سے بیعت کی باری آئی تو آپ نے عورتوں سے بیعت کے لئے حضرت عمرؓ کو آگے بڑھا دیا، وہاں موجود عورتوں نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

علامہ شبلیؒ نے یہ بات بغیر کسی حوالہ کے لکھی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ خواتین سے بیعت کے سلسلہ میں مستند تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نامحرم عورتوں سے اپنا ہاتھ مس کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے آپ نے اپنی چادر خواتین کی طرف بڑھادی اس کا ایک کنارہ آپ نے پکڑ رکھا تھا اور دوسرا کنارہ خواتین پکڑ کر عہد کرتی تھیں۔ ص:۵۶

جب آپ نامحرم خواتین سے اپنا ہاتھ مس کرنا ناپسند کرتے تھے تو حضرت عمرؓ کو اس کا حکم کیسے دے دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف یہاں حضرت عمرؓ کی فضیلت اور رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں آپ کی عظمت ثابت کرنے کے لئے یہ بات لکھ دی ہے ورنہ محدثانہ طریقہ سے اس روایت کے راویوں پر جرح وتعدیل کی پوری گنجائش تھی۔

۴۔ جنگ تبوک

جنگ تبوک کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے جنگی ساز وسامان کی تیاری کے لئے خصوصی انفاق کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ صحابہ کرام میں سے ہر شخص نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر فی سبیل اللہ مال دیا۔ علامہ شبلیؒ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

''حضرت عمرؓ نے اس موقعہ پر تمام مال واسباب میں سے آدھا لاکر آں حضرت کی

خدمت میں پیش کیا'' ص:۵۶

دیگر کتب سیرت کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ کا انفاق مثالی تھا۔ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت عمرؓ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ آج انفاق کے معاملہ میں سب سے بازی لے جاؤں گا لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سارا مال واسباب آں حضرت کی خدمت میں پیش کردیا تو حضرت عمرؓ نے علی الاعلان حضرت ابوبکرؓ کی سخاوت وفیاضی کا اعتراف کیا۔ آنحضرت نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ جب گھر کا سارا مال واسباب راہ خدا میں دے دیا تو گھر میں کچھ باقی رہایا نہیں اس کے جواب میں حضرت ابوبکر کا ایمان افروز جملہ یہ تھا۔ گھر میں صرف اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے یہاں صرف حضرت عمرؓ کی سخاوت وفیاضی کا تذکرہ کیا ہے۔ روایت کے ایک ٹکڑے کو لے لیا ہے باقی دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ دیا۔

۵۔ ہذیان سے متعلق واقعہ :

رسول اللہ ﷺ کی وفات کا تذکرہ پوری تفصیل کے ساتھ کتب سیرت میں موجود ہے۔ اس وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے تین روز قبل لوگوں سے قلم اور دوات طلب کیا تاکہ کوئی ایسی تحریر ثبت کردیں جس کی بدولت لوگ گمراہ نہ ہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ'' آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لئے قرآن کافی ہے'' ص:۶۰

حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل سے بہت سے اعتراضات وارد ہوئے چوں کہ اعتراضات حضرت عمرؓ کی ذات سے متعلق تھے۔ لکھا ہے کہ''اس معاملہ میں کسی نے اصولِ درایت سے کام نہیں لیا'' ص:۶۰ مزید محدثین کی طرح درایت پر اس طرح کلام کیا۔

(۱) کاغذ وقلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں بتصریح مذکور ہے اور چوں کہ آنحضرت نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اس لئے اس واقعہ کے بعد آنحضرت چار دن تک زندہ رہے۔

(۲) اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرت کی نسبت اور کوئی واقعہ اختلال حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں۔

(۳) اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے بایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباس کے کسی اور صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

(۴) عبداللہ بن عباسؓ کی عمر اس وقت صرف ۱۳۔۱۴ برس کی تھی۔

(۵) سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقعہ پر عبداللہ بن عباس خود موجود نہ تھے اور یہ نہیں معلوم کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا'' ص:۶۱

اب ان مقامات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جہاں مولانا شبلی نے احادیث یا محدثین کے اصول کو اپنایا ہے۔ احادیث نقل کرنے کے بعد جابجا شروح احایث خاص کر حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب فتح الباری سے استفادہ کیا ہے۔

- غزوۂ احد میں مجاہدین کے منتشر ہو جانے کے بعد بھی کچھ لوگ آنحضرت کے ساتھ لگے رہے۔ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ ایسے کتنے لوگ تھے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں ''صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ احد میں آنحضرت کے ساتھ صرف سات انصار اور دو قریش یعنی سعد اور طلحہ رہ گئے تھے۔ نسائی اور بیہقیؒ میں بسند صحیح منقول ہیکہ گیارہ انصار اور طلحہ کے سوا اور کوئی آنحضرت کے ساتھ نہیں رہا تھا۔'' (ص:۴۳۔۴۴) ان دونوں روایتوں میں تعداد کا اختلاف ظاہر ہے۔ مولانا شبلی نے اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے فتح الباری کا سہارا لیا چنانچہ لکھتے ہیں ''حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ'' لوگ جب ادھر ادھر پھیل گئے تو کافروں نے دفعۃً عقب سے حملہ کیا اور مسلمان سراسیمہ ہوکر جو جہاں تھا وہیں رہ گیا پھر جس طرح موقعہ ملتا گیا لوگ آنحضرت کے پاس پہونچتے گئے فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۷، ص:۲۷۲'' الفاروق، ص:۴۴
- سورہ فتح کے شان نزول کے سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی

نے اس سورہ کے نزول کے سلسلہ میں صحیح بخاری سے اس روایت کا حوالہ دیا ہے کہ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو آنحضرت نے حضرت عمرؓ کو بلا کر ان کے سامنے ان آیتوں کی تلاوت کی (بخاری واقعہ حدیبیہ) اس صلح کا کتنا اثر ہوا مولانا شبلی محدثین کے بیانات سے اس کو اس طرح ثابت کرتے ہیں۔

''محدثین نے لکھا ہے کہ اس وقت تک مسلمان اور کفار بالکل الگ الگ رہتے تھے صلح ہو جانے سے آپس میں میل جول ہوا اور رات دن کے چرچے سے اسلام کے مسائل اور خیالات روز بروز زیادہ پھیلتے گئے اس کا یہ اثر ہوا کہ دو برس کے اندر اندر جس کثرت سے لوگ اسلام لائے ۱۸ برس کے قبل کی وسیع مدت میں نہیں لائے تھے۔ فتح الباری جلد، ص: ۳۴۰'' الفاروق، ص: ۵۲۔

- غزوۂ حنین کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو قبیلہ ہوازن کو معلوم ہوا کہ مسلمان ہم پر حملہ کرنے والے ہیں اس لئے یہ لوگ حنین کے مقام پر جمع ہو گئے'' آنحضرت نے جب یہ خبر سنی تو بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے حنین میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں مسلمانوں نے پہلے حملہ میں ہوازن کو بھگا دیا۔ صحیح مسلم غزوۂ حنین'' الفاروق، ص: ۵۷
- سقیفۂ بن ساعدہ کی اکثر تفصیلات فتح الباری اور احادیث کی دیگر کتابوں سے لی گئی ہیں۔ فتح الباری کے حوالہ سے مولانا شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلافت کی بحث نہیں چھیڑی تھی لکھتے ہیں'' اس سے ظاہر ہوا کہ نہ حضرت عمرؓ وغیرہ نے خلافت کی بحث کو چھیڑا تھا نہ وہ اپنی خواہش سے سقیفۂ بن ساعدہ کو جانا چاہتے تھے'' الفاروق، ص: ۶۶۔
- خلافت کے تعلق سے حضرت عباس اور حضرت علی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی۔ مولانا شبلی نے اس گفتگو کا پورا متن بخاری اور فتح الباری کے حوالہ سے لکھا ہے۔ الفاروق، ص: ۶۷۔

- آنحضرت کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ کے گھر میں ایک مجمع ہوا جس میں تمام بنو ہاشم اور ان کے اتباع شریک تھے اور حضرت علی ان کے پیشرو تھے۔ اس موقعہ پر حضرت عمر نے ایک بڑی ہی اہم بات کہی تھی۔ مولانا شبلی نے حضرت عمر کی بات اور اس پر تبصرہ یا جواب صحیح بخاری اور فتح الباری سے دیا ہے، الفاروق، ص: ۶۸۔
- عربوں کے ذوق جمہوریت کے تعلق سے مولانا شبلی نے حضرت عمر کے اس خیال کو بڑا اہم تصور کیا جو انہوں نے حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے کے بعد ظاہر کیا۔ لکھتے ہیں ''یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ جمہوریت کا طریقہ عرب کا فطری مذاق تھا اور اس لئے عرب میں جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ خواہ نخوہ جمہوری ہوتی عرب میں مدت سے تین وسیع حکومتیں موجود تھیں لخمی، حمیری اور غسانی لیکن یہ سب شخصی تھیں۔ قبائل کے سردار البتہ جمہوری اصول پر انتخاب کئے جاتے تھے لیکن ان کو کسی قسم کی ملکی حکومت حاصل نہ تھی بلکہ ان کی حیثیت سپہ سالاروں یا قاضیوں کی ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکر کی خلافت نے بھی اس بحث کا کچھ فیصلہ نہیں کیا کیوں کہ گو ان کا انتخاب کثرت رائے پر ہوا تھا لیکن وہ ایک فوری کارروائی تھی چنانچہ خود حضرت عمر نے فرمایا''فلا یغتّرن امرا ان یقول انما کانت بیعة ابی بکر فلتة وتمت الاوانها قد کانت کذالک لکن الله وقیٰ شرها (بخاری ج ۲، ص: ۱۰۰۹ مطبوعہ احمد میرٹھ) الفاروق، ص: ۲۴۰۔
- مجلس شوری کا قیام اور اس کے بغیر کسی اقدام کا ارادہ تک نہ کرنا۔ مختلف تجربات سے ثابت ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ مجلس شوری کو بڑی اہمیت دیتے تھے اس سلسلہ میں ان کے جو خیالات تھے وہ تاریخی کتابوں میں درج ہیں۔ یہاں مولانا شبلی نے مستند احادیث کا سہارا لے کر ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ مجلس شوری کے فیصلوں کا کس قدر لحاظ کرتے تھے۔ ''حضرت عمر نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرمادیا تھا کہ مشورہ کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں ان کے خاص الفاظ یہ ہیں لاخلافة الاعن

مشورۃ (کنزالعمال بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ ج،۳،ص : ۱۳۹)
الفاروق،ص: ۲۴۳۔

- تنخواہ کے معاملہ میں حضرت عمر کا اسوہ مثالی تھا حکومت میں کام کرنے والے افراد حکومت سے تنخواہ لینے کو نہایت معیوب تصور کرتے تھے" اس لئے حضرت عمر نے بڑی کوشش سے اس غلطی کو رفع کیا اور تنخواہیں مقرر کیں حکیم بن حزام نے حضرت عمرؓ کے بار بار اصرار پر بھی کبھی روزینہ یا وظیفہ لینا گوارا نہ کیا (کنز العمال جلد۳،ص: ۳۲۲) الفاروق،ص:۲۵۶۔
- دور فاروقی میں فتویٰ نویسی کا عام رواج ہوا۔حضرت عمر نے چند جلیل القدر صحابہ کو اس کام پر مامور کر دیا باقی لوگوں کو فتویٰ دینے سے روک دیا۔گاہے بگاہے ان مفتیوں کی جانچ بھی ہوتی رہتی تھی تا کہ کوئی غلط فتویٰ نہ دے۔ اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ باز پرس کر لی (مسند دارمی)
- جنگوں کے لئے گھوڑوں کی پرورش کا خصوصی اہتمام دور فاروقی میں ہوا۔ان کی تربیت اور نگرانی کیلئے افراد متعین کئے گئے تھے۔ان کے چرنے کے لئے مدینہ سے چار میل کے فاصلہ پر بڑی وسیع وعریض چراگاہ بنائی گئی تھی۔ جہاں "ان گھوڑوں کی رانوں پر داغ کے ذریعہ سے یہ الفاظ لکھے جاتے تھے جیش فی سبیل اللہ (کنز العمال، ج: ۶ ،ص: ۲۳۱) اس روایت کی صحت میں کئی احتمالات ہیں۔ سب سے بڑا احتمال یہ کہ داغنے کا عمل انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی ناپسندیدہ ہے۔ اس سے تکلیف ہوتی ہے....
- قرآن مجید کی تعلیم عام کرنے کیلئے حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں بہت سے قرآن کے عالموں کو مختلف مقامات پر بھیجا۔مولانا شبلی نے ان کی تمام تفصیل کنز العمال جلد اول ،ص: ۲۸۱ سے پیش کی ہے کہ کس قاری نے

کس مقام پر قرآن مجید کی تعلیم عام کی کب اور کہاں اسکا انتقال ہوا۔ الفاروق، ص: ۳۵۵۔

- ''حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی زیادہ اشاعت کے لئے ان تدبیروں کے ساتھ اور بہت سے وسائل اختیار کئے۔ضروری سورتوں یعنی بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور کی نسبت یہ حکم دیا کہ سب لوگ اس قدر قرآن ضرور سیکھیں کیونکہ ان میں احکام وفرائض مذکور ہیں (کنز العمال جلد ا، ص: ۲۲۴) الفاروق، ص: ۳۵۶۔

اس طرح تتبع کرنے سے الفاروق میں بہت سے مقامات کی نشاندہی ہوسکتی ہے جہاں مولانا شبلی نے کھل کر احادیث سے استدلال کیا ہے اور اپنی بات ثابت کرنے کے لئے محدثین کے طرز کو اختیار کیا ہے.

علامہ شبلی کی اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت کے اخذ وقبول کے سلسلہ میں انہوں نے زیادہ اعتماد کنز العمال پر کیا ہے۔ جابجا کتب صحاح ستہ سے بھی روایتیں لی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ کی صلاحیت کے جوہران کے قبولِ اسلام کے بعد کھلے ہیں۔اس لئے ان سے متعلق تمام واقعات کتب احادیث میں ملتے ہیں۔

احادیث کی تشریح میں صحیح بخاری کی مشہور شرح علامہ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری سے استفادہ کیا ہے۔ چونکہ علامہ موصوف ایک عظیم مؤرخ تھے اس لئے ان کی اس تصنیف کا مقصد تاریخی اعتبار سے عہد فاروقی کو نمایاں کرنا تھا چنانچہ وہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں ....

☆☆☆

الفاروق کے فقہی مباحث

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

الفاروق علامہ شبلی نعمانی کی اہم تصانیف میں شامل ہے، یہ اس دور کی علمی فتوحات کا ایک گرانقدر حصہ ہے جب وہ عربی وفارسی پروفیسر کی حیثیت سے ایم، اے، او کالج علی گڑھ سے منسلک تھے۔[1] تاریخ اسلام سے ان کی دلچسپی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ آنے سے پہلے سے قائم ہوچکی تھی لیکن ایم، اے، اوکالج میں اس موضوع پر انہیں جو مفید کتابیں ملیں اور مطالعہ وتحقیق کے جو بہترین مواقع فراہم ہوئے اس سے ان کا تاریخی ذوق پروان چڑھا اور تحقیق وتصنیف کے نئے انداز اور تاریخ نگاری کے نئے اسلوب سے انہیں آگہی ہوئی۔[2]

''الفاروق'' بنیادی طور پر تاریخ کی کتاب ہے اسے پڑھنے سے قبل اول وہلہ یہی احساس ابھرتا ہے کہ اس میں عہد فاروقی کی سیاسی وانتظامی تاریخ زیر بحث آئی ہوگی لیکن اس دور کی مذہبی، علمی وتمدنی تاریخ سے متعلق جو قیمتی معلومات اس کتاب میں فراہم کی گئی ہیں ان سے بلاشبہ علامہ شبلیؒ کے تصورِ تاریخ کی وسعت واضح ہوتی ہے، یہ مباحث خاص طور سے کتاب کے دوسرے حصہ میں ملتے ہیں جنہیں خود صاحب کتاب نے ''سعی ومحنت کا تماشا گاہ'' قرار دیا ہے۔[3] اس کتاب کی تالیف سے سرسید کو کچھ اختلاف تھا لیکن جہاں تک علامہ شبلیؒ کی علمی وتحقیقی صلاحیت اور ''الفاروق'' کی قدر وقیمت کا تعلق ہے وہ ان کے پوری طرح معترف تھے۔[3] الف یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ قرآن، حدیث وسیرت کے ساتھ فقہ سے بھی علامہ شبلیؒ کو کافی رغبت رہی ہے، اس موضوع پر متعدد مضامین اور بعض کتب کے علاوہ اپنی مختلف تصانیف میں انہوں نے فقہی مسائل سے تعرض کیا ہے، پیش نظر کتاب بھی اس پہلو سے مفید وقیمتی مواد سے بھرپور ہے جس سے یقینی طور پر علم فقہ میں علامہ شبلیؒ کی دلچسپی کا واضح ثبوت ملتا ہے، اس کتاب کے فقہی مباحث کو موٹے طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ علم فقہ میں حضرت عمرؓ کی دلچسپی ومہارت اور اس کی اشاعت کا اہتمام۔

۲۔ خلیفہ دوم اور اصول فقہ کے مسائل

۳۔ فقہی مسائل پر اظہار رائے اور افتاء کے اصول وضوابط

۴۔ فقہی مسائل پر خلیفہ کے فتاویٰ واجتہادات

۵۔ ذمیوں کے مسائل اور ان سے متعلق خلیفہ دوم کی قولی وعملی تشریحات

علامہ شبلی نعمانیؒ نے مستند مآخذ کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فقہ سے خصوصی شغف رکھتے تھے اور وہ اس میدان میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ انہوں نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ ''فقہ کا فن تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ وپرداختہ ہے، اپنے خیال کی تائید میں انہوں نے متعدد صحابہ وتابعین کے اقوال کا حوالہ دیا ہے[۴] اور محدثین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں چھ حضرات (حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) ایسے تھے جن پر علم فقہ کا مدار تھا۔ یہی حضرات مفتی کی خدمت انجام دیتے تھے اور کسی مسئلہ سے متعلق نص کی عدم موجودگی یا احادیث کے متعارض ہونے کی صورت میں اس کے حل کی بخوبی صلاحیت رکھتے تھے[۵] مزید براں مصنف گرامی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ تاریخ اسلام کے اولین دور میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وشام فقہ کے معروف مراکز تھے اور ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی سے منسوب تھا اور ان صحابہ کرامؓ میں سے اکثر حضرت عمرؓ کے زیر تربیت رہے ہیں یا ان کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ (مکہ)، حضرت زید بن ثابتؓ (مدینہ) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ (کوفہ) اور حضرت معاذ بن جبلؓ (شام)[۶]۔ اسی ضمن میں علامہ شبلیؒ نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ علم فقہ میں حضرت عمرؓ کو جو فضل وکمال حاصل تھا اس میں ان کی ذاتی ممارست کا کافی دخل تھا، فقہی مسائل پر مسلسل غور وفکر نبی کریم ﷺ سے استفسار اور صحابہ سے مذاکرہ ان کے معمولات میں شامل تھا، بعض اوقات وہ مشکل وپیچیدہ مسائل کو لکھ لیتے ان میں مسلسل غور وخوض کرتے رہتے اور اپنے نتائج فکر بھی قلمبند کرتے۔ کچھ مسائل (مثلاً کلالہ کی نوعیت اور دادا

کی میراث) ایسے تھے کہ آخر وقت تک ان پر انفرادی واجتماعی غور وفکر کا سلسلہ جاری رہا لیکن انہیں اس باب میں تشفی نہ ہوئی[7] فقہ کی نسبت سے حضرت عمرؓ کا یہ امتیازی وصف الفاروق میں خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ فقہی مسائل پر عمومی انداز میں غور وفکر کے علاوہ احکام شریعت کے مصالح وحکم معلوم کرنے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، اس سلسلہ میں اگر کسی حکم سے متعلق انہیں کوئی اشکال ہوتا تو وہ آنحضورﷺ سے رجوع کرتے جیسا کہ سفر میں نماز قصر کے باب میں انہوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ اس کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ راستے محفوظ نہ تھے اور دشمنوں کا خطرہ لگا رہتا تھا جیسا کہ قرآن سے واضح ہوتا ہے اب جب کہ راستے محفوظ ہو گئے تب بھی قصر کیا جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے اس کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ ان واقعات کے حوالہ سے صاحب الفاروق نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم اسرار الدین کی بنیاد ڈالی[8] فقہ کے میدان میں خلیفہ کی مہارت کی ایک اور وجہ فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ دور فاروقی میں متعدد نئے ممالک مسلمانوں کے زیر نگیں ہوئے، ان میں معاشرت ومعیشت کے بہت سے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ لوگ ان کے حل کیلئے مقامی قاضیوں ومفتیوں سے استفسار کرتے، یہ حضرات اہم وپیچیدہ مسائل میں جواب دینے سے قبل خلیفہ سے رجوع کرتے، اس طرح بہت سے غیر منصوص مشکل مسائل میں انہیں غور وفکر اور اظہار رائے کی ضرورت پیش آئی یہی وجہ ہے کہ ان کے فتاویٰ کثرت سے ملتے ہیں جو ان کی مجتہدانہ فکر کے شاہد ہیں[9]

علم فقہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں فقہ کی تعلیم اور فقہی احکام کی ترویج کا بھی خاص اہتمام کیا انہوں نے اس کے لئے مختلف شہروں میں ایسے صحابہ مامور کئے جو فقہ سے خصوصی شغف کے لئے معروف تھے، یہ ماہرین فقہ عام طور پر مساجد میں اپنا حلقہ درس قائم کرتے اور لوگ وہاں اکٹھا ہو کر مسائل دریافت کرتے، بعض اوقات ان شہروں میں فقہی مسائل پر مذاکرہ کے دوران جب صحابہ کسی معاملہ میں کوئی تردد محسوس کرتے تو معلم فقہ سے رجوع کرتے[10] جمعہ کے خطبوں میں اور

عام تقریروں میں ضروری احکام و مسائل بیان کرنا خلیفہ دوم کا معمول رہا ہے وہ موقع کی مناسبت سے فقہی مسائل کی تشریح فرماتے مثلاً حج کا موقع ہوتا تو خاص طور سے حج کے مسائل بیان کرتے شام و بیت المقدس سفر کے دوران خلیفہ نے جو خطبے دیئے وہ کافی مشہور ہیں صاحب الفاروق نے ان کی فقہی اہمیت بھی واضح کی ہے، ان میں اسلام کے ارکان اور فقہ کے اہم مسائل کی وضاحت کے علاوہ اصول فقہ کے بعض مسائل کا بیان بھی ملتا ہے مثال کے طور پر جابیہ (شام) کے مقام پر آپ نے جو خطبہ دیا تھا اس میں حدیث سے اجماع پر استدلال فرمایا[11] حضرت عمرؓ نے فقہی احکام کی ترویج و اشاعت کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً اہم احکام لکھ کر صوبائی حکام و افسران کے نام بھیجتے اور ان کے توسط سے عوام میں انہیں مشہور کراتے، ان تحریری ہدایت ناموں میں عام طور پر ان اہم مسائل کا بیان ہوتا جنہیں خلیفہ صحابہؓ کے مشورے سے طے کرتے۔ بعض اوقات ان میں نئے پیش آمدہ مسائل پر صوبائی حکام کے استفسارات کے جوابات مذکور ہوتے، الفاروق میں ان مسائل میں نماز کے اوقات کی تعیین، جمع بین الصلواتین، باجماعت نماز تراویح زکوٰۃ سے متعلق تفصیلی احکام، نفلی روزہ کے بعض جزئی مسائل اور قضا و شہادت کے اصولوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ الفاروق میں ان مسائل سے متعلق حضرت عمرؓ کی ہدایات کی تفصیلات مندرج نہیں ہیں البتہ ان کے مآخذ (بالخصوص موطا امام محمد و ازالۃ الخفا) کی نشاندہی کی ہے جن میں ان کی تفصیلات ملاحظہ کی جا سکتی ہیں[12]

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت عمرؓ افسران و عمال کے لئے فقہ سے واقفیت ضروری تصور کرتے تھے جیسا کہ صاحب الفاروق کے بیان سے واضح ہوتا ہے اور اہم بات یہ کہ فوجی افسران کے سلسلہ میں بھی خلیفہ اس پہلو کو ملحوظ رکھتے تھے۔ کتاب الخراج کے حوالہ سے انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ جب مسلمانوں کا کوئی لشکر تیار ہو جاتا تو خلیفہ اہل علم و فقہ میں سے کسی کو امیر بناتے[13] مزید براں ایک روایت کے مطابق خلیفہ کا یہ فرمان تھا کہ ہمارے بازار میں وہ شخص سامان نہ فروخت کرے جو تفقہ فی الدین نہیں رکھتا شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

تاجر کے لئے شرعی مسائل کا جاننا ضروری ہے[۱۴] ان تمام باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ مختلف معاملات میں فقہ کو کس درجہ اہمیت دیتے تھے۔

الفاروق کے فقہی مباحث کا ایک اہم حصہ اصول فقہ سے تعلق رکھتا ہے اس کے تحت الفاروق کے مصنف گرامی نے حدیث، قیاس واجماع سے متعلق فاروق اعظمؓ کے اقوال اور ان سے فقہی مسائل اخذ کرنے کے طریقہ کو واضح کیا ہے اور ان کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ استنباط مسائل کے اصول وضوابط مقرر کر کے خلیفہ نے اس علم کی بنیاد رکھی جو بعد کے دور میں مرتب ہو کر اصول فقہ کہلایا، مثال کے طور پر حدیث کے باب میں انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس سے یہ نکات واضح ہوتے ہیں:

۱۔ احادیث کو قبول کرنے یا ان سے اخذ مسائل سے قبل ان کی تحقیق وتفتیش ضروری ہے، راوی کے علاوہ متن کے اعتبار سے بھی ان پر نظر ڈالنی چاہئے۔

۲۔ خبر آحاد اسی وقت قبول کی جائے یا قابل حجت تسلیم کی جائے جب اس کی تصدیق کسی اور راوی سے مل جائے[۱۵]

۳۔ نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال سے اخذ مسائل کے وقت یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان کا تعلق منصب رسالت سے ہے یا بشری حیثیت سے ان کا صدور ہوا ہے[۱۶]

تیسرے امر کے سلسلہ میں صاحب کتاب نے یہ واضح کیا ہے کہ احادیث میں یہ فرق مراتب شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قائم کیا ہے لیکن اگر بہ دقت نظر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس تفریق کے موجد دراصل حضرت عمرؓ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے مختلف رای ظاہر کی اور اپنی خلافت کے دوران بہت سے معاملات میں جداگانہ موقف اختیار کیا اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر ان معاملات میں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کی حیثیت تشریعی ہوتی تو خلیفہ ان میں کمی وبیشی یا تبدیلی کی جراءت کیسے کرتے[۱۷]

اہم ومختلف فیہ مسائل میں فیصلہ لینے کے لئے حضرت عمرؓ نے جو طریق کار اختیار کیا وہ اصلاً اجماع کی عملی شکل تھی جیسا کہ الفاروق کے مباحث سے واضح ہوتا ہے، خلیفہ

گرامی کا یہ معمول تھا کہ وہ اہم ومختلف فیہ مسائل کے تصفیہ سے قبل صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے اور ان کی اجتماعی رای معلوم کرنے کے بعد ہی ان کی بابت فیصلہ صادر فرماتے، اس باب میں ''انساب الاشراف'' کے حوالہ سے بلاذری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کسی ایسے مسئلہ میں جو پہلے سے طے نہیں ہوا تھا بغیر صحابہ سے مشورہ کے کوئی فیصلہ نہیں لیتے تھے[۱۸] اسی طرح صوبائی حکام وافسران کے توسط سے اگر کسی فقہی مسئلہ کی تشہیر مقصود ہوتی تو پہلے اسے صحابہ کی مجلس میں پیش کرتے اور ان کی رای معلوم کرنے کے بعد ہی اس سے متعلق ہدایت جاری فرماتے۔ یہی طرز عمل وہ ان مسائل میں بھی اختیار کرتے جن میں صحابہ مختلف الرای ہوتے علامہ شبلی نعمانیؒ نے حلِ مسائل کے لئے اس طریقہ کو کافی اہم قرار دیا ہے اور اس طور پر جو مسائل طے کے گئے تھے انہیں ''مسائل اجماعیہ'' سے تعبیر کیا ہے ان مسائل کو انہوں نے یکجا ذکر نہیں کیا ہے البتہ یہ وضاحت کی ہے کہ ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے اور احادیث وآثار کے مجموعوں میں انہیں دیکھا جاسکتا ہے، پیش نظر کتاب میں مختلف مقامات پر اس نوع کے چند مسائل کا ذکر ملتا ہے اور وہ ہیں نماز جنازہ کی تکبیرات کی تحدید، شربِ خمر کی سزا کی تعیین، فئی کی تقسیم اور پہلی، دوسری وتیسری بار چوری کرنے کی سزائیں اور مجوسیوں کی شرعی حیثیت[۱۹]

الفاروق میں اصولِ فقہ کی نسبت سے حضرت عمرؓ کا یہ کارنامہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے قیاس کے اصول وضوابط متعین کیسے اور اس کے استعمال کو واضح شکل دی مصنف گرامی نے اس خیال کو غلط قرار دیا ہے کہ قیاس کے موجد حضرت معاذ بن جبلؓ تھے انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حضرت معاذؓ نے فرمایا تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث سے کوئی وضاحت نہ ملے گی تو اجتہاد کروں گا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے ان ی مراد قیاس نہیں تھیں اس لئے کہ اجتہاد صرف قیاس پر منحصر نہیں ہوتا مزید براں ایک روایت کے حوالہ سے انہوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور تک فقہی مسائل قرآن، حدیث واجماع کے ذریعہ حل کیے جاتے تھے۔ اس وقت تک قیاس کا وجود نہ تھا[۲۰] یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ

حضرت معاذؓ نے صرف اجتہد نہیں بلکہ ''اجتہد برائی'' فرمایا تھا اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہنا چاہتے تھے کہ پیش آمدہ نئے مسئلہ کو وہ اپنی رائے کے اظہار یا عقلی استدلال کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کریں گے یا یہ کہ وہ اپنی رای یعنی قیاس کے ذریعہ اجتہاد کریں گے، دوسرے یہاں یہ بھی پیش نظر ہے کہ غیر منصوص مسائل کو اجتہادی عمل یا قیاس کے اصول کے مطابق حل کرنے کی بہت سی مثالیں حضرت عمرؓ کے زمانہ سے پہلے بھی ملتی ہے، خود عہد نبویؐ میں سفر کے دوران یا آپ ﷺ سے دور رہتے ہوئے بعض صحابہ نے کسی نئی صورتحال میں قرآن وحدیث سے واضح رہنمائی نہ ملنے پر اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کیا اور جب بعد میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے ان کے عمل سے رضا مندی ظاہر کی[۲۱] البتہ یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے مواقع پر پہلے قیاس کا لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے اظہار رای یا رای کے ذریعہ اجتہاد کرنے سے تعبیر کیا جاتا تھا، دراصل رای ہی کی منضبط ومنظم شکل بعد میں ''قیاس'' کے نام سے معروف ہوئی، بہر حال قیاس کے اصول وقواعد وضع کرنے کے باب میں حضرت عمرؓ کی اولیت وافضلیت ثابت کرنے کے لئے انہوں نے گورنر کوفہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام خلیفہ کے اس تحریری ہدایت نامہ کا حوالہ دیا ہے جس میں صاف طور پر یہ مذکور ہے **''الفهم الفهم فی ما یختلج فی صدرک مما لم یبلغک فی الکتاب والسنة واعرف الامثال والاشباه ثم قس الامور عند ذلک''.**

(یعنی جو چیز تم کو قرآن وحدیث میں نہ ملے اور تم کو اس کی نسبت شبہ ہو اس پر غور کرو اور خوب غور کرو اس کے ہم صورت وہم شکل واقعات کو دریافت کرو۔ پھر ان سے قیاس کرو)[۲۲]

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ اصول فقہ کے ماہرین نے بعد میں جب قیاس کے تفصیلی اصول وضوابط وضع کیے تو اس کی دو بنیادی شرطیں متعین کیں، اول یہ کہ جس مسئلہ کے لئے قیاس کیا جائے وہ غیر منصوص ہو اور دوسرے یہ کہ مقیس ومقیس علیہ میں علت مشترکہ پائی جائے حضرت عمرؓ کی مذکورہ ہدایت

میں ان دونوں شرطوں کی صراحت ملتی ہے اس طرح قیاس کے باب میں خلیفہ کا یہ فرمان بنیادی اہمیت رکھتا ہے[۲۳]

فقہی مآخذ سے متعلق الفاروق میں جو اصولی مباحث ملتے ہیں ان کے علاوہ خلیفہ کے بیانات، اقوال اور فصل قضایا کے طریقوں سے احکام کے استنباط اور تفریعِ مسائل کے قواعد بھی واضح ہوتے ہیں، خلیفہ نے بہت سے مسائل صحابہ کی مجلس میں غور وفکر اور ان سے بحث ومباحثہ کے بعد طے کیے۔ ان مواقع پر انہوں نے جو تقریریں کیں یا کسی درپیش مسئلہ میں روایتوں کے اختلاف کی صورت میں فیصلہ لینے کے لئے انہوں نے جو طریق کار اختیار کیا ان سے نسخ، تخصیص وتطبیق کے بہت سے اصول قائم ہوگئے مثلاً ایک شخص نے ان کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا کہ میرے غلام نے میری اہلیہ کا آئینہ چرالیا ہے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جائے، آپ ﷺ نے مقدمہ پیش کرنے والے سے فرمایا کہ تمہارے غلام نے تمہاری ہی چیز چرائی ہے اس پر قطع ید کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح بیت المال سے ایک شخص کی چوری کا معاملہ آپ کے سامنے آیا تو اسے بھی اس بنا پر چھوڑ دیا کہ بیت المال میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ حق ہوتا ہے، اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ حدِ سرقہ کا نفاذ اس وقت نہ ہوگا جب مال مسروقہ میں سارق کا کوئی حق ثابت ہو[۲۴]

الفاروق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی قانونی مسئلہ پر اظہار رای یا افتاء کے اصول وضوابط بھی وضع کیے۔ ہر شخص فتوی دینے کا مجاز نہ تھا کسی کو اس کی اجازت دینے سے قبل خلیفہ اس کی صلاحیتوں بالخصوص فقہی مہارت کا امتحان لیتے، مفتیوں کی تقرری کے بعد ان کے ناموں کے اعلان کا اہتمام فرماتے اور بعد میں وقتاً فوقتاً ان کا امتحان لیتے رہتے۔ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک مسئلہ کا ذکر کر کے پوچھا کہ اس باب میں انہوں نے کیا فتوی دیا ہے اور جب انہوں نے اپنا جواب بیان کیا تو یہ فرمایا کہ ''اگر تم اس مسئلہ کا اور کچھ جواب دیتے تو آئندہ تم کبھی فتوے کے مجاز نہ ہوتے''[۲۵] دور فاروقی کے مفتیوں میں حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو ہریرہؓ وحضرت ابو دردأؓ، وغیرھم شامل تھے۔

الفاروق کے فقہی مباحث کا ایک بہت ہی قیمتی حصہ اہم ومختلف فیہ مسائل میں حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور اجتہادات سے تعلق رکھتا ہے علامہ شبلیؒ نے بعض اہم مسائل بالخصوص شرکاء جنگ میں مفتوحہ آراضی کی تقسیم، خمس غنائم میں آنحضورؐ کے اہل قرابت کا حصہ اور باغِ فدک کے معاملہ میں خلیفہ کے فیصلوں کو بیان کرتے ہوئے ان سے متعلق صحابہؓ کے مابین مذاکرہ ومباحثہ کی پوری تفصیل پیش کی ہے اس سے نہ صرف ان مسائل کی نوعیت واضح ہوتی ہے بلکہ خلیفہ اوران سے اختلاف کرنے والوں کے دلائل بھی سامنے آتے ہیں، مزید براں بعد کے فقہاء نے ان مسائل کی بارے میں کیا موقف اختیار کیا کتاب میں اس کی بھی مختصر وضاحت ملتی ہے، ان مسائل میں خلیفۂ وقت نے جو موقف اختیار کیا فاضل مصنف نے اس کی پرزور تائید کی ہے اور نقلی وعقلی دلائل سے اسے کافی مستحکم بنادیا ہے، انہوں نے اس نکتہ پر خاص زور دیا کہ حضرت عمرؓ نے ان مسائل کی بابت جو کچھ فیصلہ لیا وہ مصالح عامہ یا عام مسلمانوں کے مفاد کی رعایت پر مبنی تھا، مثال کے طور پر شام وعراق کی مفتوحہ آراضی کو غانمین میں تقسیم نہ کرنا اس مصلحت کے تحت تھا کہ اس سے فوج کی تیاری اور مملکت اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت اوران کے استحکام میں مدد ملے گی اوراسکی آمدنی سے نہ صرف موجودہ مسلمان بلکہ ان کی آئندہ نسلی بھی متمتع ہوں گی، جیسا کہ اس مسئلہ پراجتماعی مذاکرہ کی تفصیلات کے آخر میں صاحبِ کتاب نے یہ ذکر کیا ہے:

''حضرت عمرؓ کو دفعۃً قرآن مجید کی ایک آیت یادآئی جو اس بحث کیلئے نصِ قاطع تھی یعنی'' للفقراء الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم''۔ اس آیت کے اخیر فقرے ''والذین جاؤا من بعدھم'' سے حضرت عمرؓ نے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے لیکن اگر فاتحین کو تقسیم کردیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا، حضرت عمرؓ نے کھڑے ہوکر نہایت پرزور تقریر کی اور اس آیت کو استدلال میں پیش کیا تمام لوگ بول اٹھے بے شبہ آپ کی رائے بالکل صحیح ہے، اس استدلال کی بنا پر یہ اصول قائم ہوگیا ہے کہ جو ممالک فتح کیے جائیں وہ فوج کی ملک نہیں بلکہ حکومت کی ملک قرار پائیں گے اور پچھلے قابضین کو بے دخل نہیں کیا جائے گا''۔[۲۶]

ان اختلافی مسائل کے علاوہ اور بہت سے مسائل پر حضرت عمرؓ نے اپنی فقہی رائے ظاہر کی، متعدد قدیم مسائل پر از سر نو غور کر کے ان سے متعلق اپنا فتویٰ صادر کیا، الفاروق میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالہ سے ایسے مسائل کی تعداد ہزار کے قریب بتائی گئی ہے، ان میں بہت سے وہ مسائل بھی شامل ہیں جنہیں ''اولیات عمرؓ '' کہا جاتا ہے، ان سے متعلق خلیفہ کے فتاویٰ سے ان کی مجتہدانہ شان بخوبی نمایاں ہوتی ہے۔ علامہ شبلیؒ کے بقول ان میں سے اکثر مسائل میں صحابہ نے ان سے اتفاق کیا اور بعد کے ائمہ مجتہدین نے ان کی تقلید کی، الفاروق میں مختلف مقامات پر اس نوع کے مسائل زیر بحث آئے ہیں کتاب کے آخر میں اولیات عمرؓ کے تحت ۴۵ معاملات کی فہرست پیش کی گئی ہے جن میں تقریباً ۱۵ فقہی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں[۲۷] بعض اہم مسائل جن سے متعلق خلیفہ کے فیصلوں وفتووں کو الفاروق میں نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: نماز تراویح کی جماعت کا قیام، نماز جنازہ کی چار تکبیروں کی تعیین، تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ کا نفاذ، سامان تجارت کے درآمد وبرآمد پر عشور کے نام سے نیا محصول مقرر کرنا، مختلف ممالک میں جزیہ کی مختلف شرح کا تعین، شرب خمر کی حد ۸۰ کوڑے متعین کرنا، قرآن، حدیث وفقہ کے معلمین کا مشاہرہ مقرر کرنا، بیت المال سے مفلوک الحال ذمیوں کے لئے وظیفہ جاری کرنا، امہات الولد کی خرید وفروخت کی ممانعت اور ہجو گوئی پر تعزیری سزا کا نفاذ۔

الفاروق میں ایک اہم فقہی بحث ذمیوں کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے اس سے متعلق کتاب میں مختلف مقامات پر جو بکھرا ہوا مواد ملتا ہے اس سے قطع نظر ذمی رعایا کے حقوق پر ایک مستقل باب بھی اس میں موجود ہے جو بیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے اس کے مطالعہ سے جو اہم مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلامی حکومت اپنے، ذمی باشندوں کے جان ومال کے تحفظ کی ذمہ دار ہے ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کے برابر ہے، کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے تو اسے قصاص میں قتل کیا جاسکتا ہے[۲۸]

۲۔ جزیہ ذمیوں کو تحفظ فراہم کرنے کا معاوضہ ہے جو ان کی استطاعت مطابق عاید

کیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت لینے یا ان کے تحفظ سے معذوری کی صورت میں جزیہ معاف کردیا جائے گا۔ اگر سال میں ایک دفعہ بھی انہوں نے فوجی خدمت انجام دی تو پورے سال کا جزیہ معاف ہوجائے گا، اسی طرح اگر کسی علاقہ میں حکومت انہیں تحفظ نہ فراہم کرسکی اور جزیہ وصول کیا جاچکا ہے تو اسے واپس کردیا جائے گا۔[۲۹]

۳۔ مقامی حالات کے اعتبار سے مختلف علاقوں میں اس کی مختلف شرح عائد کی جاسکتی ہے۔ نصف جنس ونصف نقد کی صورت میں بھی وصول کیا جاسکتا ہے۔[۳۰]

۴۔ نادار ومعذور ذمی بیت المال سے وظیفہ پانے کے مستحق ہوں گے، قرآن کریم میں صدقات کے مستحقین میں فقراء کے ساتھ مساکین کا ذکر ہے۔ فقراء سے مسلمان اور مساکین سے اہل کتاب غرباء مراد ہیں۔[۳۱]

۵۔ وضو کے لئے ذمیوں کا برتن اور اس کا پانی استعمال کرنا جائز ہے، (یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ ازالۃ الخفا کے بیان کے مطابق نجران کے مسلمانوں کے استفسار پر حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا تھا کہ عیسائیوں کے غیر آباد معبد میں نماز پڑھی جاسکتی ہے بشرطیکہ بیری کے پتہ کے ساتھ پانی کو جوش دے کر اسے خوب دھو دیا جائے)۔[۳۲]

۶۔ ذمیوں کی مہمانی قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، انتظامی امور میں ان سے رائے ومشورہ لینا اور انہیں ملازمت دینا جائز ہے۔[۳۳]

الفاروق میں ذمیوں سے متعلق جو فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں ان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے سلسلہ میں خلیفہ کے احکام وفرامین ومعاہدات کے ذکر کے ساتھ مختلف مقامات پر ان کی عملی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر خلیفہ کے طرز عمل سے فقہی نکات اخذ کیے گئے ہیں، الفاروق بنیادی طور پر تاریخ کی کتاب ہے اس لئے مسائل کے ضمن میں واقعات کو ذکر کرنا بہت برمحل اور نفس موضوع کے مطابق ہے، بیان وتبیین کے اس انداز نے الفاروق کے فقہی مباحث کو اور مزید مفید اور قیمتی بنادیا ہے۔

الفاروق کے فقہی مباحث اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ عام طور سے

مستند مآخذ سے حوالوں سے مزین ہیں، البتہ بعض اہم مسائل (مثلاً گھوڑوں پر زکوٰۃ اور اسباب تجارت کے درآمد و برآمد پر محصول عائد کرنے) کے ضمن میں کسی ماخذ کا ذکر نہیں ملتا جو یقیناً تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، الفاروق کے مآخذ میں احادیث کے مجموعے، فقہی کتب، سیرت و تاریخ اور صحابہ و تابعین، فقہاء و قضاۃ کے تذکرے بھی شامل ہیں، ان میں خاص طور سے صحیحین، موطا امام مالک، موطا امام محمد، سنن دارمی، کنز العمال، طبقات ابن سعد، فتوح البلدان، تاریخ طبری، تذکرۃ الحفاظ، اسد الغابۃ، اخبار القضاۃ، طبقات الفقہاء، سیرت عمر بن الخطابؓ، کتاب الخراج، الاحکام السلطانیہ، ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء قابل ذکر ہیں، الفاروق میں فقہی مسائل کے بیان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اہم تصنیف ازالۃ الخفا کا حوالہ بکثرت ملتا ہے، یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اس کا ایک حصہ حضرت عمرؓ کے فقہی کارناموں بالخصوص ان کے فتاویٰ واجتہادات کے تفصیلی بیان سے تعلق رکھتا ہے جس کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں ''فقہ عمرؓ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، الفاروق کے مصنفِ گرامی نے بہت سے مقامات پر ازالۃ الخفا کے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں اور مختلف جگہوں پر اسی کتاب کے حوالہ سے قدیم مآخذ کے بیانات درج کیے ہیں، ان سب کے ساتھ اہم بات یہ کہ علامہ شبلیؒ نے شاہ ولی اللہ پر یہ نقد کیا ہے کہ انہوں نے ازالۃ الخفا میں محبّ طبری کی تالیف ''الریاض النضرۃ'' کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے جب کہ اس کتاب میں موضوع اور ضعیف روایتیں بھی شامل ہیں[۳۴] مزید براں ذمیوں کے حقوق سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے کتاب مذکورہ کی اس روایت کو کمزور و محلِ نظر قرار دیا ہے کہ حضرت عمرؓ صوبائی حکام کو عیسائی ملازم رکھنے سے منع کرتے تھے[۳۵] دوسری جانب دلچسپ بات یہ ہے کہ خود الفاروق میں فوجیوں کے اہل وعیال کی خبر گیری سے متعلق محب طبری کے حوالہ سے ایک روایت بین الواوین نقل کی گئی ہے لیکن حاشیہ میں اسکا کوئی ماخذ مذکور نہیں ہے[۳۶] ازالۃ الخفا میں بھی یہ روایت منقول ہے لیکن وہاں کسی کتاب یا مصنف کا حوالہ نہیں ملتا[۳۷]

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ الفاروق کے فقہی مباحث کمیت

وکیفیت دونوں لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں، علم فقہ کا ارتقا، فقہ کی تعلیم اور فقہی احکام کی اشاعت کا اہتمام، مآخذ فقہ کے استعمال کے اصول، استنباطِ مسائل کے ضوابط، اہم ومختلف فیہ مسائل میں اجتماعی مذاکرہ ومباحثہ، خلیفہ کے فتاویٰ واجتہادات جیسے متعدد اموراس میں زیر بحث آئے ہیں، بعض مسائل پراس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسکے تمام پہلو منقح ہوکر سامنے آجاتے ہیں یہ تمام مباحث مدلل انداز میں پیش کیے گئے ہیں اورانہیں معروف ومستند مآخذ کے حوالہ سے مزین ومستحکم کیا گیا ہے، مزید براں فقہی مسائل کی تشریح وترجمانی کے ضمن میں مصنف گرامی نے متعلقہ تاریخی واقعات بھی بیان کیے ہیں، اس سے ان مباحث کی اہمیت اورزیادہ بڑھ گئی ہے۔

☆☆☆

حواشی ومراجع

۱۔ علی گڑھ میں علامہ شبلیؒ کی مصروفیات پر تفصیلات کے لئے ملاحظہ کریں راقم کا مقالہ: علامہ شبلیؒ اور علی گڑھ، فکر ونظر (شبلی نمبر)، جون ۱۹۹۷ء، ص: ۲۵۱۔۲۸۷

۲۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء، ص: ۱۳۵۔۱۳۷، مکاتیب شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء، ص: ۵۶۔۵۷

۳۔ شبلی نعمانی، الفاروق، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء ص: ۲ (دیباچہ)

۳الف۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۸/۲۰، ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء، ص: ۲۴۷، ظفر الاسلام اصلاحی، مولانا شبلی اور علی گڑھ، فکر ونظر، شبلی نمبر، جون ۱۹۹۷ء، ص: ۲۶۵

۴۔ الفاروق، محولہ بالا ۲/۲۱۰۔۲۱۱،

۵۔ الفاروق ۲/۲۱۲۔۲۱۳

۶۔ الفاروق، ۲/۲۱۱

۷۔ الفاروق، ۲/۲۱۵۔۲۱۶

۸۔ الفاروق، ۲/۱۹۳۔۱۹۴

۹۔ الفاروق، ۲/۲۱۶

۱۰۔ الفاروق، ۲/۱۲۵

۱۱۔ الفاروق ۲/۱۲۱۔۱۲۲، نیز دیکھئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (متن مع اردو ترجمہ از اشتیاق احمد دیوبندی) قدیمی کتب خانہ، کراچی، (بدون تاریخ ۳/۳۱۱

۱۲۔ الفاروق، ۲/۱۲۲۔۱۲۴

۱۳۔ الفاروق، ۲/۱۱۱، ۱۲۳۔۱۲۴، ابو یوسف، کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیہ، القاہرہ، ۱۳۵۲ھ ص: ۱۹۳

۱۴۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ۳/۳۹۴

۱۵۔ الفاروق ۲/۲۰۴۔۲۰۵، ۲۱۰

۱۶۔ الفاروق ۲/۲۰۳، ۲۱۸۔۲۲۰

۱۷۔ الفاروق، ۲/۲۱۹۔۲۲۰

۱۸۔ الفاروق، ۲/۱۲۳۔۱۲۴۔۲۱۶۔۲۱۷ احمد بن یحیٰ البلاذری، انساب الاشراف دار المعارف، مصر، ۱۹۵۹ء ص

۱۹۔ الفاروق ۲/۱۲۳۔۲۱۶۔۲۱۷، ۲۳۱۔۲۳۲، ازالۃ الخفا، ۳/۴۵۴، ۴۹۶

۱۹الف۔ الفاروق ۲/۲۲۲

۲۰۔ الفاروق، ۲/۲۲۲

۲۱۔ عہد نبوی وصحابہ میں مسائل کے حل کے لئے قیاس کے استعمال کی مثالوں کے لئے ملاحظ فرمائیں: عبد الصمد صارم ازہری، تاریخ الفقہ، ادارہ علمیہ، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۳۔۱۸۔۲۵۔ ۲۹، حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی، اصول فقہ، قرآن محل، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۴۷۔۲۵۴

۲۲۔ الفاروق، ۲/۵۶۔۵۷، ۲۲۳

۲۳۔ الفاروق، ۲/۲۲۳۔۲۲۴

۲۴۔ الفاروق، ۲/۲۲۵، ازالۃ الخفاء ۳/۴۵۴

۲۵۔ الفاروق ۲/۶۴۔۶۵

۲۶۔ الفاروق ۲/۳۸۔۳۹، ۲۳۱۔۲۳۴

۲۷۔ الفاروق، ۲/۲۷۷۔۲۸۰

۲۸۔ الفاروق ۲/۱۳۸، ۱۴۳

۲۹۔ الفاروق ۲/۱۵۲۔۱۵۴

۳۰۔ الفاروق ۲/۱۵۴۔۲۱۹

۳۱۔ الفاروق ۲/۱۴۴۔۲۷۹

۳۲۔ الفاروق۲/ ۲۶۱۔ازالۃ الخفاء۳/ ۵۱۷

۳۳۔ الفاروق،۲/ ۴۹، ۱۳۹، ۲۶۱

۳۴۔ الفاروق ۱/۱۴

۳۵۔ الفاروق،۲/ ۲۶۲، ازالۃ الخفاء،۳/ ۲۷۱

۳۶۔ الفاروق،۲/ ۱۸۴۔۱۸۵

۳۷۔ الفاروق ازالۃ الخفاء۳/ ۲۲۸

☆☆☆☆

شبلی کی تاریخ نویسی

اصول وطریقۂ کار۔ الفاروق کے حوالے

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی

جدید تاریخ نویسی اور اس کے محققین اور اصولیین کے نزدیک سوانح نگاری تاریخ نویسی نہیں ہے۔ وہ تاریخی مواد وموضوع تو فراہم کرتی ہے مگر فنِ تاریخ نگاری سے الگ چیز ہے۔ یہ جدید مغربی مؤرخوں کا نقطۂ نظر ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ نگاری یہ ہے کہ انسان اور انسانی تہذیب وتمدن کا مطالعہ اس کے زمان ومکان کے تناظر میں کیا جائے۔ جب کہ تذکرہ وترجمہ اور سوانح میں فردِ واحد کے اوصاف وکمالات اور عطیات پر بحث ونظر مرکوز رہتی ہے۔

بلاشبہ سوانح وتراجم بالعموم فنِ تاریخ نگاری کے جدید تقاضے پورے نہیں کرتے، نہ ان کے اصولوں پر کھرے اترتے ہیں۔ لیکن قرونِ وسطیٰ میں بالخصوص اور موجودہ صدی سے پیشتر زمانہ میں بالعموم سوانح عمریاں اور تراجمِ اشخاص تاریخ نگاری کی ایک معتبر ومقبول صنف تھیں۔ ابھی قریب کے زمانے تک ان کو تاریخی ادب کا حصہ شمار کیا جاتا رہا ہے۔ مزید برآں صاحبِ تصنیف کی کسی سوانحی کام کا جائزہ لیتے وقت اس کے اپنے تصورِ تاریخ نگاری کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

عام اشخاص ورجال کی سوانح عمریاں بھلے ہی تاریخ نویسی کے مخصوص دائرے میں نہ آتی ہوں لیکن ابطالِ وقت اور عہد ساز شخصیات کے تذکرے اور تراجم یقیناً تاریخ نویسی کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور وہ فنِ تاریخ اور اس کی نگارش کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ بالخصوص سیرۃ النبیؐ کے اور سیرِ خلفاء اسلام کہ انہوں نے نہ صرف انسانی تہذیب وتمدن کو مالا مال کیا بلکہ انسان کی فکر وعلم، سماج کی سوچ ونظر اور تمدن کے دھارے کو یکسر منقلب کردیا اور زمان ومکان کی جہات وابعاد کو ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ مادی اور

روحانی دونوں اعتبار سے انسانی زندگی اور عالمی تہذیب وتمدن میں ایسا حیات آفریں، مثبت، مفید انقلاب آیا کہ دنیا جینے کے لائق بن گئی۔

شبلی نعمانی (ذوقعدہ ۱۲۷۴/مئی ۱۸۵۷ء۔ ۲۸/ذوحجہ ۱۳۳۲ء۔ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴) جدید انداز کے مؤرخ نہ تھے لیکن مؤرخ اسلام ضرور تھے، اگر چہ انہوں نے مؤرخ ہونے کا دعویٰ کیا نہ اپنی سوانح عمریوں کو تاریخ قرار دیا۔ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی سوانح کو ''سیرۃ النبیؐ'' اور الفاروق کو ''حضرت عمرؓ کی سوانح عمری'' ہی کہتے رہے۔ وہ سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کی جدید تعریفات اور ان کے جوہری فرق کو خوب سمجھتے تھے۔ الفاروق کے دیباچہ میں انہوں نے اسلامی تاریخ نگاری کے اصول، ارتقاء اور تدوین پر مختصر بحث کی ہے جو ان کی آخری تصنیف ''سیرۃ النبیؐ'' میں زیادہ منقح ومفصل ہوگئی ہے۔

انہوں نے جدید عہد کے دو مصنفوں اور مؤرخوں کا نام لئے بغیر تاریخ کی تعریف بیان کی ہے۔ ایک بڑے مصنف کی تعریف تاریخ یہ ہے کہ ''فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں اور انسان نے عالمِ فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے۔'' جب کہ دوسرے حکیم کی تعریفِ فن یہ ہے کہ ''ان واقعات اور حالات کا پتہ لگانا جن سے یہ دریافت ہو کر موجودہ زمانہ گذشتہ زمانہ سے کیونکر بطور نتیجہ کے پیدا ہوگیا ہے۔'' مؤلف الفاروق نے ان تعریفات کی بنا پر دو باتیں لازمی قرار دی ہیں۔ ''ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کئے جائیں۔ یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے'' (الفاروق ۱۰۔۹) انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ واقعات وعلل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جدید مغربی مؤرخین کی بے اعتدالی سے احتراز کیا ہے کہ قیاس واجتہاد کو صورت واقعہ سے الگ رکھا ہے جبکہ اہلِ یورپ کا عام طرز یہ ہے کہ وہ واقعہ کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لئے ایسی ترتیب اور انداز سے لکھتے ہیں کہ واقعہ ان کے اجتہاد کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی شخص قیاس اور اجتہاد کو واقعہ سے الگ نہیں کرسکتا

(الفاروق ۱۹۔۱۸)

صاحبِ الفاروق کو اعتراف ہے کہ ''قدیم تاریخوں میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں'' پھر تجزیہ کیا ہے کہ ایسا ہونا مقتضائے اسباب تھا:'' کہ تمام ایشیائی تاریخوں بشمول اسلامی تاریخوں میں بیانیہ کا ارتکاز صرف فرمان روائے وقت کے حالات، واقعات بالخصوص فتوحات اور خانہ جنگیوں پر ہوتا تھا۔ اور سلسلۂ اسباب پر توجہ نہ کرنے کا بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ مؤرخین فلسفہ اور عقلیات سے نا آشنا اور فنِ تاریخ کے مختلف فنون جیسے فنِ حرب، علمِ قانون و انتظام، علم الاخلاق، اصول سیاست وغیرہ سے ربط و تعلق اور ان کے باہمی تفاعل سے ناواقف تھے۔ اگر وہ ان دونوں شرطوں کو پورا کرتے تو فن تاریخ کامل و جامع بن گیا ہوتا۔ (الفاروق ۱۱۔۱۰)

جدید نظریات تاریخ کے اعلیٰ معیار پر کتنی جدید تاریخی کھری اترتی ہیں اور صاحبِ الفاروق کی دونوں شرطوں کو کتنی کتابیں پورا کرتی ہیں سرِ دست اس سے بحث نہیں۔ لیکن اس فنی حقیقت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ مؤرخ کے لئے ماہرِ علوم وفنون ہونے کی شرط اور تمام ضروری اور متعلقہ علوم وفنون کے تقاضوں کے مطابق تاریخ نویسی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے البتہ معاشرت وتمدن، اخلاق و مذہب اور تہذیب و تمدن کے علاوہ حاکم و محکوم طبقات کے حالات وواقعات اور عطایا کا تذکرہ اور ان کا سبب و مسبب کے حوالے سے تجزیہ و تحلیل کرنا تاریخ نویسی کا بنیادی فریضہ ضرور قرار دینا چاہئے۔

قدیم تاریخوں کے نقص اور اس کے اسباب سے بحث کے علاوہ الفاروق کے مصنفِ گرامی نے علوم وفنون کے ماخذ وارتقاء سے متعلق ایک بڑی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ ''تمدن کے زمانہ میں جو علوم وفنون پیدا ہو جاتے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا ہیولیٰ پہلے سے موجود ہوتا ہے، تمدن کے زمانے میں وہ ایک موزوں قالب اختیار کر لیتا ہے اور پھر ایک خاص نام یا لقب سے مشہور ہو جاتا ہے .... تاریخ و تذکرہ بھی اسی قسم کا فن ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں انسانوں کا کوئی گروہ موجود تھا تاریخ و تذکرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔'' اس اصولی حقیقت کی تشریح میں شبلی نے اسلاف کے کارناموں، جنگوں اور لڑائیوں، پرانی عادات

ورسوم کی یادگاروں کو قائم رکھنے کی انسانی کاوشوں کا تذکرہ کیا ہے اور ''یہی چیزیں تاریخ وتذکرہ کا سرمایہ ہیں''۔ (الفاروق ۱/۳۔۲)

تاریخ وتذکرہ کے اس عمومی ہیولیٰ اور قابلیت پر ان کے خیال میں عربوں کو دوسری قوموں پر اپنے خصوصی علم انساب، ایام العرب، شاعری اور خطابت وزبان آوری کے سبب فضیلت حاصل تھی۔ اسی خاص عرب خصوصیت کی ''بناپر جب عرب میں تمدن کا آغاز ہوا توسب سے پہلے تاریخی تصنیفات وجود میں آئیں'' عرب تاریخ نویسی کے ارتقاء کا نقطۂ آغاز انہوں نے عبید بن شریہ کی ''کتاب اخبار الملوک والماضیین'' کی نگارش میں تلاش کیا ہے جو حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی (۴۱۔۶۰/۶۶۰۔۶۸۰) کے دورِ خلافت میں کسی وقت خاص انہیں کے امر واہتمام سے وجود میں آئی تھی۔ اس کے بعد عوانہ بن حکم کلبی (م ۱۴۷/) کی کتاب سیرۃ معاویہ وبنی امیہ اور ہشام بن عبدالملک اموی ( ) کے عہد میں تاریخ عجم پر ایک پہلوی کتاب کے عربی میں ترجمہ کئے جانے کا ذکر کیا ہے۔ (الفاروق ۱/۴۔۳)

شبلی نے ۱۴۳ھ یعنی خلافتِ عباسی میں تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تدوین شروع ہونے کی بات کہی ہے اور تاریخ ورجال کی کتابوں میں محمد بن اسحاق (م ۱۵۱/) اور موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱/) کی سیرت ومغازی کو اولین کتبِ سیرت قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فنِ تاریخ کی نہایت ترقی اور بہت بڑے بڑے نامور مورخوں جیسے ابومخنف (م) کلبی (م) واقدی ( ) کی کتابوں اور ان کی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسری تا چوتھی صدی ہجری کے دوران سلسلۂ تاریخ نویسی کو ''نہایت وسعت ہوئی یہاں تک کہ چوتھی صدی تک ایک دفترِ بے پایاں طیار ہوگیا اور بڑی خوبی کی بات یہ تھی کہ ہر صاحبِ قلم کا موضوع اور عنوان جدا تھا''۔ (الفاروق ۱/ ۵۔۴)

مصنف الفاروق نے سیرتِ نبوی، سیرتِ صحابہ اور تاریخِ اسلام کے مورخین کرام کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول وہ قدماء جن کی کتابیں آج ناپید ہیں لیکن ان کی معاصر یا نیم معاصر یا متأخر کتابوں میں ان تصنیفات کا بہت کچھ سرمایہ موجود ہے۔ ناپید تصانیف اور

ان کے مؤلفین کی ایک مختصر فہرستِ جدول کی شکل میں دی ہے جس میں نجیح مدنی، نصر بن مزاحم کوفی، سیف بن عمر اسدی، معمر بن راشد کوفی، عبد اللہ بن سعد زہری، ابو البختری وہب بن وہب، علی بن محمد مدائنی، احمد بن حارث خزاز، عبد الرحمٰن بن عبدہ اور عمر بن شبہ کے اسماءِ گرامی اور ان کی تاریخی وسیرتی تصانیف کے عناوین مع کیفیات موجود ہیں (الفاروق ۱/ ٦-۵)

دوسرے وہ قدماء ہیں جن کی تصنیفات آج بھی موجود ہیں۔ ان میں عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ (۲۱۳-۲۷٦/) کی کتابِ معارف، ابو حنیفہ دینوری (م ۲۸۱/) کی الاخبار الطّوال، ابن سعد (م ۲۳۰/) کی طبقات، یعقوبی کی تاریخ یعقوبی، بلاذری (م ۲۷۹/) کی فتوحِ البلدان اور انساب الاشراف، محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰/ ۹۲۷) کی تاریخ الطبری، مسعودی (م ۳۵٦/) کی مروج الذہب اور الاشراف والتنبیہ، کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ ان کی جدید ترین طباعتوں کے علاوہ ان کی خصوصیات وفنی عطایا کو بھی مختصراً بیان کیا ہے (الفاروق ۸-٦) شبلی کے خیال میں یہ قدماء کا دورِ زریں اور عرب اسلامی تاریخ نویسی کا عہدِ ترقی تھا۔ قدماء کی خصوصیات میں نئی معلومات، سندِ متصل کا التزام، تاریخی بیانیہ میں معاشرت وتمدن سے متعلق جزئیات کو بطور خاص گنایا ہے۔ (الفاروق ۱/ ۹-۸)

مؤلفِ الفاروق کا خیال ہے کہ ''پانچویں صدی کے آغاز سے متأخرین کا دور شروع ہوتا ہے جو فنِ تاریخ کے تنزل کا پہلا قدم ہے۔ متأخرین میں اگرچہ بیشمار مؤرخ گذرے جن میں ابن الاثیر، سمعانی، ذہبی، ابو الفداء، نویری، سیوطی وغیرہ نے نہایت شہرت حاصل کی لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں نے تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا۔ قدماء کی جو خصوصیات تھیں کھو دیں اور خود کوئی نئی بات نہیں پیدا کی'' (۸) ''لیکن اس عام نکتہ چینی میں ابن خلدون کا نام شامل نہیں ہے۔ اس نے فلسفۂ تاریخ کا فن ایجاد کیا اور اس پر نہ صرف متأخرین بلکہ مسلمانوں کی کل قوم ناز کر سکتی ہے۔ اسی طرح اس کا شاگرد علامہ مقریزی بھی نکتہ چینی کی بجائے مدح وستائش کا مستحق ہے'' (الفاروق ۱/ ۹)

شبلی نے اپنے عہد کے ترقی یافتہ فنِ تاریخ وتذکرہ کے بالمقابل قدماء کی تصنیفات اور ان کے ''بے بہا خزانے کو بھی چنداں کار آمد نہیں'' قرار دیا ہے۔ تاہم ان کی مجبوری یہ تھی

کہ انہیں موجودہ تصانیف قدماء پر الفاروق کے بیانیہ وتجزیہ کو استوار کرنا تھا۔ تاریخ نویسی کے لئے انہوں نے انہیں ناتمام ونامکمل واقعات اور اسباب وعلل سے عاری کتب تاریخ وتذکرہ پر بھروسہ کیا۔ ان دونقائص کے علاوہ انہوں نے ان قدیم کتابوں میں مذکور واقعات کی صحت کو جانچنے اور ان پر اعتبار کرنے کے اصول سے بحث کی۔

ان کے خیال میں ''واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں: روایت ودرایت''۔ روایت سے یہ مراد ہے کہ واقعہ کا راوی عینی شاہد ہو اور ''اس سے لے کر اخیر راوی تک'' سلسلۂ روایت متصل ہو اور تمام راوی صحیح، ضابط اور معتبر ہوں۔ جب کہ ''درایت سے یہ مراد ہے کہ اصولِ عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔'' مؤلفِ گرامی نے فنِ رجال کے آغاز وارتقاء سے مختصر بحث کر کے واضح کیا ہے کہ ''وہ اگرچہ اصل میں احادیث نبوی کے لئے شروع ہوا تھا لیکن فنِ تاریخ بھی اس فیض سے محروم نہ رہا۔ طبری، فتوح البلدان، طبقات ابن سعد وغیرہ میں تمام واقعات بسند متصل مذکور ہیں۔'' یورپی فنِ تاریخ کے بالمقابل شبلی کو اسلامی فنِ رجال میں راوی کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے اور اصولِ جرح وتعدیل کے پائے جانے کی امتیازی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ درایت کے اصول بھی اگرچہ موجود تھے چنانچہ ابن حزم، ابن القیم، خطابی، ابن عبد البر نے متعدد روایتوں کی تنقید میں ان اصولوں سے کام لیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ اس فن کو جس قدر ترقی ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی اور تاریخ میں تو اس سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔ (الفاروق ۱/۱۲۔۱۱)

مولانا شبلی نے علامہ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کے تحت درایت کے اصول کو نہایت نکتہ سنجی اور باریک بینی کے ساتھ مرتب کئے جانے کا ذکر کیا ہے اور ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے: ''خبروں میں اگر صرف روایت پر اعتبار کرلیا جائے اور عادت کے اصول اور سیاست کے قواعد اور انسانی سوسائٹی کے اقتضاء کا لحاظ اچھی طرح نہ کیا جائے، اور غائب کو حاضر پر اور حال کو گذشتہ پر نہ قیاس کیا جائے تو اکثر لغزش ہوگی۔'' مقدمہ ابن خلدون کے دیباچہ سے منقول اس اقتباس کی وضاحت مولانا مرحوم نے یوں کی ہے ''کہ واقعہ کی تحقیق کے لئے پہلے راویوں کی جرح وتعدیل سے بحث نہیں کرنی چاہئے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ واقعہ

فی نفسہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر واقعہ کا ہونا ممکن ہی نہیں تو راوی کا عادل ہونا بیکار ہے۔" علامہ موصوف نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ" ان موقعوں میں امکان سے امکان عقلی مراد نہیں، بلکہ اصولِ عادت اور قواعد تمدن کے رو سے ممکن ہونا مراد ہے۔" (الفاروق ۱/۱۳۔۱۲)

مؤلفِ الفاروق نے مستقل فنِ درایت کے بعض اصول وقاعدے فنِ تاریخ یا تاریخ وتذکرہ نویسی میں بروئے کار لانے کی وکالت کی ہے، اور چھ اصول وقواعد کا ترتیب ودفعہ وار بیان کیا ہے:

"۱۔ واقعہ مذکورہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اس کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے، یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیات نظر میں نہ آسکیں۔

۶۔ اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیئے ہیں۔"

اصولِ درایت کی صحت واعتبار کا حوالہ دینے کے بعد انہوں نے حیات وکمالاتِ الفاروق کے بعض اہم پہلوؤں پر اطلاق کر کے واقعہ کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ روایات کی چھان پھٹک میں قدیم ومتاخر روایات کا فرق قائم کیا ہے۔ متاخر روایات کے مذاقِ راوی اور مذاقِ زمانہ سے متاثر ہونے کا اصول دریافت کیا ہے، راویوں کے قیاس کی نشاندہی کی ہے، راویوں کے فرق مراتب کی بنا پر روایات کی صحت واعتبار کے مدارج اور ان کے اختلاف یا درجہ بندی قائم کی ہے۔ مذاقِ راوی یا مذاقِ زمانہ کے سبب روایات وواقعات میں اضافہ یا کمی

کے عناصر کا پتہ لگایا ہے۔ جزئیات کی کمی یا ان میں اضافہ کو مذاقِ زمانہ کی دین بتایا ہے۔

الفاروق کے حوالے سے چند مثالیں بھی اپنے اصولِ درایت کی تائید وتشریح میں دیباچہ میں مختصراً نقل کی ہیں اور اصل مباحث میں ان میں سے بعض واقعات پر مفصل بحث کی ہے۔ مختصر بحثوں میں عیسائی ذمیوں سے متعلق تین احکام فاروقی کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ حضرت عمر کا یہ حکم کہ عیسائی ناقوس نہ بجانے پائیں دراصل قدیم روایات کے مطابق مشروط تھا کہ ایسا وہ نماز کے وقت نہ کریں جو بعد کے نقل نویسوں نے اپنے مذہبی تعصب کے سبب عمومی حکم بنادیا۔ اسی طرح بنو تغلب کے نومسلم عیسائیوں کے بچوں کو اصطباغ (بپتسمہ) دینے کی ممانعت فاروقی تھی جو بعد والوں نے اپنے مذاق تعصب کے سبب عام بنادی۔ عیسائیوں کے لئے مخصوص لباس لازمی قرار دینے کا حکمِ فاروقی انتظامی مصالح سے تھا جسے قیاس راوی نے تحقیر وتذلیل کا شاخسانہ بنادیا۔ (الفاروق ۱/ ۱۶-۱۵)

مولانا مرحوم نے قرطاس، فدک، سقیفہ بنی ساعدہ سے متعلق روایات کا بس حوالہ دیا ہے مگر اصول یہ قائم کیا ہے کہ تاریخی مذہبی روایات کی جب شدت سے تنقید ہوتی ہے تو بزرگ محدثین ومورخین کے اصولِ حزم اور شدت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ ''مشتبہ اور نزاع انگیز'' الفاظ کم ہوتے گئے ہیں یہاں تک کہ خود مسلم وبخاری میں فرق مراتب کا یہ اثر موجود ہے۔ ان واقعات سے اصل بحث تنقیدی اور تجزیہ تحلیلی ان کے مقامات پر کیا ہے۔ (الفاروق ۱/۱۶)

مؤلفِ الفاروق کا واضح عقیدہ ہے کہ جنگوں اور معرکوں کی جزئیات چونکہ مذاق زمانہ کے مطابق اور ان کی ضبط وتحریر مدتوں بعد کی گئی لہذا ان میں مبالغہ کا رنگ آگیا اور وہ ناقابل اعتبار ہیں۔'' لیکن انتظامی امور اور قواعدِ حکومت چونکہ مدت تک محسوس صورت میں موجود رہے اس لئے ان کی نسبت جو واقعات منقول ہیں وہ بے شبہ یقین کے لائق ہیں '' خطبات واقوالِ فاروقی میں زیادہ پر اثر اور فصیح بلیغ جملے اور احکام شرعیہ سے متعلق حصے قابل اعتماد ہیں کیونکہ اول الذکر زبان زد خاص وعام ہوجاتے ہیں اور آخر الذکر فقہی ضرورت سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ انتظامی امور کے باب میں ان کا خیال ہے کہ صورت واقعہ

سے کم تفصیلات نقل ہوئیں جبکہ حضرت عمر کے زہد وتقشف، سخت مزاجی اور سخت گیری کی روایات میں رنگ آمیزی کی گئی۔ اس افراط وتفریط میں مذاق زمانہ کی کارفرمائی بھی تھی۔ (الفاروق ۱/ ۱۷۔۱۶)

عام اصولِ تاریخ نویسی کے ضمن میں صاحبِ الفاروق نے ''طرزِ تحریر'' کا نہایت اہم اور ضروری اصول قائم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ باوجود ''فلسفہ اور انشاپردازی کے مرکب'' پر مبنی اعلیٰ درجہ کی تاریخوں نے قبول عام حاصل کیا ہے تاہم ''درحقیقت تاریخ اور انشا پردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں .... مورخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے .... (الفاروق/ ۱۸)

مولانا شبلی نے اپنی تالیف الفاروق میں جو اصول نگارش ملحوظ رکھے ہیں ان کی تلخیص کی جاسکتی ہے:

۱۔ سوانح وسیر فاروقی میں ہر قسم کے ضروری واقعات نہیں ملتے ان کی تلافی دوسری کتابوں سے کی جاسکتی ہے، جیسے ابن الوردی (کذا) کی الاحکام السلطانیہ، مقدمہ ابن خلدون، کتاب الخراج سے طریق حکومت وآئین، انتظام سے متعلق وکیع کی اخبار القضاۃ سے صیغۂ قضاء کے باب میں، ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل، ومحاسن الوسائل میں اولیات فاروقی کے بارے میں، ابن عبد ربہ کی العقد الفرید اور جاحظ کی البیان والتبیین سے خطباتِ فاروقی، ابن رشیق قیروانی کی کتاب العمدہ سے مذاقِ شعری، میدانی کی کتاب الامثال سے حکیمانہ اقوال اور ابن جوزی کی سیرۃ العمرین سے اخلاق وعادات اور شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء سے فقہ واجتہادِ عمری کے باب میں معلومات مل سکتی ہیں۔ (الفاروق ۱/ ۱۴۔۱۳)

۲۔ روایت کے لحاظ سے کم رتبہ کتابوں سے احتراز کیا ہے جیسے محب طبری کی ''ریاض النضرۃ'' میں حضرت عمر کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں اور حالات کے باب میں شاہ ولی اللہ نے اسی کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے لیکن اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں مذکور ہیں اس لئے میں نے دانستہ اس سے احتراز کیا۔

(الفاروق ۱/۱۴)

۳۔ مختلف حیثیات رکھنے والے واقعات کو مختلف عناوین کے تحت مکرر لایا گیا ہے لیکن ہر عنوان کے تحت اس کی متعلقہ حیثیت کے مطابق۔

۴۔ معتبر کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے اور کم رتبہ کتب کا حوالہ اسی صورت میں دیا گیا ہے جب معتبر کتابوں سے روایات کی تصدیق کرالی گئی ہے۔

۵۔ کتابوں کا حوالہ زیادہ تر انہی واقعات میں دیا گیا ہے جو کسی حیثیت سے قابل تحقیق تھے اور کوئی خصوصیت رکھتے تھے۔ (الفاروق ۱/۱۹)

الفاروق کے مؤلفِ علام نے اپنے دیباچہ میں عام اصولِ تاریخ نویسی کی تشکیل وتدوین کے علاوہ متن کے بعض مباحث میں بھی اصول سازی اور قواعد نگاری کی ہے اور یہ وہ مقاماتِ خاص ہیں جہاں بعض اہم تاریخی۔ مذہبی واقعات کا ذکر آتا ہے یا جن روایات نے اختلافِ نظر اور تنازعۂ واقعات کی صورت پیدا کردی ہے۔ مولانا شبلی کی رگِ حمیت اور حسِ درایت ان روایات کے باب" میں زیادہ پھڑکتی ہے جہاں تاریخی واقعات کی صورت مسخ ہورہی ہو اور حضرت عمر جیسے ان کے ممدوح پر کسی قسم کا حرف آرہا ہو۔

رسولِ اکرم ﷺ کے مرض الوفاۃ کا ایک اہم واقعہ واقعۂ قرطاس کہلاتا ہے۔ وہ مختصراً یہ ہے کہ دوشنبہ کو وفات سے چار دن قبل جمعرات کو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کاغذ دوات لاؤ میں تم کو ایک ایسی دستاویز لکھ دوں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے۔ بعض حاضر صحابہ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ شدت مرض سے ایسا فرمارہے ہیں۔ کتاب اللہ کے بعد ہمیں ایسی کسی دستاویز کی ضرورت نہیں۔ اس تبصرۂ صحابہ کو "ہذیان" سے تعبیر کیا گیا اور بعض روایات میں حضرت عمر پر اس کا الزام لگادیا۔ مولانا شبلی نے اس روایت پر تنقید کر کے واضح کیا ہے کہ:

۱۔ صحابہ کرام کے مجمع کثیر میں سے صرف ایک حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس واقعہ کے راوی ہیں۔

۲۔ واقعہ اتنا اہم ہے کہ دوسروں سے بھی مروی ہونا ضروری تھا۔

۳۔ راوی واحد صرف ۱۳۔۱۴ برس کے تھے اور اس وقت موجود نہ تھے۔ یعنی روایت مرسل ہے۔

۴۔ روایات میں ''ہجر'' (ہذیان) کے واضح الفاظ موجود ہیں لہذا اس کی تاویل نہیں کی جاسکتی۔

۵۔ راوی نے واقعہ کی نہایت ضروری خصوصیتیں چھوڑ دیں لہذا ''ہذیان'' کے واقعہ کا پس منظر نہیں معلوم ہوسکتا۔

۶۔ غالبًا کیا یقینًا یہ ارشاد نبوی عالم بیہوشی میں ہوا ہوگا ورنہ حیات مبارکہ کے بقیہ چار دنوں میں اس کی تعمیل ہوتی۔

۷۔ ممکن ہے کہ کسی کوتاہ نظر پر یہ امر گراں گذرے کہ بخاری اور مسلم کی حدیث پر شبہہ کیا جائے لیکن اس کو سمجھنا چاہیے کہ بخاری اور مسلم کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے'' (الفاروق ۱/ ۵۷۔۵۴)

مولانا شبلی وفاتِ نبوی پر حضرت عمر کی برافروختگی اور رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کا اعلان کرنے والے کو قتل کرڈالنے کی دھمکی دینے کی روایات کو قرائن سے غیر مصدقہ اور غیر معتبر مانتے ہیں، البتہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے منافقین کی فتنہ پردازی روکنے کی خاطر وفات نبوی کی خبر کو پھیلنے سے روکا ہوگا۔ ''اس واقعہ نے روایتوں کے تغیرات سے مختلف صورت اختیار کرلی ہے ....'' (الفاروق ۱/ ۵۸۔۵۷)

تمام متعلقہ روایات وواقعات کی تنقید وتجزیہ کرنے کے بعد اصل واقعہ اور صورت حال واضح کرنے کا اصول وقاعدہ مولانا شبلی نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اولین خلیفہ اسلام منتخب ہونے کے واقعہ میں قائم کیا ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری، فتح الباری، مسند ابویعلی، موطا امام مالک اور طبری وغیرہ کی روایات کے حوالے سے اصل صورت حال واضح کی ہے۔ وفاتِ نبوی کے بعد تمام اکابر صحابہ رسول اکرم ﷺ کی تدفین کے انتظامات میں مشغول تھے جب یہ خبر آئی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا گروہ مسئلہ خلافت پر بحث کررہا ہے۔ اول اول حضرت عمر نے خبر لانے والے کی بات پر کان نہیں دھرا لیکن جب

معاملہ کی نزاکت کا احساس دلایا گیا تو حضرت ابوبکر کے ساتھ حضرت عمر سقیفہ بنی ساعدہ گئے۔
مولانا کے تنقیح وتجزیہ کے نکات یہ ہیں :

۱۔ ''خلافت کے باب میں تین گروہ تھے: (۱) انصار (۲) مہاجرین (۳) بنو ہاشم

۲۔ مہاجرین حضرت ابوبکر کے اور بنو ہاشم حضرت علی کے ساتھ تھے۔

۳۔ جس طرح حضرت عمر وغیرہ آنحضرتؐ کو چھوڑ کر سقیفہ کو چلے گئے تھے، حضرت علیؓ بھی آنحضرت کے پاس سے چلے آئے اور حضرت فاطمہ کے گھر میں بنو ہاشم کا مجمع ہوا تھا۔

۴۔ سقیفہ میں حضرت علی کا نہ جانا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے غم والم میں مصروف تھے اور ایسے پر درد موقع پر خلافت کا خیال نہیں آسکا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقیفہ میں مہاجرین وانصار جمع تھے۔ اور ان دونوں گروہ میں سے کوئی حضرت علیؓ کے دعوے کی تائید نہ کرتا کیونکہ مہاجرین حضرت ابوبکر کو پیشوا تسلیم کرتے تھے اور انصار کے رئیس سعد بن عبادہؓ تھے۔''

۵۔ موقع کی نزاکت اور حالات کی ضرورت متقاضی تھی کہ خلیفہ فوراً مقرر کرلیا جائے ورنہ جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا۔

۶۔ حضرت ابوبکر کا اچانک انتخاب اوران کے ہاتھ پر حضرت عمر کی دفعتاً بیعت نے عام بیعت کا راستہ کھول دیا۔

۷۔ صرف بنو ہاشم اپنے ادعا پر رکے رہے اور حضرت فاطمہ کے گھر میں وقتاً فوقتاً جمع ہوکر مشورے کرتے رہتے تھے لہذا حضرت عمر نے بزور ان سے بیعت لینی چاہی..........حضرت عمر نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں ......(انہوں) نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبادیا۔ بنو ہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اسی وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہوتیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ میں واقع ہوئیں''۔ (الفاروق ۱/ ۶۵۔۵۹)

☆☆☆

الفاروق اور عربی کتب سیرت فاروقی

ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری

مولانا شبلی نعمانی کی زیر بحث تصنیف الفاروق کے بعد عربی زبان میں اس موضوع پر جو تصانیف وجود میں آئیں ان میں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸۔۱۹۵۶ء) کی 'الفاروق۔ عمر' (۱۹۴۴ء) عباس محمود العقاد (۱۸۸۹۔۱۹۶۴ء) کی 'عبقریۃ عمر' (۱۹۴۲ء)، ڈاکٹر طہ حسین (۱۸۸۹۔۱۹۷۳ء) کی الشیخان، عبدالرحمٰن الشرقاوی کی 'الفاروق عمر، محمد رضا کی 'الفاروق عمر' اور عمر التلمسانی کی شہید المحراب کو اہم تالیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں اول الذکر تین تالیفات کا جائزہ لینے کی متواضع کوشش کی ہے۔ جن میں ہیکل کی الفاروق عمر اس حیثیت سے عقاد کی عبقریۃ محمد اور طہ حسین کی الشیخان سے مختلف ہے کہ ہیکل نے سیرت عمر کے ساتھ اس دور کی تاریخ کو موضوع بحث بنایا ہے تاکہ زیر بحث شخصیت پر بہمہ وجوہ روشنی پڑسکے اور شخصیت کی تشکیل کے جملہ عناصرِ واضح ہوسکیں۔ جبکہ عقاد نے تاریخی واقعات کے انبار سے شخصیت عمر پر روشنی ڈالنے والے مواد کا بڑی مہارت اور دقت نظر کے ساتھ انتخاب کرکے زیر بحث شخصیت پر مکمل ترکیز کی ہے اور عبقریت عمر کے جملہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح طہ حسین نے سیرت عمر کو تاریخی ادبی اسلوب میں پیش کرنے کی ادیبانہ کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جلال سعید الحفناوی مصری نے شبلی نعمانی کی سیرت نگاری پر اپنے تحقیقی مقالہ 'فن السیرۃ عند شبلی النعمانی' جس پر قاہرہ یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے، میں ہیکل کی الفاروق عمر اور شبلی کی الفاروق میں مماثلت وتشابہ تلاش کرتے ہوئے ہیکل کے یہاں شبلی کی خوشہ چینی کے امکانات کی بات کہی ہے۔ اور شبلی کو منجملہ دیگر امور کے خصوصی طور پر منہج کی تحدید کی بنا پر ہیکل پر فوقیت دی ہے جو اپنے منہج کی تحدید نہیں کرتے۔[1] یہ بات اگرچہ ہنوز تحقیق طلب ہے لیکن ایک مصری عرب اسکالر کی جانب سے اس قسم کا اعتراف یقیناً

۱۔ دیکھئے مقالہ ''سیرۃ الفاروق عمر بین شبلی النعمانی وہیکل'' ڈاکٹر جلال السعید حفناوی، مجلہ الفیصل، شمارہ اپریل ۱۹۹۶ء/۲۶۷

اہم ہے اور ہم کو اس پہلو سے تحقیق مزید کی دعوت دیتا ہے۔

البتہ یہ بات خاصی حد تک درست ہے کہ علمی وادبی نگارشات، اصلاحی وادبی تحریکات یا اشخاص کے مابین تقابل وموازنہ کی بنیاد پر تقدیر وتقییم کا رویہ کسی ٹھوس نتیجہ تک نہیں پہونچا سکتا۔ اہم علمی وادبی شخصیات اپنے تشکیلی عناصر، علمی وثقافتی پس منظر، مخصوص ماحول، وسائل وتقاضوں، حالات وضرورت اور ذہنی معیار وسطح کی مناسبت سے اپنے مختلف النوع کارناموں میں جو طرز واسلوب اپناتی ہیں وہ اس میں کلی طور پر منفرد ہوتی ہیں۔ ممکن ہے چند مماثلتیں عمومی مسائل ومشاکل کی بنا پر پائی جائیں لیکن ان مماثلتوں کی اساس پر دو شخصیتوں، دو کاوشوں یا دو تحریکوں کا موازنہ اور اس کی بنیاد پر ایک کا دوسرے پر تفوق قائم کرنا صحتمند علمی وادبی رویہ نہیں ہوسکتا۔ زید پر اس وجہ سے تنقید وتبصرہ کہ وہ عمرو کی مانند نہیں اور عمرو کی محض اس وجہ سے پذیرائی کہ اس نے زید سے منفرد اسلوب ونہج اپنایا ہے، نہ زید کے ساتھ انصاف ہے، نہ عمرو کے ساتھ اور نہ علم وتحقیق کے ساتھ۔ اسی کے پیش نظر میں نے اپنی اس متواضع کوشش میں اس طرز کا موازنہ نہ کرکے سیرت عمرؓ پر زیر مطالعہ تالیفات کے عمومی جائزہ پر ہی اکتفا کیا ہے۔

شبلی کی الفاروق اپنے علمی منہج اور تحقیق وتنقیدی اسلوب کی حیثیت سے جدید دور کی اہم علمی تصنیف ہے۔ مؤلف نے جاہلیت سے لے کر وفاتِ عمرؓ تک کے جملہ اہم اور قابل ذکر پہلوؤں کو اس خوبصورت علمی طرز میں اجاگر کیا ہے کہ پوری شخصیت اپنے ماحول میں ایک ممتاز، منفرد اور روشن اکائی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ دربار رسالت میں ہوں، خلیفۂ اول کی ہمراہی میں ہوں یا خلیفۂ ثانی کی حیثیت سے منصب خلافت پر فائز ہوں، امور صلح ہوں یا جنگی معاملات، علمی وفقہی مسائل ہوں یا ادبی وتنقیدی بحثیں، عدلیہ کے مقدمات ہوں یا انتظامیہ کا نظم ونسق الغرض شخصیت عمرؓ اپنی آن بان شان کے ساتھ ہر مقام پر نمایاں، ہر پہلو میں منفرد اور اس کا ہر موقف ثقافت اسلامیہ کا اہم موڑ ہے۔

شبلی نے اپنی اس تالیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت عمرؓ کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے میں خلافت عمرؓ کے سماجی وتمدنی حالات کی

تصویر کشی اور امور حکومت کی تنظیم و اصلاح میں عمرؓ کی حصہ داری پر بحث کی ہے۔ لیکن سب سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جس میں سیرت عمرؓ پر جو بھی کتب ومؤلفات مرتب کی گئیں ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے واقعات وحالات کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کرنے کیلئے روایت کے ساتھ درایت اور عقلی اصول کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھے جانے پر اصرار کیا ہے۔

چنانچہ خود شبلی نے اس اصول کا التزام کرتے ہوئے حیاتِ عمرؓ کے خط وخال اجاگر کرتے وقت محض روایات پر اعتماد نہ کر کے درایت کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور اسی اعتبار سے واقعات کے صحت واعتبار کی درجہ بندی کی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ مسلم علماء نے روایت کے فن کو تو اتنی ترقی دی کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں لیکن درایت کے اصول سازی کا کام اگرچہ ہوا ہے اور ابن حزم، ابن قیم، خطابی اور ابن عبد البر نے روایتوں کی تنقید میں ان اصول سے کام لیا ہے لیکن اس فن کو بالخصوص تاریخ میں، آٹھویں صدی ہجری سے قبل کما حقہ ترقی نہ ہوسکی۔ جب ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی بنا ڈالی اور اس نے درایت کے اصول باضابطہ مرتب کئے۔

سیرتِ عمرؓ مرتب کرتے وقت شبلی نے زیر بحث شخصیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے اسی وجہ سے وہ ان حالات وواقعات کو زیر بحث لانے سے پرہیز کرتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ سیرت نبویؐ کے ضمن میں آتے ہیں یا سیرت صدیقؓ سے براہ راست متعلق ہیں اور جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے حضرت عمرؓ سے بھی ہے۔ بعض ایسے واقعات جن کا تعلق دور نبویؐ یا دور صدیقیؓ سے ہے اور جن کو ذکر کرنا بھی مؤلف نے ضروری سمجھا کہ ان کے بغیر زیر بحث شخصیت کی سیرت ناقص رہ جاتی ایسے تمام واقعات کو احتیاط کے ساتھ اختصار سے رقم کیا ہے۔[۲]

الفاروق میں شبلی نے حضرت عمرؓ کے سیاسی نظام حکومت کو اپنے تحقیقی وتنقیدی

۱۔ شبلی نعمانی: الفاروق/ ۱۳۔۱۴، مرید بک ڈپو، دہلی

۱۔ الفاروق/ ۳۰۔۲۹۔۴۹

اسلوب میں پوری قوت اور زور استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جمہوری اور شورائی حکومت کا جو تصور حضرت عمرؓ نے دنیا کو دیا وہ آج بھی ہر پہلو سے مکمل اور مثالی تصور ہے۔ خلیفہ کی جواب دہی، عمال وحکام کی امانت ودیانت، نظام محاصل، بیت المال، فوجداری، عدلیہ، پولیس، پبلک ورکس، فوج، تعلیم، عوامی فلاح و بہبود، الغرض عمری دور میں ہر وہ نظم قائم تھا جو کسی ترقی یافتہ اور متمدن ملک کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

شبلی نے حضرت عمرؓ پر مستشرقین کے متعدد الزامات کا جواب بھی مدلل علمی انداز میں دیا ہے۔ مثلاً واقعۂ قرطاس پر انہوں نے روایتی ودرایتی اصول پر جس علمی اسلوب اور مدلل طریقہ پر بحث کی ہے وہ مؤلف کے زور استدلال، تاریخی ذمہ داری اور ناقدانہ مزاج پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ اس واقعہ پر گفتگو کرتے ہوئے شبلی نے مسلم سیرت نگاروں کے رویہ کا مواخذہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے در مختلف گروہ نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں، لیکن چونکہ اس بحث میں غیر متعلق باتیں چھڑ گئیں اور اصول درایت سے کسی نے کام نہیں لیا اس لئے اصل مسئلہ نامنفصل رہا۔[۱] ان کا خیال ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عباس سے منقول اس روایت میں راوی نے وہ واقعات چھوڑ دیئے ہیں جن سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت ہوش میں نہیں اور بیہوشی کی حالت میں قلم و دوات طلب فرما رہے ہیں، پس اس روایت سے جس میں راوی نے واقعہ کی نہایت ضروری خصوصیتیں چھوڑ دیں کسی واقعہ پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔[۲]

مؤلف الفاروق نے اس نکتہ کو بھی خصوصی طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ تاریخ محض جنگ وجدال کے حالات بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ انسانی تہذیب وتمدن اور حضارت پر روشنی ڈالنا بھی مؤرخ کی ذمہ داری ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے حالات میں مرتب کی جانے والی کتب سے استفادہ کرنا ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ دیگر علوم وفنون کی کتب سے جن میں ضمناً حضرت عمرؓ کے حالات وواقعات یا ان کے عہد کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی

۱۔ الفاروق/۶۰

۲۔ الفاروق/۶۲-۶۳

ہے، بھی مدد یعنی ضروری سمجھی۔ سیرت وسوانح کی طرز تحریر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مؤرخ اور ادیب او انشا پرداز کے درمیان خط فاصل کھینچ کر دونوں کے مقاصد کے فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے طرز واسلوب کے فرق کو لازمی اور فطری نتیجہ سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مؤرخ کا کام یہ نہیں کہ وہ شاعری وانشا پردازی سے کام لے بلکہ اس کا کام محض نقشہ کھینچنے والے سے مشابہ ہے کہ ''نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ اس کی ہیئت، شکل، سمت، جہت، اطراف اضلاع ایک ایک چیز کا احاطہ کرے نہ کہ مصور جوان خصوصیتوں کو لیتا ہے یا ان کو زیادہ نمایاں صورت میں دکھائے گا جن میں کوئی خاص عجوبگی ہے اور جن سے انسان کی قوت منفعلہ ہے''۔[۱] تاریخ نویسی میں انہوں نے جس خاص قسم کے طرز تحریر کی اہمیت پر زور دیا ہے اس کی رو سے ''مؤرخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یوروپ میں آج کل جو بڑا مؤرخ گذرا ہے اور جو طرز حال کا موجد ہے، رینکی ہے، اس کی تعریف ایک پروفیسر نے ان الفاظ میں کی ہے، اس نے تاریخ میں شاعری کا م نہیں لیا، وہ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب اور قوم کا طرفدار ہوا، کسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے''۔[۲] مؤرخ کی غیر جانبداری شبلی کے نزدیک اس کی بنیادی خصوصیت ہونی چاہئے اور یہ غیر جانبداری اس حد تک ضروری ہے کہ سچی بات کہنے کیلئے مؤرخ کو مذہب ومذہبی اعتقادات کو حارج نہ ہونے دینا چاہئے۔ اس سچی بات کا فیصلہ کرنے کیلئے وہ واقعات وحوادث اور روایات کی چھان پھٹک کا مقدمہ عام طور پر قاری کے رو برو نہیں پیش کرتے بلکہ اپنے طور پر روایت ودرایت کے اصول پر پرکھ کر فیصلہ کن انداز میں اپنی بات کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً:

اسلام عمرؓ کے سلسلہ میں دو مشہور روایتوں میں سے شبلی نے صرف ابن اسحاق کی روایت کو قبول کیا ہے اور اس کے حوالہ میں انساب الاشراف، بلاذری، طبقات ابن سعد، اسد الغابۃ، ابن عساکر اور الکامل لابن الاثیر کے نام تحریر کئے ہیں۔

۱۔ الفاروق/ ۱۹

۲۔ مصدر سابق/ ۲۰

لیکن انداز بیان میں انہوں نے اس روایت کے بہت سے حصوں کو یوں حذف کردیا ہے کہ اگر اصل روایت سامنے نہ ہو تو اس میں حذف کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اصل روایت کو دیکھئے اور شبلی کا اسلام عمرؓ کا تذکرہ دیکھئے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف دیگر روایتوں یا کم از کم اس روایت سے صرف نظر کیا ہے جو خود حضرت عمرؓ کی زبانی منقول ہے بلکہ قبول کردہ روایت میں بھی تراش خراش کی ہے۔

تاریخ اسلام کے مطالعات میں محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸ـ۱۹۵۶ء) کی علمی وتحقیقی کاوشوں میں 'الفاروق عمر' ترتیب میں تیسرے نمبر پر ہے۔ حیاۃ محمد (۱۹۳۵ء)، الصدیق ابوبکر (۱۹۴۲ء) اور پھر الفاروق عمر (۱۹۴۴ء) میں ہیکل نے جو طرز واسلوب اپنایا ہے اور جس عزم وحزم سے اس تاریخی مطالعہ کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ اگرچہ الفاروق عمر سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن ہیکل کا ارادہ اس پورے تاریخی سلسلہ پر اسی طرز میں تحقیقی کام کرنے کا تھا۔ حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد اموی حکومت کے قیام تک، پھر، اشاعت اسلام کی راہیں ہموار کرنے، اسلامی نظم حکومت کے خط وخال واضح کرنے اور اسلامی حضارت وثقافت کو ایک مخصوص شکل دینے میں جن عظیم اسلامی شخصیات نے امٹ نقوش ثبت کئے ہیں ان کا تحقیقی مطالعہ ہی ہیکل کے نزدیک نہ صرف نبی کریم ﷺ کے ذریعہ آنے والے دین کے پیغام کی صداقت وحقانیت کو ثابت کرنے کیلئے سب سے بڑی دلیل ہے بلکہ اسلام مخالف قوتوں کو منہ توڑ جواب ہوسکتا ہے۔

ہیکل کے نزدیک تاریخ اسلام کا مطالعہ اس کو دو مرحلوں میں تقسیم کرکے کیا جانا چاہئے۔ اولین مرحلہ میں آغاز اسلام سے شہادت عثمانؓ تک کے واقعات وحوادث کا مطالعہ اور دوسرے مرحلہ میں شہادت عثمانؓ سے باب اجتہاد کے بند ہونے تک کی تاریخ کا امعان وتعمق سے مطالعہ کیا جانا چاہئے۔ پہلے مرحلہ میں مسلمان متحد ہوکر اسلامی ثقافت کی تشکیل میں مصروف رہے، اس مرحلہ میں ان کے نفوس میں اختلاف وانتشار سرایت نہیں ہوا تھا۔ دوسرے مرحلہ میں مسلمان اختلاف وانتشار کا شکار ہوئے، حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے

مابین اختلافات ہوئے، خلافت کے مسئلہ میں اختلاف رائے پیدا ہوا اور خلافت حکم مطلق میں تبدیل ہوگئی۔ ہیکل کے نزدیک مؤرخ کو ان دونوں مرحلوں کا تحقیقی اور غیر جانبداری سے مطالعہ کرنا چاہئے تا کہ حیات اسلامی میں بنیادی تغیرات کی کمیت و کیفیت کا ادراک ہو اور صحیح صورت حال واضح ہو سکے۔

ہیکل نے اسی فکر کو پیش نظر رکھ کر اپنی مشہور تالیف 'حیاۃ محمدؐ' اور 'فی منزل الوحی' کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی ان شاندار خدمات کا جائزہ لیا ہے جو تعلیمات رسولؐ کی عکاس ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی حضارت وثقافت کی تشکیل میں اساسی نوعیت کی حامل ہیں کیونکہ ان کی تخم ریزی رسولؐ نے کی تھی۔ ان کے نزدیک شیخین کی خدمات جلیلہ کا مطالعہ جو اسلامی ثقافتی تاریخ کا ایک بیش بہا اثاثہ ہیں، ہم کو حال کے سنوارنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی تحریک دیتا ہے۔

ہیکل نے اسلامی مملکت کی تشکیل وتنظیم اور اسے مستحکم ومضبوط بنانے میں حضرت عمرؓ کی خدمات کو علمی وعقلی بنیادوں پر پرکھا اور ان کی اہمیت کا 'رجل عظیم' کہہ کر اعتراف کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کی مجتہدانہ رش نے جو عصر رسولؐ میں ہی نمایاں تھی، حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا اور پھر خود اپنے دور خلافت میں تو ان کو مجتہد اول کی حیثیت سے سمجھا گیا۔ ہیکل کی یہ تالیف شخصیت عمرؓ کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی غرض سے اس دور کی اسلامی تاریخ پر بھی اچھی خاصی گفتگو کرتی ہے۔

علمی اسلوب اور تاریخی منہج میں حضرت عمرؓ کی حیات وخدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ہیکل نے دلائل وشواہد کی روشنی میں واقعات وحوادث کی تحلیل وتعلیل موازنہ ومناقشہ اور بحث وتحقیق سے کہیں اعراض نہیں کیا ہے۔ مختلف روایات کی تحقیق وتنقید اور تخریج وتعلیق میں مؤرخانہ دیانتداری کو ملحوظ رکھا ہے اور شخصیت سے متعلق جملہ افکار ونظریات کو علمی میزان اور عقلی پیمانہ پر ہی قبول ورڈ کیا ہے۔ تاریخی تنقید کے اسلوب میں ہیکل نے فلسفیانہ انداز اور قانونی طرز میں واقعات کی تحلیل وتعلیل کے دوران سبب ومسبّب کے درمیان تعلق کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

اپنی اس تالیف کو ہیکل نے دو اجزاء میں تقسیم کیا ہے۔ جزء اول میں حضرت عمرؓ کی حیات، جاہلی معاشرہ اور اس میں حضرت عمرؓ کے مقام و مرتبہ، ان کی دلچسپیاں، مشغولیات، حضرت عمرؓ کی ثقافت اور اسلام دشمنی وغیرہ جیسے موضوعات پر گفتگو کرنے کے بعد اسلام عمر، عہد نبویؐ اور عہد ابوبکرؓ میں حضرت عمرؓ کی مجتہدانہ شخصیت کے نمایاں پہلو، اسلامی مملکت کے قیام اور اس کے اسباب وعوامل اور حضرت عمرؓ کے بنیادی کردار، عمال و رعایا کے ساتھ ان کے رویہ وغیرہ جملہ اہم موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے جزء میں حضرت عمرؓ کی فتوحات اور اس سلسلہ میں ان کی مخصوص توسیع پسندانہ پالیسی پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس حصہ میں انہوں نے عربوں میں نظام حکومت کے ارتقاء، جزیرہ عرب کو متحد کرنے کی کوششوں، نظام شوریٰ، عمال کے ساتھ ان کے رویہ، بنو ہاشم اور سرداران قریش کے ساتھ ان کی معاملت، مسجد کی اجتماعی حیثیت، عدل وانصاف، دواوین کے قیام، حکومت کی بداوت سے حضارت میں منتقلی، اقتصادی واجتماعی ترقیات، اجتہاد عمر، مساوات وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

اسلام عمر کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ہیکل نے دونوں مشہور روایتوں کو ذکر کیا ہے۔ اور حضرت عمرؓ سے منسوب روایت کی دوسری صورت مسند امام احمد بن حنبل سے نقل کرنے کے بعد اس کو پہلی روایت کے تکملہ کے امکان کا جانب اشارہ کیا ہے۔ اور اسی دوسری روایت کو ترجیح دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق دونوں روایتوں کے اثبات کے بعد کہتے ہیں "واللہ اعلم أی کان ذلک" پہلی روایت کے سلسلہ میں ہیکل کا تبصرہ ہے کہ یہ معقول بات نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ رسولؐ کو قتل کرنے تلوار لے کر اس حال میں جائیں کہ رسولؐ اپنے چالیس اصحاب جن میں حضرت حمزہؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح جیسے مکہ کے ابطال موجود ہوں اور یہ سمجھیں کہ وہ اپنے مقصد کی تنفیذ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات تو درست ہے کہ انہوں نے ایسا عزم کیا تھا اور اپنے اس عزم کی تنفیذ کی وسیلہ کے بارے میں سوچا تھا، پھر جب صحیفہ پڑھا اور اس سے متاثر ہوئے تو اپنے ارادہ سے رجوع کرلیا اور اسلام لے آئے۔ لیکن اس طرح سے ارادۂ قتل جس طرح اس قصہ میں بیان ہوا ہے عقل

اسے تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے میرے نزدیک یہ مرجوح ہے اور راجح وہ روایت ہے جو حضرت عمرؓ کی زبانی منقول ہے اور جس کی تائید ابن حنبل نے اپنی سند میں کی ہے۔[1]

عباس محمود العقاد (۱۸۸۹۔۱۹۶۴) کا اسلوب متانت، ترکیب، قوت ترتیب، فکر کی فراوانی اور تنوع سے عبارت ہے۔ عبارت میں تجدیدی اسلوب اور معنی کی جدّت وندرت میں ان کو کمال حاصل ہے۔ عقاد بیک وقت کئی میدانوں کے شہسوار ہیں اس لئے ان کی تحریریں فکری ندرتوں، معنوی جدّتوں اور شعری خیال آفرینیوں کے عناصر پر مشتمل ہونے کے باوجود بسا اوقات جب صحافتی اسلوب ان پر غالب آتا ہے تو جمع وتدوین، تقسیم وترتیب اور سوال وجواب کے اسلوب میں ان کی ادبی آب وتاب اور علمی موشگافیاں اپنی معنویت کھوتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جب ان پر فلسفیانہ رنگ غالب آتا ہے تو فکر دبتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے لیکن جلد ہی وہ اپنی اس دشواری پر قابو پالیتے ہیں۔ اور ازسرنو پوری شان وشوکت کے ساتھ ایک عالم ادیب کے روپ میں ابھر آتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ خاص پڑھے لکھے طبقہ کو تو مطمئن کرلیتے ہیں لیکن عوامی حلقہ ان کی تحریروں کو سمجھنے میں کہیں کہیں دقت محسوس کرتا ہے۔ عقادؔ شعوری ولاشعوری طور پر کبھی نامانوس الفاظ وتراکیب کا استعمال بھی کرجاتے ہیں لیکن اس خوبی سے کہ یہی نامانوس الفاظ وتراکیب ان کی تحریر میں آکر نہ صرف مانوس لگنے لگتے ہیں بلکہ جس فکر ومفہوم کی ترسیل کے لئے عقاد نے ان کا استعمال کیا ہے اس کی پوری طرح سے ترسیل بھی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر عقاد کی جملہ تحریریں وضاحت وسلاست اور قوت وپختگی کی صفات سے متصف ہیں اور جدید دور کے صف اولؔ کے ادباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

عبقریۃ محمد بنیادی طور پر عظیم شخصیات اور اسلامی ثقافت وحضارت کی شان وشوکت کو ادبی اسلوب، فلسفی فکر اور علمی وتنقیدی طرز میں اخلاقی اشاروں کے ساتھ شخصیت کی عبقریت کے اہم نقاط پر بحث مرکوز کرنے اور ان کو اجاگر کرنے کے نظریہ کے تحت لکھی گئی ہے۔ عقاد نے تاریخ اسلامی کی تفصیلات سے بحث نہیں کی ہے بلکہ زیر بحث شخصیت کو اجاگر کرنے والے پہلوؤں پر ہی توجہ مرکوز کی ہے۔

۱۔ الفاروق عمر ۱/۴۳۔۴۵

کتاب کے سارے ابواب ایک دوسرے سے مربوط اور ایک ہی فکر کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور شخصیت عمرؓ ہر باب میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر ایک ہی قصہ یا واقعہ کا مختلف مواقع پر اعادہ ہو گیا ہے۔

'عمر رجل ممتاز' میں، حضرت عمرؓ کے اپنے اعمال، اخلاق اور شخصیت کی تشکیل میں ان کی عبقریت کو واضح کیا گیا ہے۔ قدماء کے نزدیک عبقریت کا جو تصور تھا یعنی فراست و تجربہ کاری، اور متاخرین کے نزدیک عبقریت کا جو تصور تھا یعنی علم اور مشاہدہ، دونوں پیمانوں پر عمر کی شخصیت کھری اترتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی ہیبت ان کی جسمانی قوت کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت نفس کی وجہ سے تھی۔ اس سلسلہ میں عقاد نے جو دلائل و شواہد پیش کئے ہیں ان میں اس باندی کا قصہ بھی ہے جو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی موجودگی میں دف بجا رہی تھی، حضرت عثمانؓ داخل ہوئے تو وہ دف بجاتی رہی لیکن حضرت عمرؓ کے آتے ہی ٹھٹھک گئی۔ اس موقعہ پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اے عمر! تم سے شیطان ڈرتا ہے''۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کی جسمانی قوت، عبقریت کی علامتیں، عجیب و غریب فراست، رجائیت اور مکاشفہ وغیرہ کو عقاد نے علمی و تحقیقی اسلوب میں اجاگر کیا ہے۔ صفت مکاشفہ کے ضمن میں انہوں نے ''یا ساریۃ بن حصن، الجبل الجبل'' کا مشہور واقعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس صفت کو ٹیلی پیتھی سے تعبیر کرتے ہوئے اس کی سائنسی و علمی حیثیت پر بھی گفتگو کی ہے۔

صفات عمرؓ میں، مؤلف نے حضرت عمرؓ کو، ظاہر و باطن میں یکسانیت، عدل، جذبۂ رحم، غیرت و حمیت، اور ذہانت و فراست وغیرہ میں اپنی قسم کی عدیم النظیر شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مستشرقین کے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہ حضرت عمرؓ محدود التفکیر تھے، عقاد لکھتے ہیں کہ عمر نہ خب (فریبی، دغاباز) تھے اور نہ خب ان کو فریب دے سکتا تھا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے ایمان قوی اور اعراض عن الدنیا وغیرہ جیسی ذاتی صفات پر علمی گفتگو کی ہے۔

اسلام عمر کے باب میں عقاد نے مذہب کی تبدیلی کے اسباب و عوامل پر بھرپور گفتگو

کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تبدیلی مذہب کے ذریعہ عمرؓ نے اپنی شخصیت، اپنے ماضی، اپنی دنیا اور حیات بعد الموت سب کو تبدیل کر دیا تھا۔ یہ اسباب ان کی زندگی میں کچھ تو پہلے ہی سے تیار ہو رہے تھے اور اسلام سے عمر کی قربت اسی روز سے ہوگئی تھی جب ان کو ان دو عورتوں کی شکایت پر ندامت ہوئی جن سے عمرؓ نے اسلام کے سلسلہ میں مخالفت کی تھی، اور جس دن ام عبد اللہ بنت حنتمہ کی ہجرت پر ان کو افسوس ہوا تھا۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنی بہن کے چہرہ پر خون دیکھا اور اپنی بہن و بہنوئی کو اسلام لانے پر تنبیہ کی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دونوں روایتوں کو سامنے رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کے اندر نماز میں قرآن پڑھتے سنا اور ان کے اندر اسلام داخل ہوگیا۔ دوسری یہ کہ جب انہوں نے اپنی بہن کے شوہر کو سورہ طٰہٰ کی آیات پڑھتے سنا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہر کر اسلام لے آئے۔ اسباب اسلام میں ان کی رائے ہے کہ حضرت عمرؓ کی صفت بلاغت اور ادبی تنقید سے گہرا شغف ان کو قرآن کی بلاغت سے متاثر کرنے کا سبب بنا۔ دینی رجحان، جو ان کے خاندان میں پہلے سے موجود تھا، پھر ان کی فراست و ذہانت اور اسی طرح کی دیگر صفات وعوارض ان کو اسلام سے قریب کرنے کا سبب بنے۔[1]

اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنے ماموں کی پناہ واپس کر کے، قریش سے اسلام کے بارے میں واضح رویّہ اپنا کر، ہجرت کے سلسلہ میں شجاعت و جوانمردی کا مظاہرہ، عبادت میں خشوع وخضوع، معاملات ومعیشت میں اسلام سے وفاداری اور وابستگی کے جو نمونے پیش کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں اور ان سب سے ان کے اسلام کی پختگی ثابت ہوتی ہے۔ ذمیوں اور اہل کتاب سے ان کا رویّہ اکرام کا تھا اور اسلام میں ان کی شدّت اہل کتاب وذمیوں کے حق میں امن وتحفظ کی ضمانت تھی۔ اس ضمن میں عقاد نے حضرت عمرؓ کی صفات، ان کے طرز حکومت اور ذمیوں واہل کتاب کے ساتھ ان کی معاملت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور روایات وواقعات کی روشنی میں حضرت عمرؓ کی شخصیت کے امتیازی پہلوؤں کو پوری دیانتداری اور کامیابی سے اجاگر کیا ہے۔

"عمر والدولة الاسلامية" میں مؤلف نے حضرت عمرؓ کو خلافت سے کئی سال

قبل سے اسلامی حکومت کا مؤسس قرار دیا ہے۔ علی الاعلان اسلام کی دعوت دینے، حضرت ابوبکرؓ سے بیعت میں پہل کرنے، جمع قرآن اور پھر، حضرت ابوبکرؓ کو موقع نہ ملنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں جن امور کی تکمیل کی وہ سب تاسیس حکومت کا ثبوت ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کسی کی اتباع نہیں کی بلکہ خود اپنی رہنمائی میں امور انجام دیئے۔ جمع قرآن کے بعد لغت کی تصحیح اور فساد سے اس کی حفاظت کا مشورہ دیا، حکومت اسلامیہ کا جو نظام قائم کیا وہ بھی اپنی جگہ پر نادر اور نیا تھا جو اس سے قبل کہیں موجود نہ تھا۔ ہجری تاریخ، دواوین کے قیام، عدلیہ وانتظامیہ کے اصول، بیت المال، ڈاک، سرحدی حفاظت وغیرہ کا نظم اور ہر ایک شعبہ کیلئے اصول سازی عمرؓ ہی کے وہ کارنامے ہیں جو قیام حکومت کے اہم عناصر شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے نظام شوریٰ کو جس ذہانت وتجربہ کاری سے مرتب کیا وہ ایک مثالی نظام ہے وار ان کا یہ قول اس نظام کی اساس ہے "إذا کان فی القوم ولیس أمیرھم کان کأنہ امیر ھم واذا کان امیرھم کان کأنہ رجل منھم"۔ اسی طرح جنگی دستور، اصلاح مالیات، خلافت کی مسئولیت، والیوں وعمال کی تنخواہوں کی تقسیم میں سخاوت، صوبوں کے لئے دستور سازی، حکام کے غبن کے سلسلہ میں ان کے اصول، محاسبہ کا نظام، عدلیہ کے مناصب، اجتماعی اخلاق، جزیہ کا نظام، اقتصادی نظام، مساوات، اوقاف، امن وامان، حکومت ودین جیسے امور میں ان کی مجتہدانہ کاوشیں اور وضاحت وصراحت سے ان امور کی ترتیب وتشکیل حضرت عمرؓ کے شاندار کارناموں کا حصہ ہیں۔ حکومت ودین کے سلسلہ میں عقاد نے حضرت عمرؓ کی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ دین کو طغیان کی قوت سے زیادہ کوئی چیز منہدم نہیں کرتی۔ الغرض حضرت عمرؓ حکومت اسلام کے سب سے بڑے مؤسس تھے جس کی تاسیس انہوں نے ایمان کے زور پر کی نہ کہ ڈنڈے کے زور پر۔

مؤلف نے اس عنوان کے تحت جملہ اغراض ومقاصد کو پیش نظر رکھ کر ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو شخصیت عمر کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں اوران کی اصلاحات، مجتہدانہ روش اور بے مثال شخصیت پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۔ عبقریۃ عمر/ ۱۱۶۔۱۱۹

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (۱۸۸۹ـ۱۹۷۳) اپنی تالیف 'الشیخان' کا آغاز ان کلمات سے کرتے ہیں: ''یہ شیخین ابوبکر وعمر رحمہما اللہ کے بارے میں مختصر گفتگو ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ اس گفتگو میں ایسی کوئی نئی بات ہوگی جو اب تک نہیں کہی گئی، قدماء ومحدثین نے ان پر کتنا کچھ لکھا ہے، مستشرقین نے بھی ان پر کتنا کچھ لکھا ہے........ اُنہوں نے اور اِنہوں نے جو وسائل بحث واستقصا ان کو حاصل تھے، ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ان شخصیات کا سنجیدہ مطالعہ کیا ہے اور ان سبھوں نے شیخین پر وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ممکن تھا''۔[1]

اس تواضع وانکساری، انکار جدید اور شیخین سے اپنی محبت کے اعلان اور اس احساس ندامت کے ساتھ کہ شخصیت رسولؐ پر ایک سے زیادہ مواقع پر گفتگو کرنے اور حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ پر اپنے مطالعات کے باوجود اب تک انہوں نے شیخین پر کچھ نہیں لکھا، وہ اپنی غرض وغایت واضح کرتے ہیں: ....اس کے باوجود میں ان کی ثناء کا ارادہ نہیں رکھتا، اگرچہ وہ ثناء کے اہل تھے، اب تک کی نسلوں نے مسلسل ان کی ثناء ہی کی ہے، لیکن یہ ثناء کس کام کی نہیں، نہ ان کے اور نہ قاری کے۔ وہ دونوں تو ثناء کو سخت ناپسند فرماتے تھے''۔[2]

طٰہٰ حسین نے شیخین کی حیات اور ان کے زمانہ میں ہونے والے واقعات کی روایات میں تشکیک کے پہلو تلاش کر کے ان کو قصص سے تعبیر کیا ہے۔ قدماء پر ان کا الزام ہے کہ انہوں نے تاریخ کے نام سے کذب اور تسجیل قصص سے کام لیا ہے۔[3] اس ضمن میں انہوں نے اپنی جن آراء کا تفصیلی اظہار کیا ہے ان کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

جب خود نبیؐ کے سلسلہ میں راویوں نے کذب سے کام لیا اور اس کذب کا مصدر اکثر وبیشتر اکبار وتقدیس تھا تو شیخین کے سلسلہ میں تقدیس کے مقصد سے اس قسم کی کذب بیانی پر کوئی تعجب کیونکر ہوسکتا ہے۔ قدماء ان کے عہد کے بڑے واقعات کو یوں بیان کرتے ہیں گویا وہ موجود تھے اور انہوں نے بچشم خود ان واقعات کا مشاہدہ کیا ہے، حالانکہ سچ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے سنے ہوئے واقعات بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ جنگی مواقع کی تاریخ کو پوری

۱۔ الشیخان: طٰہٰ حسین/ ۵
۲۔ مصدر سابق/ ۶
۳۔ مصدر سابق/ ۶ و ۷

باریکی سچائی اور تفصیل کے ساتھ بجنسہ بیان کرنا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ان مواقع پر اگر وہ موجود بھی تھے تو ان کو اپنی جنگی مصروفیات سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ جنگ کی تفصیلات وجزئیات کا علم حاصل کریں۔ وہ قدماء جو موقع پر موجود نہیں تھے اور جنہوں نے مشاہد کی حیثیت سے کسی واقعہ کی روایت نہیں کی ہے بلکہ عرب وموالی راویوں سے سن کر نقل کیا ہے اور صرف فاتح گروہ کی زبان سے ساری تفصیلات بیان کی ہیں اور وہ بھی ان راویوں کی زبانی جنہوں نے فتح ونصرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ دوسروں سے سن کر واقعات کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے شکست خوردہ اقوام ایرانیوں ورومیوں سے بھی کوئی اطلاعات حاصل نہیں کیں انہوں نے تو صرف ایک ہی آواز سنی تھی اور وہ تھی عرب آواز۔ جبکہ محقق مؤرخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ فاتح ومنہزم دونوں کی بیان کردہ روایات کی روشنی میں تاریخ مرتب کرے۔

طہٰ حسین نے قدماء پر کذب بیانی اور دوسروں سے جھوٹی روایات کو نقل کرنے کا الزام لگا کر ساری اسلامی تاریخ کو مشکوک بنانے کی مذموم کوشش کی ہے۔ غور طلب ہے کہ یہ قدماء خود مواقع جنگ پر موجود تھے اور جن تک سند روایت پہونچتی ہے وہ سب کے سب اصحاب رسولؐ تھے۔

قدماء کے بعد متاخرین کے بارے میں بھی طہٰ حسین کا الزام ہے کہ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ خود تمام مواقع پر موجود تھے حالانکہ انہوں نے بچشم خود ان واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا۔ ان کی مراد ان راویوں سے ہے جو بغیر سند کے واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اس عمل سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے روایت کے متعین اصول وقواعد کا التزام نہیں کیا۔ قدماء نے اگر کسی روایت کو قیود وقواعد کے التزام کے ساتھ بیان کیا ہے اور بعد کے علماء نے اس روایت کو قدماء سے نقل کیا ہے تو اس میں شہود حادث کی شرط کیونکر لازم کی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر سب سے پہلے خود مؤلف طہٰ حسین پر یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ وہ اکثر مواقع پر شہود حادث کے بغیر تاریخ اسلام پر منقول روایات کے ہی سہارے اپنے خیالات وافکار کا اظہار کر کے اس کی تکذیب وتشکیک کے

مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور بسا اوقات بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے کذب بیانی کا الزام محض مفروضے قائم کر کے لگاتے چلے جاتے ہیں۔

فتح مندی اور تقدیس کو طہ حسین نے کذب بیانی کے اہم اسباب میں شمار کیا ہے اور ان کا تبصرہ ہے کہ یہ ساری روایات فتحمند طبقہ سے مروی ہیں جب کہ ضروری تھا کہ شکست خوردہ ایرانیوں و رومیوں وغیرہ مفتوح اقوام سے منقول روایات بھی پیش نظر رکھی جاتیں۔ یہ بات نا قابل فہم ہے کہ اگر فتحمند عرب و موالی جھوٹ بول سکتے ہیں تو رومی، ایرانی یا دیگر شکست خوردہ اقوام جھوٹ کیوں نہیں بول سکتیں۔ بلکہ مؤخر الذکر طبقہ سے تو جھوٹ کا احتمال زیادہ ہے اور اس صورت میں ان کی روایات سے تو مزید شک وشبہ پیدا ہوسکتا تھا۔

تحقیقی عمل میں شک وشبہ اگر حقیقت تک رسائی کی غرض سے ہو تو بلا شبہ یہ تحقیقی رویہ قابل ستائش ہے کہ روایت و درایت دونوں کو تنقید کی کسوٹی پر رکھنا تحقیق کی روح ہے۔ لیکن اگر شک برائے شک ہو تو بحث و تحقیق کے بعد بھی نتائج اسی طرح مشکوک رہیں گے جس طرح بحث و تحقیق سے قبل تھے۔

عہد شیخین کے واقعات کی تفصیلات سے انکار، قدماء سے اعراض اور متاخرین کی روایات کو، اس شک میں کہ انہوں نے بغیر بحث و تحقیق کے ان روایات کو قدماء سے نقل کر دیا ہے، شک کے دائرہ میں رکھ کر طہ حسین صرف ان واقعات کے اجمال کو قبول کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے:

"............تو عربوں کو اسلام کی طرف لانا جبکہ انہوں نے انکار کر دیا تھا، رومیوں کو شام، جزیرہ، مصر اور برقہ سے نکالنا، عراق سے ایرانیوں کو نکالنا اور ان کے ممالک میں ان کی قوت ختم کر دینا یہ سارے واقعات ایسے ہیں جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ شیخین کے اس چھوٹے سے عرصہ میں ان کے واقع ہونے میں کوئی شک ہے"۔

طہ حسین واقعہ یا خبر کو مجمل تو قبول کرتے ہیں لیکن مفصل کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ روایات اجمال میں تو متفق ہوتی ہیں لیکن تفصیل مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کذب وافتراء کا سامنا ہے تو پھر اس کذب کے ساتھ مجمل واقعہ کی

تصدیق کیونکر کی جاسکتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔'' میں سمجھتا ہوں کہ مؤرخ جب یہ کہتا ہے: شیخین کے زمانہ نے مسلمانوں کی رومیوں پر فتح کا مشاہدہ کیا، اس دور میں مسلمانوں نے ایرانیوں کی مملکت کا خاتمہ کردیا تو اس نے سب کچھ کہہ دیا اور ایسے معجزہ کو ریکارڈ کردیا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی''۔[۱]

گویا سیرت وتاریخ محض چند مختصر جملوں میں بیان کی جاسکتی ہے۔ تفصیلات کی ان کے نزدیک چنداں ضرورت نہیں۔ معلوم نہیں خود طہٰ حسین نے اتنی تفصیلات میں جانے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔

قدماء ومتأخرین جنہوں نے حوادث کا مشاہدہ کیا اور جنہوں نے نہیں کیا یا جنہوں نے متأخرین مورخین تک ان روایات کو منتقل کیا، بغیر کسی تعیین کے وہ ایک عام فیصلہ صادر کرکے پوری تاریخ کو تلفیق وتشکیک کے دائرہ میں لے آتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود انہوں نے تاریخ کے جن پہلوؤں کی تصدیق کی ہے وہ بھی انہیں تاریخی واقعات کی بناپر کی ہے جن کو وہ مشکوک قرار دے چکے ہیں۔ ان کی تصدیق وتکذیب کا پیمانہ کیا ہے اس کی کوئی صراحت نہیں۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ان کا نفس اور مستشرقین جن روایات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو، ان کو قبول کرنے میں ان کو تامل نہیں ہوتا۔

ایک طرف تو وہ قدماء متأخرین پر کذب بیانی کا الزام لگاتے ہیں دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں شیخین کی سیرت، ان دونوں کے عہد میں رونما ہونے والے واقعات اور ان کے بعد مسلمانوں کی زندگی پر ان کی مخصوص چھاپ کو سامنے رکھ کر ان کی شخصیتوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے ان کی شخصیات، واقعات اور ان کی مخصوص چھاپ کر سمجھنے کے لئے مؤرخ کو ان قدماء ومتأخرین کا سہارا لینا پڑے گا جن پر وہ کذب بیانی کا الزام لگا چکے ہیں۔

الغرض طہٰ حسین نے بنیادی تفصیلات سے دامن بچاتے ہوئے سیرت عمرؓ کے پہلوؤں کو تشکیک کی چادر میں لپیٹ کر ادبی قصصی اسلوب میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور بس۔

۱۔ مصدر سابق/ ۱۰۰۹

برطانوی مستشرقین کا مطالعۂ سیرت

اور ''الفاروق''

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

مکہ مکرمہ کے قبیلۂ قریش کی ممتاز و معروف شاخ بنو عدی کا مایۂ ناز چشم و چراغ، فنون سپہ گری اور خطابت میں نابغۂ روزگار، اسلام اور اہل اسلام کی عداوت و دشمنی میں سرگرم و فعال، دعائے نبیؐ کا جواب، عزت رسالتمآب ﷺ، خلافت راشدہ کا انتہائی اہم باب، اسلام اور مسلمانوں کی عظمت و رفعت اور شوکت وحشمت کا محافظ و پاسباں، نبی کریم ﷺ کے بے مثل محب و رفیق اور یار غار خلیفۂ اول کے انتہائی لائق و فائق جانشین کو دنیا فاروق اعظم کے لقب سے جانتی ہے اور انہیں عمر بن الخطابؓ سے موسوم کرتی ہے۔ محسن انسانیت اور داعی اعظم ﷺ نے مخالفت ومخاصمت کے طوفانی کشمکش میں جن دو زور آور زعمائے قریش میں سے کسی ایک کے قبول اسلام کو اپنی دعاء خاص[1] کا موضوع بنایا تھا وہ ابوجہل اور عمر بن الخطابؓ تھے، لیکن قسام ازل نے یہ شرف وسعادت عمر بن الخطابؓ کے نوشتۂ تقدیر میں مرقوم کردیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن سب سے بڑا دوست اور بے نظیر جاں نثار بن گیا۔

قدمبوسی رسولؐ، جوش عمل، حق گوئی و بیباکی، زہد و اتقاء، درویشی و دینداری، تحمل و بردباری، تواضع و خاکساری، کرامات و مناجاتیں، محدثانہ شان و فقیہانہ بصیرت، عدل وانصاف، امامت و اجتہاد، سیاست و حکمرانی، پہاڑوں سے ٹکرا جانے والا حوصلہ اور فاتحانہ شان و شوکت، یہ سب فاروق اعظمؓ کی کتاب زندگی کے درخشاں ابواب ہیں جنہیں منصۂ شہود پر لانا علمی و دینی فریضہ اور شرف وسعادت کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آپ کی شخصیت رسول اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ کے مقدس ترین مشن لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ[2] کی ترجمان اور عملی تفسیر ہے۔ اسلئے اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی بعض تحفظات کو روا رکھتے

ہوئے ان کے کارناموں کو گلہائے عقیدت اور خراج تحسین پیش کیے ہیں۔ ایک مشہور مسلمان مؤرخ اور محقق کی رائے درست اور بجا ہے کہ فاروق اعظم کی شخصیت میں موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام، ابو حنیفہ وابراہیم ادھم، سکندر وارسطو اور تیمور ونوشیرواں کی شخصیتیں ایک ساتھ جمع ہوگئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے ایک دوسرے سوانح نگار اور جید عالم دین کے بقول:

''حضرت عمرؓ کے مسلمان ہوجانے سے اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ اس وقت تک چالیس یا اس سے کچھ کم وبیش آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے لیکن وہ نہایت بے بسی ومجبوری کے عالم میں تھے۔ اعلانیہ فرائض مذہبی تو ادا کرنا درکنار، اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ممکن نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے دفعتاً حالت بدل گئی۔ انہوں نے اعلانیہ اپنے اسلام کا اظہار کیا''[۴۳]

اسلام اور اہل اسلام کو معنوی وظاہری عظمت ورفعت سے ہمکنار کرنے اور اسے شایان شان مقام سے روشناس کرانے میں حضرت عمرؓ کی جو خدمات جلیلہ ہیں ان کا اعتراف ایک مغربی عالم یوں کرتا ہے:

"Under his rule, the Islamic Empire expanded with miraculous speed, as it is fair to say that it was'Umar who after the prophet, was most influential in molding the Islamic State and in determining its nature"[۴۴]

[ان کے عہد خلافت میں اسلامی سلطنت کا دائرہ معجزانہ رفتار سے وسیع ہوگیا۔ یہ کہنا بھی صداقت پر مبنی ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ ہی تھے جو اسلامی حکومت کی عملی تشکیل اور اس کی خصوصیات کی تشخیص وتعیین میں مؤثر ترین عامل ثابت ہوئے۔]

گویا دین حق کے فروغ واشاعت اور غلبۂ واستحکام میں فاروق اعظمؓ کی خدمات

جلیلہ ہی وہ اصل محرک ہے جس نے علمائے مشرق ومغرب کو فاروق اعظم کی سیرت پر خامہ فرسائی کرنے کو مہمیز کیا۔ راقم کی معلومات کے مطابق امام غزالی کے رفیق، ابن رشد کے محرم راز اور سیرت النبیؐ کے مصنف علامہ شبلی نعمانی کی ''الفاروق'' وہ نادر تصنیف ہے جو خلیفہ راشد ثانی کی تریسٹھ سالہ سوانحی تفصیلات اور درخشاں کارناموں پر مبسوط دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوجلدوں پر مشتمل یہ عالمانہ اور محققانہ کاوش وتخلیق، اسی جہد مسلسل کا ثمرہ ہے جس کی تخم ریزی وشجرکاری قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں قہوہ پی پی کر گئی تھی[۵]۔

فلپ، کے، حتی کی Makers of the Arab History اور History of the Arabs، رینالڈ، الین نکلسن کی A Literary History of the Arabs، آرنلڈ کی The Legacy of Islam اور Preaching of Islam، ویلم مانٹ گمری واٹ کی Mohammmad, as a Statesman اور Islamic Survey، ہملٹن الکونڈر راسکین گب کی Studies of Civilization of Islam، رابرٹ پائن کی The holy sword اور الفرڈ گیام کی Islam، ان تمام تصنیفات میں اگر چہ خاص طور پر اسلام اور صدر اول کے مسلمانوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے تاہم ضمناً فاروق اعظم کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض کے علاوہ تمام برطانوی مستشرقین نے اپنی ان تصنیفات میں حضرت عمر فاروقؓ کو عدل وانصاف، شجاعت وبہادری اور سیاست وحکمرانی کے معاملے میں قد آور شخصیت کی حیثیت سے سراہا ہے۔ ان کے علاوہ دی کیمبرج ہسٹری آف اسلام، ایوری مین انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا انٹرنیشنل، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور چیمبرز انسائیکلو پیڈیا جیسے علمی اور تحقیقی ذخائر معلومات کے مرتبین اور مقالہ نگاروں نے بھی بالخصوص حضرت عمرؓ کے اصول جہاں بانی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

سیرت فاروق اعظم پر برطانوی مستشرقین کی نگارشات اور ''الفاروق'' سے موسوم اس مقالے کا تقاضا تو یہ تھا کہ موازنہ ومقارنہ کے پہلو کے پیش نظر فکری اور فنی ندرتوں کو اجاگر کیا جاتا۔ لیکن چونکہ انگریزی میں سیرت عمر فاروقؓ پر باضابطہ اور منظم کوششوں کا سراغ نہیں ملتا اس لئے ہر پہلو سے موازنہ وتقابل کی بات بے معنی ہوجاتی

ہے۔ محدود وقت اور مخصوص دائرے کے تحت نہ یہ ممکن تھا اور نہ موزوں کہ ''الفاروق'' کے تمام مشتملات ومباحث پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے مستشرقین کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی جائے۔ چنانچہ خود اپنے سے معذرت کے ساتھ، تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے'' ''الفاروق'' میں محفوظ سیرت فاروقی کی چند جھلکیوں کو ہی نذر سامعین کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور ان کے سلسلے میں چند مشہور ترین انگریز مستشرقین کے خیالات کو صحت وعلم کی میزان پر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

الفاروق کے مصنف حضرت عمرؓ کے حالات وواقعات ضبط تحریر میں لانے سے متعلق گویا ہیں:

> ''حضرت عمرؓ کے واقعات اور حالات درحقیقت سیرت نبوی کے اجزاء ہیں، آنحضرتؐ کو جو لڑائیاں پیش آئیں غیر قوموں سے جو معاہدات عمل میں آئے، وقتاً فوقتاً جو احکامات جاری کئے گئے، اشاعت اسلام کے لئے جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان میں سے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمرؓ کی شرکت کے بغیر انجام پایا ہو.......... اس لئے یہ سب واقعات نہایت اختصار سے لکھے گئے ہیں اور جن واقعات میں حضرت عمرؓ کا خاص تعلق ہے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا گیا ہے''[۶]

اخلاق وعادات، احوال وکوائف اور سیاست وتدبیر پر کم وبیش ساٹھ صفحات میں علامہ شبلی نے 'الفاروق' میں اپنے قلم کے جو ہر بکھیرے ہیں جو بلا شبہ حضرت عمرؓ کی جامع شخصیت کا مرقع پیش کرتے ہیں۔ خشیتِ الٰہی، اصول مساوات، بے لاگ عدل وانصاف، عہدہ داران سلطنت کا انتخاب، غرباء اور مساکین کے روزینے، یتیموں کی خبر گیری، تواضع وسادگی اور زندہ دلی، اخلاق وعادات اور سیاست وتدبیر 'الفاروق' کے خاص موضوعات ہیں جن پر فرداً فرداً کہیں شرح وبسط کے ساتھ تو کہیں ایجاز واختصار کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ عدل، خشیت الٰہی کا نمایاں ترین مظہر ہے جس کی کتاب اللہ میں متعدد مواقع پر تلقین فرمائی گئی ہے اور حدیث نبوی میں امام عادل کو ان سات خوش بختوں میں سرفہرست رکھا گیا

ہے جنہیں قیامت کے روز خاص سایۂ الٰہی نصیب ہوگا۔[۷] عدل وانصاف کا یہ جوہر خلیفۂ راشد کے ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہوتا ہے اور غالباً یہی وہ کارگر نسخہ اور مؤثر حربہ تھا جس نے عمر فاروقؓ کی حکومت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی چیز جس نے ان کی حکومت کو مقبول عام بنا دیا اور جس کی وجہ سے اہل عرب ان کے سخت احکام کو بھی گوارا کر لیتے تھے، یہ تھی کہ ان کا عدل وانصاف ہمیشہ بے لاگ رہا جس میں دوست ودشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ممکن تھا کہ لوگ اس بات سے ناراض ہوتے کہ وہ جرائم کی پاداش میں کسی کی عظمت وشان کا مطلق پاس نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ لوگ یہ دیکھتے تھے کہ خاص اپنی آل، اولاد اور عزیز واقارب کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ ہے تو لوگوں کو صبر آجاتا تھا''۔[۸]

پروفیسر فلپ کے حتی کی قابل قدر تصنیفات میں (Makers of Arab History) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یوروپین مؤرخین کی تحریریں بالعموم بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہیں۔ اس لئے اسلام، قرآن اور نبی ﷺ سے متعلق بہت سی باتوں میں حتی سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن حضرت عمرؓ کے سلسلے میں جب وہ گویا ہوتا ہے تو بیشتر مقامات پر علمی دیانت کا ثبوت دیتا ہے۔ عدل فاروقی سے متعلق مذکور بالا اقتباس کے پس منظر میں اس غیر مسلم دانشور کے نوک قلم سے نکلی ہوئی یہ باتیں بڑی معنی خیز لگتی ہیں کہ حضرت عمرؓ تادم حیات سادگی، افتادگی طبع، پاکیزگی اور کفایت شعاری کی روش پر گامزن رہے۔ ان کا خدا، محمد ﷺ اور اپنے اوپر یقین اتنا پختہ تھا کہ تاحین حیات ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہ آئی، زندگی میں اقتدار کا نقشہ کبھی ان کے کردار کو مجروح نہ کرسکا اور موت کے دروازے پر بھی ان کے کردار پر کوئی دھبہ نہ آیا۔[۹] .... وہ انصاف کے تقاضوں سے کماحقہ واقف تھے، انہوں نے اپنے نظریۂ انصاف کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے نزدیک تم میں کا کمزور ترین انتہائی طاقتور ہے جب تک میں اس کے حقوق نہ دلا دوں اور طاقتور ترین کمزور ترین ہے جب تک سلب کئے ہوئے حقوق واپس نہ لے لوں۔ اور وہ انصاف

کے اس موقف ونظریہ پر زندگی بھر عملی ثبوت فراہم کرتے رہے۔

پروفیسر رینالڈ الین نکلسن بھی ان مستشرقین میں ہیں جنہوں نے نسبتاً انصاف واعتدال کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اسلامی تہذیب وثقافت اور علوم اسلامیہ کی جولانگاہ میں قدم رکھا ہے۔ فاروق اعظمؓ پر اگر چہ اس نے شرح وبسط کے ساتھ زور قلم نہیں دکھایا ہے تاہم چند صفحات میں حضرت عمرؓ کی شخصیت کا جامع نقشہ حوالۂ ناظرین کر دیا ہے۔ خشیتِ الٰہی، احساس ذمہ داری، کفایت شعاری، جرأت وبہادری اور مظلوموں کی دادرسی کے علاوہ عدل وانصاف کے جوہر سے آراستہ ہونے پر نکلسن کی یہ چند عبارتیں شاہد وناطق ہیں:

> "Simple and frugal; doing his duty without fear or favour; energetic even to harshness, yet capable of tenderness towards the weak; a severe judge of others and especially of himself, he was a born ruller and every inch a man"[۱]
>
> [وہ انتہائی سادگی پسند اور کفایت شعار تھے، بیجا موافقت اور خدشے سے بے پرواہ ہو کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے تھے۔ وہ انتہائی زور آور اور شدید تھے تاہم مظلومین اور کمزوروں کے معاملے میں بہت ہی حساس تھے۔ وہ دوسروں کے معاملات وقضایا اور بالخصوص اپنے امور ومسائل میں بہت سختی سے شاہراہ عدل وانصاف پر گامزن رہتے تھے۔ وہ فطری طور پر حکمراں اور ایک مکمل انسان تھے۔]

پروفیسر تھامس واکر آرنلڈ ان علمائے استشراق میں ہیں جنہوں نے اسلام پر اپنا وقیع مطالعہ پیش کیا ہے۔ اشاعت اسلام سے متعلق مختلف شکوک وشبہات اور اعتراضات واختلافات جو اہل مغرب کے متعصبانہ ذہنیت کے نتائج ہیں، ان کے جوابات خود انہیں میں سے جس دانشور نے 'The Preaching of Islam' کی شکل میں مدلل اور مسکت انداز سے دیئے ہیں اسے دنیا تھامس واکر آرنلڈ کے نام سے جانتی ہے۔ اپنی ایک اور شہرت یافتہ تالیف The Legacyof Islam میں چند صفحات میں حضرت عمرؓ کی سیرت پر گویائی کی

ہے اور بالخصوص ان کے عدل وانصاف اور نظریۂ مساوات کو سراہتے ہوئے وہ گویا ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو اصول حکمرانی بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ان سب کو برابر سمجھنا۔ یہ بات حضرت عمرؓ نے انصاف کے متعلق فرمائی تھی تا کہ ظالم اور طاقتور حقوق کی ادائیگی اور عدل وانصاف کے برتنے میں سدراہ نہ بن سکے۔ آرنلڈ مزید رقم کرتے ہیں کہ عہد فاروقی میں ہم جس نظام حکومت کو ملاحظہ کرتے ہیں فی الحقیقت وہ انہی بنیادی اصولوں پر مبنی تھا۔[۱۱]

برطانوی اصحابِ قلم میں ولیم میور تعصب، تبلیغی ذہنیت اور اسلام دشمنی میں سبقت لے جانے والوں میں ہے۔ اس کی 'لائف آف محمدؐ' اسلام دشمنی کی شاہکار ہے جس نے بانیٔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو سراپا اضطراب بنا دیا تھا۔ خود ان کے بقول اس کتاب نے ان کے دل کو کباب کر دیا تھا جس کے نتیجے میں سرسید کی الخطبات الاحمدیہ منظر عام پر آئی تھی۔ اس کی اہم تصنیفات میں خلفائے راشدین کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں پر مبسوط کتاب 'TheCaliphate: Its Rise and Decline' کے نام سے موسوم ہے۔ سیرتِ فاروقی پر مستشرقین کی کاوشوں میں یہ تصنیف اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ استشراق کا علم اپنے ہاتھوں میں لینے اور تعصب وعداوت کے جذبات سے پُر ہونے کے باوجود سیرت حضرت عمر فاروقؓ پر کم از کم ایک سو چودہ صفحات میں بعض مستثنیات کے ساتھ اس نے بہت حد تک حق پسندی اور علمی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ تاہم شبلی نعمانی کی تصنیف 'الفاروق' اپنی مثال آپ ہے۔ کم از کم ان مستشرقین میں سے کسی کی تصنیف سے مقابلہ یقیناً سورج کو چراغ دکھانے اور علم وفن کی جولانگاہ میں محض طبع آزمائی کرنے کے مترادف ہوگا۔ تاہم چند دیگر مباحث و مشتملات کی خوشہ چینی 'الفاروق' سے کی جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ 'دی کیلیفیٹ' کے مصنف نے انہیں کس زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔

فاروق اعظم کے تواضع، سادگی اور احساس ذمہ داری کا پورا نقشہ علامہ شبلی کی ان عبارتوں سے منصۂ شہود پر آجاتا ہے:

''ان کے اخلاق وعادات کے بیان میں مؤرخوں نے تواضع اور سادگی کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور درحقیقت ان کی عظمت وشان کے تاج پر سادگی کا طرّہ نہایت ہی خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی تصویر کا ایک رخ یہ ہے کہ روم وشام پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر وکسریٰ کے سفیرں سے معاملہ پیش ہے۔ خالد وامیر معاویہ سے باز پرس ہے، سعد بن وقاصؓ، ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاصؓ کے نام احکام لکھے جارہے ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ بدن پر بارہ پیوند کا کرتہ ہے، سر پر پھٹا سا عمامہ ہے، پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں۔ پھر اس حالت میں یا تو کاندھے پر مشک لئے جارہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنا ہے۔ یا مسجد کے گوشے میں فرش خاک پر لیٹے ہیں اس لئے کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور نیند کی جھپکی سی آگئی ہے''[۱۲]

مولانا نے اگر چہ یہ عبارتیں حضرت عمرؓ کی تواضع اور سادگی کے تحت سپرد قرطاس کی ہیں لیکن چشم بنیا سے یہ حقیقت پردۂ خفا میں نہیں رہ سکتی کہ یہ عبارتیں ہی فاروق اعظم کے جامع اخلاق پر سند ہیں۔

ولیم میور نے بھی خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کے اخلاق وکردار کو موضوع بحث بناتا ہے اور اپنے انداز سے عقیدت پیش کرتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ سادگی اور فرض شناسی ان کے لئے اصول کی حیثیت رکھتی تھی[۱۳] غیر جانبداری اور عامۃ الناس کے لئے اپنے کو وقف کردینا ان کے طریقۂ حکمرانی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ احساس ذمہ داری اس قدر غالب تھا کہ وہ بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے کہ کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا یا پھر میں خس وخاشاک ہوتا کہ ہم سے حساب نہ لیا جاتا۔ ولیم میور فاروق اعظم کی سیاسی عظمت پر بھی رطب اللسان ہے:

"Next to the Prophet, the greatest in the

kingdom of Islam; for it was all with in these ten years, by his wisdom, patience and vigour, the dominion was achieved of Syria, Egypt and Persia"[۱۴]

[عمر پیغمبر اسلامؐ کے بعد اسلامی دار السلطنت میں عظیم ترین شخص تھے۔ اسلئے کہ صرف دس سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے اپنی حکمت عملی، بردباری اور زور وطاقت کی بدولت شام، مصر اور فارس پر فتح وتسخیر کی کمندیں ڈال دیں۔]

ولیم میور کا یہ بیان کہ صرف حکمت، بردباری اور زور وطاقت ہی وہ محرکات تھے جن کی بدولت شام مصر اور فارس پر فتح وظفر کے پرچم لہرادیئے۔ یہ بہر حال فکر اسلامی سے انحراف پر مبنی اظہار خیال ہے جو اگر چہ حضرت عمرؓ کی تحسین میں اس نے کیا ہے۔

یہ حقیقت کہ مسبب اسباب پر حاوی ہے، انسان کیسے ہی ذرائع ووسائل اختیار کرلے اگر توفیق خداوندی شامل حال نہیں ہے تو فتح وکامرانی حاصل نہیں ہوسکتی۔ حضرت عمرؓ کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسول وہ اصل سرمایہ ہے جو فاتحانہ اوصاف وخصائص کی ضمانت بنا۔ ایمان کی لذت وشیرینی سے محروم اشخاص سے یہ توقع ہی بیجا ہے کہ وہ معاملات ومسائل کے پیش وعقب کو ایمان وایقان کی میزان پر دیکھیں بہر حال مذکورہ بالا کلمات تحسین حضرت عمرؓ کے حق میں نذرانۂ عقیدت ہے جو میور نے پیش کیا ہے۔

فتوحات ومقبوضات میں اسلام کی تلوار کبھی بھی غیروں کی منت کش احسان نہیں رہی۔ البتہ حریف قوموں کو خود آپس میں تصادم وآویزش کی راہ پر لگادینا یہ فن جنگ کی سب سے بڑی اسٹریٹجی ہے جسے حضرت عمرؓ نے بطریق احسن برت کر دکھایا۔ سیکڑوں ایرانی، یونانی اور رومی بہادروں نے اسلامی فوج میں شمولیت اختیار کرکے بڑے جوش وخروش اور مسلمانوں کے تئیں وفاداری کے جذبے سے معمور ہوکر خود اپنی قوم سے نبرد آزمائی کی۔ الفاروق میں تقریباً سوا دو سو صفحات پر مشتمل مباحث حضرت عمر فاروقؓ کی جنگی مہمات، سیاست وتدبیر، سیادت وقیادت اور اصول حکمرانی کو تشنۂ توضیح نہیں چھوڑتے۔ شام کی

فتوحات اور سترہ ۱۷ھ ہجری کے واقعات میں حضرت خالد بن ولید کی معزولی کو تاریخ وسیرت کی کتابوں میں ایک انتہائی ناخوشگوار امر واقعہ کی حیثیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

اس قضیے پر بھی علامہ شبلی کا قلم حرکت میں آتا ہے۔ مؤرخین کا یہ بیان کہ زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی پہلا حکم نامہ حضرت خالدؓ کی معزولی سے متعلق جاری فرمایا انصاف وصداقت پر مبنی نہیں ہے۔ دربار نبوت کے فیض یافتہ جس پر آفتاب رسالت کی براہ راست ضیاء پاش کرنیں پڑی ہوں، حکمت وتدبیر اور اصول حکمرانی میں ماہر ومشاق شخصیت جس نے دس سال کے قلیل عرصے میں **ليظهره على الدين كله** کے مقدس مشن کو مجسم بنادیا ہو، وہ آخر اتنی بڑی سیاسی چوک نہیں کرسکتی تھی۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ حضرت خالدؓ حساب وکتاب کے کاغذات اور فوج کے مصارف کا حساب دربار خلافت کو نہیں بھیجتے تھے۔ عہد صدیقی سے ہی ان کی طرف سے یہ کوتاہی سرزد ہوتی چلی آرہی تھی۔ حضرت عمرؓ کو ان کی خود مختاری کیونکر گوارا ہوسکتی تھی۔ چنانچہ حضرت خالدؓ کو لکھ بھیجا کہ تم سپہ سالار اسی شرط پر رہ سکتے ہو جب کہ تم مصارف واخراجات کا حساب وکتاب دربار خلافت میں بھیجتے رہو۔ لیکن خلیفۂ راشد کی شرط حضرت خالدؓ نے نامنظور کی جس کی وجہ سے انہیں ابوعبیدہ کے ماتحت کردیا گیا۔ علامہ شبلی نے حافظ ابن حجر العسقلانی کی الاصابۃ کے حوالے سے رقم کیا ہے کہ ایک شاعر کو خالد بن ولید کی طرف سے انعام میں دس ہزار روپے دیئے جانے کی شکایت خلیفۂ وقت تک پہنچی۔ حضرت ابوعبیدہؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس معاملے میں حضرت خالدؓ کی باز پرسی کے لئے مامور ہوتے ہیں اور خلیفۂ وقت کی جانب سے اپنی جیب خاص سے دیئے جانے کی صورت میں اسراف اور بیت المال سے دیئے جانے کی صورت میں خیانت کے مرتکب قرار پاکر معزول کئے جانے کے سزاوار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اگر حضرت خالدؓ حضرت عمرؓ کا خط لانے والے قاصد کے سامنے بھی اپنی خطا کا اقرار کرلیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ ان سے درگزر کیا جائے تاہم حضرت خالدؓ راضی نہ ہوئے اور پھر انہیں اپنے عہدے سے معزول ہونا پڑا۔ اس بڑے ناخوشگوار واقعہ کے رونما ہوجانے کے باوجود دربار رسالت سے فیض یافتہ دو جلیل القدر شخصیتوں میں نفرت وعداوت کی آگ نہیں بھڑکتی

اور حضرت خالدؓ ایسے موقع پر کسی فتنہ و شر انگیزی کو شہہ نہیں دیتے۔ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:

''یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایسا بڑا سپہ سالار جس کی نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا۔ اس واقعہ سے ایک طرف تو خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی سطوت و جلال کا اندازہ ہوتا ہے''[۱۵]

ولیم میور نے بھی اپنی محولہ بالا تصنیف میں حضرت خالدؓ کی معزولی کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک طرف سیرتِ فاروقی پر مشتمل متعدد صفحات میں حضرت عمر فاروقؓ کے اخلاق و کردار کی عظمت اور ان کی سیاست و تدبیر کو خراج تحسین پیش کرتا ہے اور دوسری طرف انتقام پرور ذہنیت کا انتساب کرتا ہے۔ اس کے بقول قبل از اسلام بھی وہ سختی و شدت اور انتقام کے جذبے سے پُر تھے اور اسلام سے شرفیاب ہونے کے بعد اس کے مظاہر رونما ہوئے۔ میور کے خیال کے مطابق عنان خلافت ہاتھ میں لیتے ہی حضرت عمرؓ نے اپنی پہلی ذمہ داری قرار دی کہ حضرت خالدؓ کو معزول کر دیا جائے۔[۱۶] اپنی کتاب کے جس صفحہ پر ایک پیرا گراف میں حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف اور سادگی و فرض شناسی کو سراہتا ہے اسی پیرا گراف میں معذرت خواہانہ انداز میں حضرت عمرؓ کی بابت لکھتا ہے کہ خالدؓ کی معزولی کے علاوہ ان کی طرف سے ظلم و ناانصافی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔[۱۷] علامہ شبلی نے اس اہم قضیے پر جو محققانہ، عالمانہ اور منصفانہ بحث کی ہے وہ سطور بالا میں ملاحظہ کی جا چکی ہے۔ ولیم میور کی ناعلمیت اور تعصب پر مبنی شاطرانہ ذہنیت کا پردہ علامہ طبری کی اس وضاحت سے فاش ہو جاتا ہے اور علامہ شبلی کی زبان میں ایک نکتہ بیں شخص بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ خالدؓ کی معزولی کے کیا اسباب تھے اور اس میں کیا مصلحتیں تھیں۔ علامہ شبلی نے حضرت عمرؓ کی معزولی کے اس اقدام کو خود ان کے مطابق طبری کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے کہ خلیفۂ راشد نے عمالان مملکت کو لکھ بھیجا کہ میں نے خالدؓ کو ناراضی سے یا خیانت کی بنا پر موقوف نہیں کیا۔ لیکن چونکہ میں یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں اس لئے میں نے ان کا معزول کرنا مناسب سمجھا تا کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے''۔[۱۸]

تدوین قرآن کا کارنامہ پوری امت مسلمہ کے لئے بالخصوص اور قیامت تک کے تمام انسانوں کے لئے بالعموم ایک زبردست احسان ہے جس کا اصل سہرا خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ کے سر بندھتا ہے۔ احادیث کے مستند ذخیروں میں یہ بات مذکور ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں فتنۂ ارداد کو کچلنے کے لئے جب جنگِ یمامہ واقع ہوئی تو اس میں سیکڑوں صحابہ شہید ہوگئے جن میں بہتیرے قرآن کے حافظ تھے۔ اس دلدوز سانحہ کے رونما ہونے کے بعد حضرت عمرؓ دربارِ خلافت میں پہنچے اور مؤدبانہ طریقے سے یہ تجویز رکھی کہ قرآن پاک کی جمع وتدوین کی خدمت انجام دے دی جائے۔ حضرت ابوبکرؓ اسے خلاف سنت عمل قرار دیتے ہوئے شش وپنج میں تھے۔ حضرت عمرؓ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایسے حادثات وواقعات رسول اللہؐ کے زمانے میں رونما نہیں ہوتے تھے اور قرآن پاک کے ضائع ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے کوئی قولی یا عملی حکم نہیں فرمایا۔ بہرحال دونوں جلیل القدر صحابہ اپنے اپنے موقف پر درست تھے، لیکن چونکہ عمر فاروقؓ اس سانحہ سے سراپا اضطراب وبے چین بنے ہوئے تھے۔ قرآن پاک کے قیامت تک کتاب ہدایت ہونے کی حقیقت اور تضییع قرآن کا خدشہ، یہ محرکات تھے جنہوں نے انہیں اپنے موقف پر ثابت قدم رہنے کا عزم وحوصلہ دیا۔ اور بالآخر طمانیت قلب کے ساتھ خلیفۂ اول نے یہ تجویز مان لی اور کاتب خاص زید ابن ثابتؓ کو خصوصی ہدایات دے کر اس خدمت کو عملی جامہ پہنانے کی تلقین کی اور بالآخر یہ عالمگیر ہدایت نامہ زیور تدوین سے آراستہ ہوا۔[19]

اگر چہ علامہ شبلی نے بڑی تفصیل سے اس واقعہ کو نقل نہیں کیا ہے۔ حالانکہ کنز العمال، جلد اول اور اتقان کے حوالے سے ہی صحیح بالاختصار واقعہ پیش کر کے حضرت عمرؓ کی جمع وتدوین قرآن سے متعلق خدمات کو اولیت کا مقام متعین کیا ہے۔[20] حالانکہ صحیح البخاری یا صحیح مسلم کی روایت کے ترجمے پر ہی اکتفا کیا جاتا تو کم از کم حضرت عمرؓ کی تجویز اور پھر دونوں جلیل القدر صحابہ کے مکالمات کی روشنی میں تدوینِ قرآن کے باب میں حضرت عمرؓ کا مقام اچھی طرح واضح ہو جاتا۔

'دی کیلیفیٹ' کا مصنف بھی تدوین قرآن کے مسئلے پر گویا ہوتا ہے۔ اور اس

معاملے میں علمائے مشرق ومغرب کی حامی بھرتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ قرآن پاک کی جمع وتدوین کی خدمت کا اعزاز حضرت عمرؓ کو ہی حاصل ہے لیکن اس کی یہ بات کہ تدوین قرآن کا عمل حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانۂ خلافت کی دین ہے[۲۱] یہ حقیقت سے اغماض اور عدم ناواقفیت پر مبنی ہے۔ قرآن کی جمع وتدوین سے متعلق میور اگر صحیح روایات کو اپنے مطالعے کی میز پر رکھتا اور کھلے ذہن ودماغ کے ساتھ اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو اس اعتراف حقیقت سے گریز کی نوبت نہ آتی کہ یہ کام عہد صدیقی میں ہی انجام پذیر ہوا تھا اگرچہ اس کے محرک خاص حضرت عمرؓ تھے۔

بیشتر مشہور ومعروف برطانوی مستشرقین نے مقالات ومضامین کی شکل میں ہی سہی، اسلام اور اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں کی تاریخ اور سیرت سرور عالمؐ پر اپنے قلم کو جنبش دیتے ہوئے سیرت فاروقی پر بھی لب کشائی کی ہے۔ یہ مخصوص فکر اور ذہنیت کے حصار میں رہتے ہوئے بہتیرے مقامات پر احوال وکوائف کی نشاندہی میں بے اعتدالی اور ناانصافی کی ڈگر سے ہٹ نہیں پاتے تاہم ان کی خدمات قرآن وسنت سے متعلق ہوں یا خلفاء راشدین اور اوائل کے مسلمانوں سے متعلق اس لحاظ سے سراہے جانے کے قابل ہیں کہ انہوں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ تحقیق وجستجو کے بہت سے اہم معرکے سر کئے ہیں۔ مشرقی علوم وفنون میں طبع آزمائی کے نتیجے میں علم وفن اور تلاش وتحقیق کی ایسی جہتیں اور بحثیں سامنے آئی ہیں جن کی روشنی میں بالعموم کارواں علم وتحقیق منزل کی طرف تیزگام ہوسکتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سیرت وکردار اور ان کی حیات مبارکہ کے کارہائے نمایاں پر علامہ شبلی کی ''الفاروق'' جامعیت کی حامل ہے۔ رہی بات برطانوی مستشرقین کے مطالعۂ سیرت فاروقی کی تو اول یہ کہ علمائے مغرب نے بالعموم سرسری طور پر بالخصوص ان کے نظام حکومت اور محیر العقول فتوحات کو موضوع بحث بنا کر ایک مثالی حکمراں اور فاتح کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ولیم میور اگرچہ مغربی دنیا میں اسلام دشمنی کی کمان سنبھالے نظر آتا ہے بالخصوص لائف آف محمد، اس کی مسموم ذہنیت اور اسلامی عداوت ومنافرت کی شاہکار ہے تاہم اس کی کتاب The Caliphate: Its Rise and Decline کو بڑی حد تک متوازن اور معتدل نہج مطالعہ

کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ولیم میور نے اگر چہ بہت سارے ذیلی موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے تاہم جس توسع، تفحص اور نظم وترتیب کے ساتھ علامہ شبلی نے حیات فاروق کے مختلف اور متنوع گوشوں کو طشت ازبام کیا ہے علوم وحقائق کے اسرار ورموز تک پہنچنے میں خواہ کسی وجہ سے بھی ہو میور پستہ قد اور بونا نظر آتا ہے اسی طرح رینالڈ نکلسن ،فلپ کے حتی اور پروفیسر تھامس واکر آرنلڈ بھی جن مباحث کو چھیڑتے ہیں وہ بہت حد تک تشنۂ توضیح رہتے ہیں۔

علامہ شبلی کی 'الفاروق' سے موسوم اس قومی سطح کے سیمنار میں علامہ شبلی کو یہ بہترین خراج تحسین ہوگا کہ 'الفاروق' کا مطالعہ عام ہوتا کہ اس کے مباحث و مشتملات مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے مواد بن جائیں اور ملک وقوم حضرت عمر فاروقؓ کے نظام حکومت کے مضمرات کو اپنا کر خوشحالی وفارغ البالی اور امن وآشتی سے ہمکنار ہو۔ نیز یہ کہ علامہ شبلی کے ذریعہ ادب، تاریخ نویسی، سیرت نگاری میں خالص علمی وتحقیقی منہج کے جو محامد ومحاسن ہیں انہیں نقوش راہ بنایا جائے تاکہ قوم وملت کا فکری اور معنوی وجود درخشاں تر ثابت ہو۔

☆☆☆

حوالے وحواشی

۱۔ مجیب الرحمان شامی: فاروق اعظم، ص:۲۹، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
۲۔ الصف:۹
۳۔ شاہ معین الدین ندوی: خلفائے راشدین، ص: ۱۰۳، مطبع معارف، دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع ششم ۱۹۷۳ء
۴۔ Cyril Glasse: The Concise Encyclopaedia of Islam,P.407 Lonolon, 1989
۵۔ علامہ شبلی نعمانی: الفاروق، ص : ۳۶، حصہ اول، طبع اول، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۸۹۸ء
۶۔ احمد بن محمد بن حنبل: مسند احمد، جلد دوم، ص: ۴۳۹
۷۔ الفاروق، ص: ۱۸۹۔۱۸۸
۸۔ Philip, K.Hitli, Makers of Arab History, P.42
۹۔ Renold A. Nicholson; Aliterary History of the Arabs,P.189 Cambridge University press, 1956
۱۰۔ T.W. Arnolol: The Legacy of Islam
۱۱۔ الفاروق، حصہ دوئم، ص: ۲۹۱
۱۲۔ William Muir, The Caliphate: Its Rise and Deeline P.196, Beirct, 1963
۱۳۔ William Muir, P.201
۱۴۔ الفاروق، حصہ اول، ص: ۱۶۰
۱۵۔ William Muir, P.89

۱۶۔ William Muir, P 202

۱۷۔ الفاروق، حصہ اول، ص:۱۶۱

۱۸۔ اس سلسلے میں الصحیح للبخاری میں کتاب فضائل القرآن کے تحت دونوں خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا مکالمہ تفصیل سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۔ الفاروق، حصہ دوئم، ص: ۱۲۷۔۱۲۸

۲۰۔ William Muir, P.163

☆☆☆

شبلی کی سوانحی تصنیفات اور الفاروق

ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی

فن سوانح نگاری میں شبلی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) ایک ممتاز اور منفرد حیثیت کے حامل مصنف ہیں۔انہوں نے رائل ہیروز آف اسلام (ناموران اسلام) کا ایک سلسلہ سوانحی تصنیفات کی شکل میں لکھنے کا ارادہ اس مقصد سے کیا کہ مسلمانوں کے قلب و دماغ سے اس غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری کو نکال دیا جائے، جو ان میں جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد پیدا ہو گیا تھا، اور انگریزوں نے مسلمانوں کو اس حد تک مرعوب کر دیا تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ہر قسم کے جدید علوم کو انگریزوں کی وراثت سمجھنے لگا تھا شبلی رقم طراز ہیں'' کہ یورپ کے بے درد واقع نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہم کو یقین آچلا، اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے''[1] اسی لئے شبلی نے اپنی سوانحی تصنیفات کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی اور ان کو بتایا کہ ہمارا تعلق ان افراد سے ہے جن کے آگے عیسائیوں اور دوسری تمام قوموں نے اپنا سر خم کر دیا تھا اسی نقطۂ نظر کو بنیاد بنا کر شبلی نے سوانحی تصنیفات کا آغاز کیا۔

شبلی کے اصول سوانح نگاری:

علامہ شبلی نے سوانح نگاری کے چند اصول وضوابط متعین کئے ہیں، جن پر توجہ شبلی سے پہلے کسی سوانح نگار یا مؤرخ نے نہیں دی تھی، الفاروق کے مقدمہ میں ان اصول وضوابط پر تفصیل سے بحث ملتی ہے، تاریخ کی تعریف اور اس کا مقصد بیان کرنے کے بعد مؤرخ اور سوانح نگار کے لئے مندرجہ ذیل اصولوں کو انہوں نے لازمی قرار دیا ہے۔

۱۔ سوانح نگار اور مؤرخ جس عہد کی تاریخ لکھے یا جس شخصیت پر قلم اٹھائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس زمانے کے تمام سیاسی، مذہبی، تمدنی اور معاشرتی حالات کو بھی

زیرِ بحث لائے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''جس عہد کا حال لکھا جائے، اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کئے جائیں یعنی تمدّن معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔'' ۲ اسی اصول کے مدنظر عہد فاروقی کے تمام سیاسی، مذہبی اور معاشرتی وتمدنی حالات کو بھی ضبطِ تحریر میں لائے ہیں جس سے عہد فاروقی کے معاشرہ کا ہر گوشہ واضح طور پر سامنے آگیا ہے، اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سوانح نگاری کے اس بنیادی اصول کے مطابق لکھی جانی والی اردو میں سوانح عمری کی یہ پہلی کتاب ہے۔

۲۔ شبلی کے نزدیک مؤرخ اور سوانح نگار کے لئے یہ بات بھی لازمی ہونی چاہئے، کہ واقعات کی صحت پر خود اس کے تمام اشکالات دور ہونے چاہیں اور کوئی بھی روایت بغیر صحت وصداقت کے نقل نہیں کرنی چاہئے، اس سلسلے میں شبلی نے واقعات کی جانچ پرکھ کے لئے دو طریقے روایت اور درایت کے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں ''روایت سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کے ذریعے سے بیان کیا جائے، جو خود اس واقعہ میں موجو دتھا، اور اخیر راوی تک سلسلہ متصل بیان کیا جائے۔ اس کے بعد تمام راویوں کی نسبت تحقیق کی جائے کہ وہ صحیح الروایہ تھے یا نہیں۔ درایت سے یہ مراد ہے کہ اصولِ عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔'' ۳ چنانچہ شبلی اس اصول پر قائم نظر آتے ہیں، کوئی بھی واقعہ یا روایت بغیر چھان بین کے نقل نہیں کرتے خاص طور سے سیرۃ النبیؐ اور الفاروق میں یہ اصول نمایاں طور پر ہمیں نظر آتے ہیں۔

۳۔ تیسرا اہم اصول سوانح نگار کے لئے شبلی نے یہ مقرر کیا ہے کہ وہ شخصیت کے متعلق جس واقعہ کو بھی نقل کرے، سوانح نگار اس فن سے بخوبی واقف ہو، ورنہ واقعہ کو وہ ظاہری شکل میں دیکھے گا، اور اس کی گہرائی تک رسائی ممکن نہ ہو سکے گی، ہر واقعہ کی تہہ اور اس کی اصل روح تک پہنچنا ضروری ہے۔

شبلی کا تصورِ سوانح نگاری اس تصور اور مقصد سے بالکل مختلف ہے، جو عام طور پر

مؤرخوں اور سوانح نگاروں کے یہاں پایا جاتا ہے عام تصور یہ ہے کہ سوانح نگار کا موضوع وہ شخصیت ہونی چاہئے، جس پر وہ لکھ رہا ہے۔ اور وہ زمانہ سے زیادہ اسی شخصیت کے اردگرد گھومتا دکھائی دیتا ہے، اور صرف اس حد تک زمانے سے بحث کرتا ہے جتنی کہ اس کو ضرورت ہوتی ہے، جبکہ ایک مؤرخ انسان سے زیادہ اس عہد سے دلچسپی رکھتا ہے، جس کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے اور افراد کی بحث میں وہ کم دلچسپی لیتا ہے، لیکن شبلی کا تصور جن اصولوں پر مشتمل ہے، ان کی صراحت خود انہوں نے جابجا اپنی تحریروں میں کی ہے، ان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شبلی نے تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے، وہ سوانح عمری کے ذریعہ ہی اس پورے عہد کی تاریخ کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، یہ اصول ہمارے مؤرخین اور سوانح نگاروں کے ہاں نہیں پایا جاتا ہے، اسی لئے شبلی یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ ''ایشیائی مؤرخین کی عادت یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں جنگ وجدل، بغاوت اور خونریزی کے واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں، اس لئے یورپ والے ہماری تاریخ کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں، اور واقعی ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، پالٹکس، معاشرت، خانگی زندگی کا پتہ لگانا ہو تو بہت کم کامیابی ملے گی''[۱۴]

شبلی کے تصور کے مطابق سوانح عمری کا مقصد صرف کسی کے حالات وکوائف بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ ان سے اصل مقصود وہ تاریخی کارنامے اور واقعات ہیں جنہوں نے معاشرہ اور سماج پر گہرے نقوش مرتب کئے، شبلی انہی نقوش اور کارناموں کو احیائے قوم کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے، اسی لئے شبلی کے نزدیک سوانح اور تاریخ صرف غیر معمولی شخصیتوں اور ناموروں کی ہی ہوتی ہے جو پورے عہد اور زمانے کی ترجمانی کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانحی تصنیفات میں سوانح سے زیادہ تاریخی معلومات دکھائی دیتی ہیں۔

شبلی کی بعض تصانیف سوانح عمری سے بڑھ کر ایک دور کی مکمل تاریخ پیش کرتی نظر آتی ہیں جیسے:

المامون (۱۸۸۷ء)

الفاروق (۱۸۹۸ء)

سیرۃ النبیؐ (۱۹۱۴ء)

ان تینوں کتابوں کو قبولِ عام حاصل ہوا اور علماء کے ہر طبقہ نے ان کی تعریف کی اور ان موضوعات پر ان سے بہتر کتابیں آج تک نہیں لکھی گئیں، بعض تصانیف وہ ہیں جن میں ذاتی حالات وکوائف پر زور ہے تاریخ پر توجہ کم ہے جیسے:

۱۔ سوانح عمری نظام گنجوی۔ مولانا نظام گنجوی کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے

۲۔ سوانح عمری فردوسی۔ اس میں فردوسی کے مکمل حالات اور ان کے کلام پر نقد وتبصرہ ہے

۳۔ بیانِ خسرو۔ حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری اور ان کے کلام پر محققانہ تنقید وتبصرہ ہے

۴۔ النعمان۔ امام ابوحنفیہ کی مکمل سوانح عمری اور ان کی کتابوں پر تعارف وتبصرہ ہے

۵۔ الغزالی۔ امام غزالی کی مکمل سوانح عمری اور ان کی کتابوں پر تبصرہ ہے

۶۔ سوانح رومی۔ مولانا روم کی سوانح عمری اور ان کے کلام کا تعارف ہے

یہ ایسی سوانح عمریاں ہیں جن میں شبلی نے زیادہ تر صاحبِ سوانح کے علمی کمالات اور علمی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخی سوانح عمریوں میں المامون اور الفاروق سرفہرست ہیں، ان دونوں پر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ مختصراً النعمان پر بھی تبصرہ ہوگا۔

المامون:

یہ ناموران اسلام کے سلسلے کی پہلی اہم کتاب ہے ۱۸۸۷ء میں قیام علی گڑھ کے دمدان یہ منظرِ عام پر آئی، الفاروق کی طرح المامون بھی صرف ایک فردِ واحد کی تاریخ نہیں ہے بلکہ خلیفہ مامون اور خلیفہ امین کے عہد کی مکمل تاریخ ہے، اس کتاب کی ایک خامی یہ ہے کہ مصنف نے کتاب کی ابتداء ہی سے مامون کا ایسا خاکہ اور ایسی تصویر پیش کی ہے، جس سے غیر شعوری طور پر قاری کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ ہارون الرشید کے بعد خلافت کا اصل حقدار مامون ہی تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امین اس منصب کے لائق نہیں تھا۔ شبلی نے تصویر کا ایک ہی رخ پیش کیا ہے بلکہ تصویر کے دوسرے رخ یعنی مامون کے عیوب اور اس کی کمیوں کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ المامون کے صفحات میں ہم دیکھتے

ہیں کہ مصنف مامون کی کمزوریوں کو تاویلات کے ذریعہ خوبیوں میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، طاہر جو کہ خراساں کا گورنر تھا، اس کو مامون کے اشارے پر زہر دیا گیا، اس بات کو شبلی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلوایا، لیکن اگر مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا، تو کیا کرتا، اگر اس نظیر کے لئے ہم دور نہ جائیں اور خود مامون کے نامور باپ ہارون الرشید کی طرف نگاہ اٹھائیں تو کیا ثابت ہوگا، ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک خیالی الزام پر برامکہ کا وہ فیاض خاندان جس کی نظیر سے تاریخ اسلام خالی ہے، ایک لحظہ میں دنیا سے ناپید کر دیا، لیکن مامون نے جو کچھ کیا، سیاست ملکی کے لحاظ سے اس کا ضروری فرض تھا۔[۵] شبلی نے یہاں تاویل کر کے گویا مامون کو اس قتل سے بری کر دیا، اور ہارون الرشید کے ذریعہ برامکہ خاندان پر ظلم وستم اور قتل وغارت گری کو مثال کے طور پر پیش کر کے ایک ظلم کو دوسرے ظلم سے جائز ٹھہرانے کی کوشش کی۔

اسی طرح ''المامون'' میں جہاں مامون کے عیش ونشاط اور نغمہ وموسیقی اور فضول خرچی کا ذکر ہے، شبلی ان الفاظ میں اسکی تاویل کرتے ہیں ''اس میں تعجب کی کیا بات ہے، آزادی، حوصلہ مندی، لطافتِ طبع، جوشِ شباب ہمیشہ زہد کی حکومت سے باغی رہتے آئے ہیں، مامون کی تخصیص نہیں اس وقت اسلامی سوسائٹیاں عموماً اس رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں''۔[۶] یہ تاویل ناقابل قبول ہے، مامون کی محبت اور عقیدت میں اس وقت کی پوری اسلامی سوسائٹی کو اسی رنگ میں پیش کرنا بڑی ناانصافی ہے، یہ عیب صرف امراء اور سلاطین کا تھا، علماء صوفیاء اور عام مسلم سوسائٹی کا نہ تھا، یہ سب عیش ونشاط کی محفلوں سے کوسوں دور تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ''المامون'' تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے اس زمانے کی معاشرت اور تہذیب وتمدن کی تصویر کشی اس سے بہتر کسی اور کتاب میں نہ مل سکے گی۔

النعمان:

''المامون'' کے بعد ۱۸۹۱ء میں شبلی نے سلسلۂ ناموران اسلام میں ''النعمان'' لکھی، یہ اس سلسلے کی دوسری کڑی تھی، یہ کتاب بھی دو حصوں میں مشتمل ہے، دوسرا حصہ جس کی ضخامت کتاب کے تقریباً چوتھائی حصہ پر مشتمل ہے، مصنف نے امام صاحب کی تصانیف

کے تعارف وتبصرہ کیلئے مخصوص کر رکھا ہے، لیکن تعارف وتبصرہ کے دوران وہ متعدد مختلف فیہ مسائل کو بحث میں لا کر تاریخ کی جولان گاہ میں نکلتے ہیں، امام صاحب سے عقیدت اور محبت کے باوجود شبلی نے خوش اعتقادی اور مبالغے کو اس کتاب میں جگہ نہیں دی ہے۔ اور ان روایات کی سختی سے تردید کی ہے جو نا قابل فہم اور غلو پر مبنی تھیں جیسے یہ روایت کہ امام صاحب نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے[۷]

الفاروق:

النعمان کے بعد سلسلۂ ناموران اسلام میں شبلی نے الفاروق لکھی، اس کتاب کی ترتیب میں شبلی کو سب سے زیادہ دشواری پیش آئی۔ کتاب لکھنے کا ارادہ اگرچہ بہت پہلے کر چکے تھے لیکن بعض ایسی دشواریاں اور مجبوریاں پیش آئیں کہ اس کی تالیف میں تاخیر ہوتی چلی گئی، چنانچہ النعمان کے دیباچے میں لکھتے ہیں، کہ "المامون" کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اس کی تالیف سے ہاتھ دھونا پڑا[۸]

کتاب کی تکمیل کے لئے شبلی نے اپنی علالت کے باوجود رات دن ایک کردیا، ہندوستان کے ہر کتب خانے کی سیر کی، روم ومصر وشام کا سفر بھی اسی مقصد سے کیا۔ الفاروق اور آپ کی دوسری سوانحی تصنیفات کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں، تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ الفاروق ہر اعتبار سے ممتاز ہے، المامون اور النعمان میں شبلی اگرچہ کہیں کہیں اپنے اصولوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن الفاروق کے دونوں حصے دیکھئے تو اس میں شبلی اپنے اصولوں کے مکمل پابند دکھائی دیتے ہیں تحقیق وجستجو اور کتاب کے مواد ومصادر کی فراہمی میں محنت اور لگن کا یہ عالم ہے کہ کسی کتاب یا حوالے کی تلاش میں مہینوں اپنا کام اٹھا رکھتے تھے، تاریخ طبری کا عدم حصول بھی الفاروق کی تاخیر کا ایک اہم سبب تھا۔

الفاروق شبلی کی دوسری سوانحی تصنیفات سے کسی قدر مختلف ہے، دوسری تصنیفات میں شبلی زیادہ تر تاریخ کا اس طرح سے سہارا لیتے ہیں کہ قاری کچھ دیر کے لئے بھول جاتا ہے کہ وہ کسی کی سوانح عمری پڑھ رہا ہے، لیکن الفاروق میں اگرچہ پورے دس سالہ عہد کی مکمل تاریخ آگئی

ہے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت کہیں بھی قاری کا ساتھ نہیں چھوڑتی ہے کسی نہ کسی زاویے سے ان کا ذکرِ خیر آجاتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ شبلی کی عقیدت ومحبت اس کا ایک اہم سبب ہوسکتا ہے جس کی وجہ سے وہ عمرؓ کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے، یہی وجہ ہے کہ شبلی نے بہت سے ایسے واقعات کا سرسری تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق حضرت عمرؓ کی ذات گرامی سے تو تھا، لیکن ان واقعات میں دوسری شخصیت حاوی تھی، اسی لئے سن ہجری کے آغاز سے آنحضرت ﷺ کی وفات تک حضرت عمرؓ کے حالات تفصیل سے نہیں بیان کئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے وقت حضرت عمرؓ کے حالات دھندلے دکھائی پڑتے، چنانچہ شبلی یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ ''یکم ہجری سے آنحضرت صلعم کی وفات تک حضرت عمرؓ کے واقعات اور حالات درحقیقت سیرت نبوی کے اجزاء ہیں اگر یہ واقعات پوری تفصیل سے لکھے جائیں تو کتاب کا یہ حصہ سیرت نبوی سے بدل جاتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے کارنامے گو کتنے ہی عظیم الشان ہوں لیکن چونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سلسلۂ حالات سے وابستہ ہیں اسلئے جب قلم بند کئے جائیں گے تو تمام واقعات کا عنوان رسول اللہ صلعم کا نام نامی قرار دیا جائے گا، اس لئے ہم نے مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا کہ یہ واقعات نہایت اختصار سے لکھے جائیں''۔[9]

مسلمانوں کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقام ومرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ان کا مختصر دورِ حکومت بھی بہت اہم اور عظیم ہے، مانعینِ زکوٰۃ اور مرتدین اسلام کے بارے میں ان کا جو اہم کردار رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، حضرت عمرؓ کی شرکت مشورہ اور رضامندی ہر مرحلہ میں شامل تھی لیکن شبلی نے ان تمام واقعات کو یہ کہہ کر یکسر نظر انداز کردیا ''کہ ان وقعات کو ہم الفاروق میں نہیں لکھ سکتے کیونکہ وہ عہد صدیقی کے واقعات ہیں اور اس شخص کا حصہ ہیں جس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سوانح عمری لکھنے کا شرف حاصل ہو''۔[10] لیکن المامون میں شبلی اس اصول کے پابند دکھائی نہیں دیئے ہیں، ہارون الرشید کے بعد امین کے چار سالہ دورِ خلافت میں وہ مامون کے تمام واقعات اس طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ کبھی کبھی مغالطہ ہوتا ہے کہ ہم مامون کے بجائے امین کی سوانح اور تاریخ پڑھ رہے ہیں، عہد صدیقی کی طرح عہد امینی کے واقعات کی ترتیب اس شخص کا حصہ ہونا چاہیے تھا جس کو

امین کی سوانح عمری لکھنے کا شرف حاصل ہو۔

الفاروق کے مباحث:

سوانح تصنیفات کا جو سلسلہ شبلی نے شروع کیا تھا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مستشرقین کے پھیلائے ہوئے زہریلے اور جھوٹے پروپگنڈہ کا مدلل جواب دیا جائے، انگریزوں نے سیاسی حربوں سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ حکومت وسیادت صرف انگریزوں ہی کا حصہ ہے اوراس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوسکتا، اسی چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے شبلی نے حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت کا انتخاب کیا۔

حضرت عمرؓ کی علمی، روحانی، مذہبی اور ذاتی شخصیت کا نقشہ تو بہت سے مصنفین بیان کر چکے تھے، لیکن ان کے دس سالہ سیاسی نظامِ حکومت سے کسی نے تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی تھی، الفاروق کے دوسرے جزء میں شبلی نے حضرت عمر فاروقؓ کے دس سالہ دورِ حکومت کو ہی اصل موضوع بنا کر عہد فاروقی کی بازیافت کی، اور استدلال سے یہ ثابت کر دیا کہ انگریز جس نظامِ حکومت پر فخر کرتے ہیں وہ حضرت عمرؓ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عملی طور پر نافذ کر چکے تھے،اور حضرت عمرؓ کے نظام حکومت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی تصویر اس طرح کھینچی کہ اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم عصر حاضر کے کسی نظامِ حکومت کا حال پڑھ رہے ہیں، یہ ایک ایسا گوشہ تھا جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے خوب لکھا ہے کہ ''الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طر ح نہیں ابھارا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمد للہ پوری طرح موجود ہی ہے، مصنف نے صرف اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے، جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اور جس کی ضرورت ان کے عہد میں بہت شدید تھی چنانچہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا'' [۱۱]

یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول میں حضرت عمر فاروقؓ کے زندگی کے واقعات وحالات بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں عہد خلافت کی مکمل تاریخ آ گئی ہے سوانحی اہمیت اور مقام ومرتبہ کا اندازہ الفاروق کے مصادر دیکھ کر بخوبی ہوجاتا ہے کہ شبلی نے

تحقیق وجستجو، مواد اور روایت ودرایت کے اصول وضوابط کو جمع وتدوین میں اولین اہمیت دی ہے، اسی لئے اصول وضوابط کی وضاحت کے لئے شروع میں ہی دیباچہ لکھ کر تفصیل کے ساتھ گذشتہ اسلامی مؤرخین اور سوانح نگاروں کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک اہم اور بنیادی اصول عقل کو بھی بنایا ہے، جس کی روشنی میں واقعات کے جھوٹ اور سچ کی تمیز کی جاسکے، آپ نے حضرت عمرؓ کی سختی، صلابت ذاتی زندگی اور معاشرتی کردار کو اس وقت کے معاشرے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کو بادشاہ عمرؓ کے بجائے خلیفہ عمرؓ ثابت کیا ہے، حضرت عمرؓ کے مزاج میں ایک طرح کی سختی تھی، اس کو تمام مؤرخین بہت زور وشور سے بیان کرتے ہیں، لیکن خلیفہ بننے سے پہلے اور خلیفہ بننے کے بعد ان کے مزاج میں کس طرح کی تبدیلی واقع ہوئی، شبلی نے اس کو زیر بحث لاکر یہ بات صاف کردی کہ حضرت عمرؓ کے احکام بالکل مناسب تھے، ان میں نہ کوئی سختی تھی اور نہ ہی کسی کی دل آزاری مقصود ومطلوب تھی۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے دوران واقعہ قرطاس پر بھی شبلی نے بحث کی ہے، اور روایات کی تحقیق وجستجو اور چھان بین کے بعد اصول عقلی کو استعمال کرتے ہوئے یہ لکھا ہے

"ممکن ہے کہ کسی کوتاہ نظر پر یہ امر گراں گذرے کہ بخاری اور مسلم کی حدیث پر شبہ کیا جائے، لیکن اس کو سمجھنا چاہئے کہ بخاری اور مسلم کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے"[۱۲]

کتاب کے دوسرے جزء میں جیسا کہ لکھا جاچکا ہے کہ شبلی نے عہدِ فاروقی کی بازیافت کی ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آج کے ترقی یافتہ نظامِ حکومت میں جو شعبے ہم دیکھتے ہیں، شبلی نے عہدِ فاروقی میں ہی ان شعبوں کی نشاندھی کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے اکثر شعبہ جات حضرت عمر فاروقؓ کے ایجاد کردہ ہیں وزادتِ قانون کے تحت رومن امپائر کے قواعد عدالت کا حضرت عمرؓ کے قواعد سے موازنہ کیا ہے، محکمہ بیت المال محکمہ رفاہ عامہ، محکمہ دفاع، امور مذہب محکمہ تعلیم، محکمہ ڈاک، مجلس شوریٰ اور دوسرے محکمے عہد فاروقی میں نہ صرف موجود تھے بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک قانون اور ضابطہ کے تحت خلیفہ کی نگرانی میں اپنا

کام انجام دے رہے تھے، شبلی نے عہد فاروقی کے اس سیاسی اور اسلامی طرزِ حکومت کو منظر عام پر لاکر مسلمانوں کو ان کے ماضی سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے بقول علامہ سید سلیمان ندوی ''انہوں نے اپنی تلاش ومحنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہدِ حال کے اقتضاء کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انہوں نے دنیا کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہے تو پیش کرے،'' [۱۳]

تحقیق وجستجو اور مواد کے اعتبار سے یہ سوانح ایسی ہے کہ یورپ کے مستشرقین کی کتابیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، شبلی نے اس میں بنیادی مصادر نامعلوم گوشوں اور نادر کتابوں کے مطالعہ سے اہم نتائج نکال کر اس کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے، جس کا اعتراف مستشرقین خود کرچکے ہیں، الغرض الفاروق شبلی کی ایک ایسی تصنیف ہے جو سوانح عمریوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور سوانح نگاری کے اصول وضوابط کے مطابق تمام خصوصیات کی حامل مکمل اور مفصل کتاب ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ مقالاتِ شبلی، جلد ۱، ص: ۸۲

۲۔ الفاروق، جلد ۱، ص: ۱۳

۳۔ ایضاً، جلد ۱، ص: ۱۵

۴۔ مقالاتِ شبلی، جلد ۴، ص: ۵۹

۵۔ المامون، ص: ۱۹

۶۔ ایضاً، ص: ۲۰۰

۷۔ النعمان، جلد ۱، ص: ۶۸

۸۔ ایضاً، جلد ۱، ص: ۳

۹۔ الفاروق، جلد ۱، ص: ۲۹۔۳۰

۱۰۔ ایضاً، جلد ۱، ص: ۹۴

۱۱۔ حیاتِ شبلی، ص: ۳۱۔۳۲

۱۲۔ الفاروق، جلد ۱، ص: ۶۳۔۶۴

۱۳۔ حیاتِ شبلی، ص: ۳۱۔۳۲

ادارہ علوم اسلامیہ کی مطبوعات

۱۔	Muhmmad Abduh	Mahmudul Haq	1970
۲۔	The Religion	Ahmad Ashfaq & A. Saeed	1970
۳۔	عبدالرحمٰن الکواکبی	محمود الحق	۱۹۷۲
۴۔	ابن الفارض	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ	۱۹۷۳
۵۔	اصول فہرست نگاری	سید محمود حسن قیصر	۱۹۷۵
۶۔	Arab Geographical Thought	Dr. S.M. Ali	1976
۷۔	سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان	ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی	۱۹۷۶
۸۔	سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان۔ حصہ دوم	ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی	۱۹۸۰
۹۔	Some Aspects of Turkish Islamic Culture	N. Akmal Ayyubi	1988
۱۰۔	Life & Thoughts of Muhmmad bin Abdul Wahab	Dr.Sayyid Ahsan	1988
۱۱۔	Like & Works of Zia Gokalp.	Dr. S. Sibtey Hasan	1988
۱۲۔	جدید تاجیکی شعراء	کبیر احمد جائسی	۱۹۹۰
۱۳۔	فارسی قصیدہ نگاری	نذیر احمد	۱۹۹۱
۱۴۔	علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء	محمد سالم قدوائی	۱۹۹۱
۱۵۔	ارمغان سعید	عضد الدین خاں	۱۹۹۱
۱۶۔	افکار و احوال	محمد سالم قدوائی	۱۹۹۲
۱۷۔	Reason and Tradition in Islamic Thought	Mahmudul Haq	1992
۱۸۔	چند ایران شناس	کبیر احمد جائسی	۱۹۹۲

خطابت فاروقی ۔ الفاروق کے حوالہ سے

ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی☆

جب بھی کسی قوم یا ملک میں کوئی تحریک ابھرتی ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا معاشرتی اس کو لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ سب سے پہلے خطابت کو بنایا جاتا ہے کیونکہ خطابت کے ذریعہ تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ رکھنے والے اور ان پڑھ و معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے سب تک اپنی بات آسانی سے پہنچائی جا سکتی ہے اور خطابت ہی سے اس بات کا فوری طور پر اندازہ بھی لگ جاتا ہے کہ مخاطب پر اس کا کتنا اثر ہوا۔ انسانی تاریخ کے ہر موڑ پر نئی تحریک کے داعی خطابت اور تقریر کے ماہر لوگ رہے ہیں۔ خدا نے ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں اپنے پیغمبروں کو اس صفت سے متصف کرکے بھیجا، جنہوں نے اپنے زور بیان کے سہارے ملک و قوم کے ذہنوں میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر دیا۔

اسلام کی دعوت چونکہ بڑی حد تک انوکھی اور دور رس نتائج کی حامل تھی اس لئے اس کے داعی کو اللہ نے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح کرکے بھیجا اور ان میں سب سے بڑا مؤثر حربہ زبان تھی اور زبان کا مظہر خطابت تھا۔ صدر اسلام میں عربی خطابت کو اتنی ترقی ہوئی اور اس کے ایسے ایسے نمونے سامنے آئے جو بعد میں آنے والوں کے لئے مشعل راہ بنے اور عربی ادب میں ایسے بے نظیر شہ پارے بن گئے جو آج تک پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے چاروں خلفاء بھی اس فن میں ممتاز رہے اور سربراہ مملکت ہونے کی وجہ سے زبان و بیان کی اثر اندازی کے بے مثال مقرر تھے۔ اسلام میں خطبوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے مسلمان عسکری قائدین اور سپہ سالاروں کے خطبوں نے جنگ کے پانسے پلٹ ڈالے ہیں اور بدترین حالات میں بھی قائد لشکر کے ایک خطبہ نے شکست کو فتح سے بدل دیا تھا۔ جہاد کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں خطباء اور مقررین نے اپنی شعلہ بیانی

اور کلام کی اثر انگیزی سے جذبہ شہادت کو ابھارا اور اس کے نتیجہ میں لوگ جوق در جوق اسلامی لشکر میں شامل ہوئے۔

بعض اسلامی عبادات میں بھی خطبے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً جمعہ اور عیدین کے خطبے حج میں عرفات کا خطبہ اور آپ کا خطبہ حجۃ الوداع ادب عالیہ کی دستاویز اور انسانی حقوق کی پاسداری اور آزادی کا بے نظیر منشور اور اثر انگیزی کا عظیم شاہکار ہے، جرجی زیدان نے صدر اسلام میں خطابت کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اسلام میں آکر خطابت میں بلاغت وحکمت دونوں کا اضافہ ہو گیا۔ قرآنی اسلوب نے شاعری کو تو متأثر کیا لیکن خطابت میں اس کے اثرات بہت نمایاں ہیں.......... اسلامی دور میں خطابت اس مقام اور مرتبہ تک پہنچ چکی تھی کہ اس سے قبل سابقہ امم میں کسی کے نزدیک اس کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا تھا، حتی کہ یونانی اور رومی بھی پیچھے رہ گئے تھے"۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ آداب اللغة العربية ۱:۱۸۸)

اسلامی تاریخ میں حضور ﷺ کے بعد حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ دوم کا نام بار بار زبانوں پر آتا ہے، خداوند کریم نے حضرت عمرؓ کی ذات میں وہ خوبیاں جمع کر دی تھیں جو اعلیٰ اقدار کی مثالیں ہوسکتی ہیں۔ جب کبھی زہد وتقوی کا ذکر آتا ہے تو ذہن حضرت عمرؓ کی جانب منتقل ہوتا ہے اور جب کبھی عدل وانصاف کا تذکرہ ہوتا ہے تو عدل فاروقی کی طرف ذہن جاتا ہے اور جب علم وفضل اور تفقہ فی الدین پر بات ہوتی ہے تو حضرت عمرؓ کا علم وفضل اور تفقہ فی الدین ذہن میں آتا ہے۔ مسیحی دنیا اور عیسائی یورپ نے خلفائے راشدین کے خلاف بالعموم اور حضرت عمرؓ کے خلاف بالخصوص ایک محاذ کھول رکھا تھا اور اسی بات کو پیش نظر رکھ کر متعدد مؤلفین نے خلفائے راشدین کی حیات مبارکہ پر تصانیف پیش کیں اور حضرت عمرؓ کی سیرت مبارکہ پر غالباً سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ مولانا شبلیؒ نے بھی اسلام کی مکمل اور باضابطہ تاریخ لکھنے کے بجائے اس کو ترجیح دی کہ "ناموران اسلام" پر قلم اٹھائیں اور اس سلسلہ کی اولین کڑی الفاروق کی شکل میں سامنے آئی یہ کتاب ان کے مؤرخانہ اجتہادات اور علمی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے جس کے لئے انہوں نے مصر، شام اور ترکی کا سفر اختیار

کیا۔ ''مؤلف نے حیات عمرؓ کے صرف اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور جس کی ضرورت ان کے عہد میں بہت شدید تھی۔ چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ '' الفاروق'' نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا'' (حیات شبلی از سید سلیمان ندوی دیباچہ ص : ۳۲) اس تصنیف میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف نے خطابت فاروقی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور بقول ان کے ''قوت تقریر کی نسبت اگر چہ کوئی مصرح شہادت موجود نہیں لیکن یہ امر تمام مؤرخین نے باتفاق لکھا ہے کہ اسلام لانے سے قبل قریش نے ان کو سفارت کا منصب دیدیا تھا، اور یہ منصب صرف اس شخص کو مل سکتا تھا جو قوت تقریر اور معاملہ فہمی میں کمال رکھتا تھا''۔ (الفاروق ۱: ۲۸)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مجلس کے انعقاد کا طریقہ بقول مولانا شبلیؒ یہ تھا کہ '' پہلے ایک منادی اعلان کرتا تھا ''الصلوٰۃ جامعۃ'' جب اس کو سن کر سب لوگ اکٹھا ہو جاتے تو حضرت عمرؓ مسجد میں تشریف لاتے، دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا'' (ایضاً ۲: ۱۶)۔ حضور اکرم ﷺ کے سانحہ ارتحال کے بعد امت مسلمہ کے سامنے جو مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ آپ کی جانشینی کا تھا۔ حضرت عمر نے جس سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ امت کے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنے کے لئے وہ سقیفۂ بنی ساعدہ پہنچے اور حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعت کر کے امت کو ایک بڑے فتنہ سے بچالیا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ایک خطبہ میں یہ منقول ہے ''فلا یغترنّ امرءٌ ان یقول اما کانت بیعة ابی بکر فلتة وتمت الا وانها قد کانت کذلک لکن اللہ وقی شرها'' (ایضاً ۲: ۱۴)

حضرت عمرؓ ایسے شخص تھے جن کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور اپنے بعض کمزوریوں کا اعتراف برملا کرنے میں انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ انہیں میں ان کے مزاج کی تیزی تھی اور بسا اوقات وہ حضورؐ سے بھی بحث کر بیٹھتے تھے چنانچہ حدیبیہ کا واقعہ سامنے ہے کہ حضرت عمرؓ نے آپؐ کے اقدام صلح کو دل سے قبول نہیں کیا تھا اور اس معاملہ میں آپؐ سے سوال و جواب

پر اتر آئے تھے لیکن جب اس صلح کے اثرات مرتب ہو کر سامنے آئے تو آپؓ کو بڑی ندامت ہوئی وہ کفارہ کے لئے روزے رکھتے تھے، نفلیں پڑھتے تھے، خیرات دیتے تھے اور راہ خدا میں غلام آزاد کرتے تھے، اپنے مزاج کی اسی تیزی کا احساس کرتے ہوئے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے جو پہلا خطبہ دیا تھا اس سے ان کے زور بیان اور اعتراف حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے اس خطبہ کا مفہوم کچھ اس طرح ہے "اے خدا میں سخت ہو مجھے نرم کر میں کمزور ہوں مجھے قوت دے (قوم کو خطاب کر کے) ہاں عرب سرکش اونٹ ہیں جن کی مہار میرے ہاتھ میں ہے لیکن میں ان کو راستہ پر چلاؤنگا" (الفاروق ۲:۲۶۱)

فتح عراق وشام کے بعد وہاں کی جاگیر کو فوج دیئے جانے کے مسئلہ پر جو بحث ہوئی اور اس بحث کا سلسلہ کئی دنوں چلتا رہا اس موقعہ پر حضرت عمرؓ نے جو خطاب کیا وہ منصب خلافت کی حقیقت اور خلیفہ وقت کے اختیارات کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنے کے لئے کافی ہے "انی لم ازعجکم الالان تشرکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم فانی واحد کا حدکم ولست ارید ان تتبعوا اھوای" (ایضاً ۲:۱۶)

عہد فاروقی میں مدینہ کا نظام حکومت اسی بنیاد پر قائم تھا جو عہد رسالت اس کے بعد عہد صدیقیؓ میں اس کے لئے مقرر کی گئی تھی یہ بنیاد شوریٰ تھی۔ یہی طریقہ حضرت عمرؓ نے بھی اختیار کیا تھا اور شوریٰ کو اپنی حکومت کی بنیاد قرار دیا۔ اس زمانہ میں شوریٰ کا کوئی ایسا نظام نہیں تھا جیسا کہ آج کل پارلیمانی نظام میں ہوتا ہے جو خلیفہ کے اختیارات کو محدود کردے اور نہ مجلس شوریٰ کے اراکین کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر سکیں بلکہ شوریٰ کے باوجود خلیفہ اپنے اختیارات میں آزاد ہوتا تھا اور اس کی باز پرس خدا، خلیفہ کے ضمیر اور ان عوام کے ذمہ تھی جنہوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی جب وہ حق سے تجاوز اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا، اپنے رب اور اپنے ضمیر کے مواخذہ کا اسے خوف نہ ہوتا تو پھر عوام پر فرض ہو جاتا تھا کہ اس کی کجی کو تلوار کی دھار سے سیدھا کر دیں۔ مجلس شوری کے انتخاب کا طریقہ بھی وہ نہ تھا جو آج کل ہم دیکھتے ہیں بلکہ خلیفہ خود اپنے مشیروں کا

انتخاب کرتا تھا اور یہ مشیر جو رائے دیتے تھے ان کا موازنہ کرکے جس رائے کو چاہے قبول کرلیتا اور جس کو چاہے رد کردیتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے یہاں بقول مولانا شبلی جمہوری نظام اس قدر پختہ تھا کہ "عام معاشرت میں اس کی حاکمانہ حیثیت کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے اس کے اختیارات محدود ہوں، ہر شخص کو نکتہ چینی کا حق حاصل ہو۔ یہ تمام امور حضرت عمرؓ کی خلافت میں اس درجہ تک پہنچے ہوئے تھے وہ اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا............ ایک موقع پر انہوں نے اس کے متعلق جو تقریر کی اس کے بعض بعض فقرے اس موقعہ پر لکھنے کے قابل ہیں "مجھ کو تمہارے مال (یعنی بیت المال) میں اس قدر حق ہے جتنا یتیم کے مربی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں دولت مند ہونگا تو کچھ نہ لونگا۔ اور ضرورت پڑے گی تو دستور کے موافق کھانے کے لئے لونگا۔ صاحبو میرے اوپر تم لوگوں کے متعدد حقوق ہیں جس کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہئے۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت بیجا طور سے نہ جمع کیا جائے۔ ایک یہ کہ جب میرے ہاتھ میں خراج اور مال غنیمت آئے تو بیجا طور سے صرف نہ ہونے پائے، ایک یہ کہ میں تمہارے روزینے بڑھاؤں اور سرحدوں کو محفوظ رکھوں۔ ایک یہ کہ میں تم کو خطروں میں نہ ڈالوں" (الفاروق ۲: ۲۰)

حضرت عمرؓ نے جس طرح اپنے اختیارات کی حد بندی کررکھی تھی اسی طرح وہ اپنے عاملوں کے سلسلہ میں محتاط تھے۔ جس کو عامل مقرر کرتے اس کو ایک فرمان جاری کرتے جس میں اس کے اختیارات اور فرائض کا ذکر ہوا کرتا تھا اور جب عامل کبھی مقررہ حدود سے تجاوز کرتا تو اس کی باز پرس کی جاتی تھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا شبلی لکھتے ہیں "حضرت عمرؓ کو اس بات کا سخت اہتمام تھا کہ عاملوں کے جو فرائض ہیں ایک ایک ان سے واقف ہوجائے چنانچہ بارہا مختلف مقامات اور مختلف موقعوں پر اس کے متعلق خطبے دیتے، ایک خطبہ میں جو مجمع عام میں دیا تھا عاملوں کو مخاطب کرکے یہ الفاظ فرمائے: **ألا وانی لم ابعثکم امراء ولا جبارین ولکن بعثتکم ائمة الھدیٰ یھتدی بکم فادر واعلی المسلمین**

حقوقهم ولا تضربوهم فتذلوهم ولا تحمدوهم فتفتنوهم ولا تغلقوا الا بواب دونهم فياكل قويهم ضعيفهم ولا تستا ثروا عليهم فتظلموهم" (الفاروق۲:۳۱)

وہ مسلمانوں کے صرف سیاسی اور سماجی مسائل کو سامنے نہیں رکھتے تھے بلکہ دینی امور کے معاملہ میں بھی بیحد حساس تھے۔ ایسی مثالیں بہت سی موجود ہیں کہ جن لوگوں کو فتوی دینے کی اجازت نہیں تھی انہوں نے فتوی دیا تو حضرت عمرؓ نے انکو روک دیا۔ شام کے سفر میں مقام جابیہ میں آپ نے جو مشہور خطبہ دیا اس میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص قرآن سیکھنا چاہے تو ابی بن کعبؓ کے پاس جائے، فرائض کے متعلق پوچھنا ہو تو زیدؓ کے پاس جائے اور فقہ سے متعلق سوال کرنا ہو تو معاذؓ کے پاس جائے"۔ (ایضاً ۲: ۷۲) اضلاع کے گورنر اور افسروں کی تقرری میں اسی چیز کو ملحوظ رکھتے تھے کہ عالم وفقیہ ہوں ایک مرتبہ مجمع عام میں خطبہ دیا جس میں یہ فرمایا"میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے افسروں کو اس لئے بھیجا ہے ہ لوگوں احکام ومسائل بتائیں" (الفاروق ۲:۱۳۶) جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ عاملوں کے ساتھ فرمان ہوا کرتا تھا جس میں ان کے اختیارات اور فرائض کا ذکر ہوتا تھا اور مقررہ حدود کی خلاف ورزی کرنے پر مواخذہ کیا جاتا تھا۔ مولانا شبلی نے حضرت عمر کے اس طرز عمل کے متعلق ایک خطبہ کا تذکرہ کیا ہے"تمام عمال کو حکم تھا کہ ہر سال حج کے زمانہ میں حاضر ہوں، حج کی تقریب میں تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے تھے، حضرت عمرؓ کھڑے ہو کر باعلان کہتے تھے کہ جس کو کسی عامل سے کچھ شکایت ہو پیش کرے۔ چنانچہ ذرا ذرا سی شکایتیں پیش ہوتی تھیں اور تحقیقات ہو کر اس کا تدارک کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے بہت بڑا مجمع کر کے خطبہ دیا اور کہا"صاحبو عمال جو مقرر کر کے بھیجے جاتے ہیں اس لئے نہیں بھیجے جاتے کہ تم کو طمانچے ماریں یا تمہارا مال چھین لیں بلکہ میں ان کو اس لئے بھیجتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ سکھائیں۔ سو اگر کسی عامل نے اس کے خلاف کیا ہو تو مجھ سے بیان کرو تا کہ میں اس کا انتقام

لوں" عمرو بن العاصؓ نے جو مصر کے گورنر تھے اٹھ کر کہا کہ "اگر کوئی عامل ادب دینے کے لئے کسی کو ماریگا تب بھی آپ سزا دیں گے؟" حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ضرور میں سزا دونگا کیونکہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے خبردار مسلمانوں کو نہ مارا کرو ورنہ وہ ذلیل ہو جائیں گے، ان کے حقوق تلف نہ کرو ورنہ وہ کفران نعمت پر مجبور ہوں گے" (ایضاً ۲:۳۲۔۳۳)

حضرت عمر کی خطابت میں جدت سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مولانا شبلیؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیاسی خطبات کا آغاز کیا ہے۔ ان سے قبل عام طور پر جو خطبے ہوا کرتے وہ بیش تر پند ونصائح، فخر ومباہات، قدرتی واقعات کے بیان اور رنج وخوشی کے اظہار سے متعلق ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے سیاسی خطبات کا آغاز کیا۔ خاص طور پر وہ خطبہ جو انہوں نے خلیفہ ہونے کے بعد دیا تھا اس کی حیثیت آج کل کی پالیسی تقریر جیسی ہے کہ جس میں حکومت کے اغراض ومقاصد کو نمایاں طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس خطبہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔" ایها الناس انه لم یبلغ ذوحق فی حقه ان یطاع فی معصیة الله وانی لا اجد هذا المال یصلحه الا خلال ثلاث ان یوخذ بالحق ویعطی بالحق ویمنع من الباطل. ولست ادع احداً یظلم احدا حتی اضع خده علی الارض او أضع قدی علی خدّه الآخر حتی یذعن للحق. یا ایها الناس ان الله عظّم حقه فوق حق خلقه فقال فیما عظّم من حقه ولا یامرکم ان تتخدوا الملئکة اربابا............"

ایک دوسرا خطبہ جس کو تاریخ نے محفوظ کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں" فانتم مستخلفون فی الارض قاهرون لاهلها. قد نصر الله دینکم فلا تصبح امة مخالفة لدینکم الا امتان. امة مستعبدة للاسلام واهله یتجزون لکم علیهم المؤنة ولکم المنفعة وامة ینتظرون وقائع الله وسطواته فی کل یوم ولیلة قدملأ الله قلوبهم رعباه قد دهمتهم جنود الله ونزلت

بساحتهم مع رفاهة العيش واستفاضة المال وتتابع البعوث وسدّ الثغور............" (الفاروق ۲۶۴۲)

اہل عرب کی روحانی تربیت صحیح معنوں میں اگر چہ آمد اسلام سے ہوئی تاہم زمانہ ماقبل اسلام میں ان کے اندر بہت سی ایسی خوبیاں تھیں کہ جو شرافت ونجابت کی مثالیں ہیں اور جن خوبیوں پر ہر قوم ہر دور میں فخر کرسکتی ہے جیسے فصاحت وبلاغت، قوت تقریر، شاعری، بہادری، آزادی، مہمان نوازی اور ایفائے عہد وغیرہ اور حضرت عمرؓ کو قدرت نے ان سب خوبیوں سے مالا مال کیا تھا۔ حضرت عمرؓ جب بڑے ہوئے تو ان میں فضل وکمال، عقل وحکمت اور شجاعت کے ساتھ انساب، تاریخ قبائل اور شعروشاعری کے ذوق نے انہیں دوسروں سے ممتاز کردیا تھا، قریش نے ان کے ذمہ اس زمانہ کا اہم ترین منصب یعنی سفارت کا کام ان کے سپرد کررکھا تھا۔ قبائل کے درمیان لڑائی جھگڑے میں صلح وصفائی کا کام حضرت عمرؓ ہی کیا کرتے تھے۔ اگر قریش سے کوئی قبیلہ "منافرہ" یعنی اپنی خوبیاں گنانے میں یا "مفاخرہ" یعنی اپنے کارنامے گنا کر فخر کرنے میں مقابلہ کرتا تھا تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کا انتخاب ہوتا تھا کیونکہ وہ انساب عرب، اخبار عرب اور اشعار عرب سے خوب واقف تھے، نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کے علوم وفنون اور تاریخ کو یاد کرنے کی ہدایت بھی کیا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن عمرؓ سے کہا کہ اپنا حسب ونسب اچھی طرح یاد رکھا کرو اس لئے کہ جس نے اپنا حسب ونسب نہیں جانا وہ صلہ رحمی نہیں کرسکتا اور جس نے اچھے اشعار یاد نہیں رکھے وہ نہ کوئی حق ادا کرسکتا ہے اور نہ کوئی ادب سیکھ سکتا ہے" حضرت عمرؓ کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور کثرت تلاوت کی وجہ سے زبان وبیان اور علوم شرعیہ پر زبردست ملکہ حاصل تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ "اللہ کی کتاب کے علم کو عمرؓ ہم سب سے زیادہ جانتے تھے اور اللہ کے دین کے معاملہ میں ہم سب سے زیادہ فقیہ تھے یعنی صاحب فکر ونظر تھے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے ترازو کے ایک پلڑے میں عمرؓ کا علم اور

دوسرے میں ساری دنیا کا علم رکھا جائے تو یقیناً عمرؓ کے علم کا پلڑا بھاری رہیگا'' (تاریخ العرب از ڈاکٹر محمد اسعد طلس ۳: ۴ و ماخذ عربی ادب کی تاریخ عبدالحلیم ندوی، ۲: ۸۸)

مولانا شبلیؒ کے مطابق حضرت عمرؓ کے اندر ''تقریر کا ملکہ خدا داد تھا اور عکاظ کے معرکوں نے اس کو اور زیادہ جلاء دیدی تھی، یہی قابلیت تھی جس کی وجہ سے قریش نے ان کو سفارت کا منصب دیا تھا جوان لوگوں کے لئے مخصوص تھا جو سب سے زیادہ زبان آور ہوتے تھے۔ ان کے معمولی جملوں میں آرٹری کا اثر اور برمحل فقرے جوان کے منہ سے نکل جاتے تھے ان میں بلاغت کی روح پائی جاتی تھی، عمرو بن معدیکرب کو جب پہلے پہل دیکھا تو چونکہ وہ غیر معمولی تن وتوش کے آدمی تھے اس لئے متحیر ہو کر کہا ''اللہ اس کا اور ہمارا خالق ایک ہی ہے'' مطلب یہ کہ ہمارے جسم میں اور اس میں اس قدر تفاوت ہے کہ دونوں ایک کاریگر کے کام نہیں معلوم ہوتے، وبا کے واقعہ میں بوعبیدہؓ نے جب ان پر اعتراض کیا کہ آپ قضائے الہی سے بھاگتے ہیں تو کس قدر بلیغ لفظوں میں جواب دیا کہ ''ہاں قضائے الہی سے قضائے الہی کی طرف بھاگتا ہوں'' (الفاروق ۲: ۲۶)

حضرت عمرؓ کے خطبات اور وصایا کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بعض جگہ وہ زور بیان اور انداز خطابت ملتا ہے جو دوسرے خطباء کے یہاں خال خال نظر آتا ہے ایسا لگتا ہے کہ ان کی شخصیت جیسی بھاری بھرکم تھی، ویسی ہی ان کی تقریریں مقولے، نصیحتیں اور رائیں بھاری بھرکم مؤثر حقیقت پر مبنی اور علم وادب کا نمونہ تھیں ''خلافت کے دوسرے تیسرے دن جب انہوں نے عراق پر لشکر کشی کرنے کے لئے لوگوں کو جمع کیا تو لوگ ایران کے نام سے جی چراتے تھے خصوصاً اس وجہ سے کہ حضرت خالدؓ وہاں سے بلا لئے گئے تھے، اس موقعہ پر حضرت عمرؓ کے زور تقریر کا اثر تھا کہ مثنی شیبانی ایک مشہور بہادر بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور پھر تمام مجمع میں آگ سی لگ گئی دمشق کے سفر میں جابیہ میں ہر قوم اور ہر ملت کے آدمی جمع تھے.........
مختلف مضامین اور مختلف مطالب کا ادا کرنا تھا، مسلمانوں کو اخلاق کی تعلیم دینی تھی،

غیر قوموں کو اسلام کی حقیقت اور اسلام کی جنگ وصلح کے اغراض بتاتے تھے، فوج کے سامنے حضرت خالدؓ کی معزولی کا عذر کرنا تھا۔ ان تمام مطالب کو اس خوبی سے ادا کیا کہ مدت تک ان کی تقریر کے جستہ جستہ فقرے لوگوں کی زبانوں پر رہے۔ فقہاء نے اس سے فقہی مسائل استنباط کئے، اہل ادب نے قواعد فصاحت وبلاغت کی مثالیں پیدا کیں، تصوف واخلاق کے مضامین لکھنے والوں نے اپنا کام لیا'' (الفاروق ۲:۲۶۱)

حضرت عمرؓ انتظامی اور اداراتی معاملات امتیازی شان رکھنے کے علاوہ دینی معاملات میں بھی بالغ نظری، معاملہ فہمی کے ساتھ حالات وضرورت کے پیش نظر فیصلہ کرنے میں اجتہادی شان کے مالک تھے۔ اور اچانک کسی نامناسب بات کے پیش آجانے پر اس کے تدارک کے لئے سدّ باب کی کوشش فرماتے تھے۔'' ۲۳ھ میں جب حج کیا اور یہ ان کا آخری حج تھا تو ایک شخص نے کسی سے تذکرہ کردیا کہ عمر مرجائیں گے تو میں طلحہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرونگا۔ حضرت عمرؓ مقام منی میں تشریف رکھتے تھے اور وہیں یہ واقعہ پیش آیا، اس واقعہ کی خبر ہوئی تو برا فروختہ ہوکر فرمایا کہ آج رات میں اس مضمون پر خطبہ دونگا'' لیکن بعض وجوہات کی بناپر آپ نے مدینہ میں خطبہ دینا منظور کرلیا'' آخر ذی الحجہ میں مدینہ آئے، جمعہ کے دن لوگ بڑے شوق وانتظار سے مسجد میں پہلے سے آکر جمع ہوئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ زیادہ مشتاق تھے اس لئے منبر کے قریب جاکر بیٹھے اور سعید بن زیدؓ سے مخاطب ہوکر کہا کہ'' آج عمر ایسی تقریر کریں گے کہ کبھی نہیں کی تھی'' سعید نے تعجب سے کہا کہ ایسی نئی بات کیا ہوسکتی ہے جو انہوں نے پہلے نہیں کہی؟ عرض اذان ہوچکی تو حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا یہ پورا واقعہ اور پورا خطبہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ اس میں سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ، انصار کے خیالات، حضرت ابوبکرؓ کے جواب بیعت کی کیفیت، خلافت کی حقیقت کو اس خوبی اور عمدگی سے ادا کیا کہ اس سے بڑھ کرنا ممکن تھا۔ اس تقریر کو پڑھ کر بالکل ذہن نشین ہوجاتا ہے کہ اس وقت جو کچھ ہوا وہی ہونا چاہئے تھا اور وہی ہو سکتا تھا'' (الفاروق ۲:۲۶۲)

حضرت عمرؓ اگر چہ اکثر برمحل اور برجستہ خطبہ دیتے تھے لیکن جو معرکے کے خطبے ہوتے تھے ان میں تیار ہو کر جاتے تھے۔ سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ میں خود ان کا بیان ہے کہ ''میں خوب تیار ہو کر گیا تھا'' حضرت عثمانؓ جب خلیفہ ہوئے اور خطبہ دینے کے لئے منبر پر چڑھے تو دفعتہً رک گئے اور زبان نے یاری نہ دی، اس وقت یہ عذر کیا کہ ابوبکر وعمر خطبہ کے لئے تیار ہو کر آتے تھے اور آئندہ سے میں بھی ایسا ہی کرونگا'' (الفاروق ۲: ۲۶۳)

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنی زبان دانی، اخبار عرب اشعار عرب اور انساب عرب سے مہارت تامہ کی وجہ سے ہر موضوع پر خطبے دیا کرتے تھے صرف یہی نہیں بلکہ سیاسی خطبات دینے میں اولیت آپ ہی کو حاصل ہے ''وہ اگر چہ ہر قسم کے مضامین پر خطبہ دے سکتے تھے لیکن ان کا خود بیان ہے کہ ''نکاح کا خطبہ مجھ سے بن نہیں آتا۔ عبد اللہ بن المقفع جو دولت عباسیہ کا مشہور ادیب اور فاضل تھا اس سے لوگوں نے حضرت عمرؓ کی اس معذوری کی وجہ پوچھی، اس نے کہا ''نکاح کے خطبہ میں حاضرین میں سے ہر شخص برابری کا درجہ رکھتا ہے، خطیب کی کوئی ممتاز حالت نہیں ہوتی بخلاف اس کے عام خطبوں میں خطیب جب منبر پر چڑھتا ہے تو تمام آدمی اس کو محکوم معلوم ہوتے ہیں اور اس وجہ سے خود بخود اس کی تقریر میں بلندی اور زور آجاتا ہے'' ممکن ہے کہ عبد اللہ بن المقفع کی یہ بات کسی حد تک درست ہو لیکن ہماری رائے میں علامہ شبلیؒ نے اس کی جو توجیہ کی ہے وہ زیادہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں ''لیکن ہمارے نزدیک اس کی یہ وجہ ہے کہ نکاح کے خطبہ میں موضوع سخن تنگ اور محدود ہوتا ہے اور ہر بار وہی معمولی باتیں کہنی پڑتی ہیں'' (الفاروق ۲: ۲۶۳)

خطبہ کے لئے ملکہ تقریر کے علاوہ اور دوسری جو خوبیاں ہونی چاہیے تھیں مثلاً خطیب مجمع کو مطمئن اور قائل کر کے اپنا ہم خیال بنائے، سننے والوں کی عقلی وذہنی سطح اور کیفیت سے پوری طرح واقف ہو، جس موضوع پر بول رہا ہے اس میں مہارت

تامہ حاصل ہو، زبان پر ایسی قدرت ہو کہ جب بولنا شروع کرے تو قوت بیان کی جاذبیت نیز قوت استدلال سے سامعین کے دل ودماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ پوری مطمئن ہو کر وہی کہنے لگیں جو خطیب ان سے کہلوانا چاہتا ہے یا وہی سب کرنے لگیں جو خطیب ان سے کروانا چاہتا ہے وجیہ بلند وبالا اور بارعب خوش شکل، خوش گفتار اور خوش وضع ہو تو اس کی تقریر سحر حلال ہو جائے گی۔ یہ تمام خوبیاں حضرت عمرؓ میں تھیں۔'' آواز بلند اور پر رعب تھی، قد اتنا بلند تھا کہ زمین پر کھڑے ہوتے تو معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر کھڑے ہیں .... حضرت عمرؓ کے خطبوں کا خاتمہ ہمیشہ ان فقروں پر ہوتا تھا "**اللهم لا تدعني في غمرة ولا تاخذني على عزة ولا تجعلني مع الغافلين**" (الفاروق۲: ۲۶۵)

حضرت عمر دس سال تک خلیفہ رہے اور اس قلیل عرصہ میں اسلامی حکومت کی جڑوں کو اتنا مضبوط کر گئے کہ بعد میں ہونے والے فتنہ وفساد اور سخت سیاسی ہنگاموں کے باوجود ایسا قصر معلیٰ کھڑا ہوا جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ آپ کی مختلف امتیازی خصوصیات کے علاوہ ابدی امتیاز کے لئے آپ کا یہ قول کافی ہے "لو كان بعدی نبی لکان عمر"۔

☆☆☆

حضرت عمر فاروقؓ کی جامع کمالات شخصیت

(الفاروق کی روشنی میں)

ڈاکٹر انجم آرا فلاحی

علامہ شبلی نعمانیؒ کی مایۂ ناز تصنیف ''الفاروق'' کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم کی شخصیت کے تمام پہلو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ پہلی مرتبہ قارئین کے سامنے آئے اس سے پہلے مختلف سیرت نگاروں اور مؤرخوں نے حضرت عمرؓ کی زندگی پر جو کچھ تحریر کیا تھا وہ مختصر بھی تھا اور آپ کی جامع کمالات شخصیت کے تمام پہلوؤں کی عکاسی بھی نہ کرتا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے تاریخ میں پہلی بار حضرت عمرؓ کی شخصیت، خدمات اور نظریات پر شرح وبسط کے ساتھ بڑے خوبصورت اور دل نشین انداز میں بحث کی اور وہ عظیم الشان سرمایہ چھوڑا جو ابھی تک اپنے موضوع پر تقریباً بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے نامور گزرے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی حضرت عمرؓ کا ہم پلّہ نظر نہیں آتا بقول علامہ شبلی:

''قانونِ فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے، ممکن بلکہ کثیر الوقوع ہے کہ ایک شخص ایک فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا، لیکن اور فضائل سے اس کو بہت کم حصہ ملا تھا، سکندر سب سے بڑا فاتح تھا، لیکن حکیم نہ تھا، ارسطو حکیم تھا، لیکن کشور ستان نہ تھا، بڑے بڑے کمالات ایک طرف، چھوٹی چھوٹی فضیلتیں بھی ایک شخص میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں، بہت سے نامور گزرے ہیں جو بہادر ہیں لیکن پاکیزہ اخلاق نہ تھے، بہت سے پاکیزہ اخلاق تھے، لیکن صاحب تدبیر نہ تھے بہت سے دونوں کے جامع تھے، لیکن علم وفضل سے بے بہرہ تھے۔

''اب حضرت عمرؓ کے حالات اور ان کی مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو، صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے، اور ارسطو بھی، مسیح بھی تھے، اور سلیمان بھی، تیمور بھی تھے، اور نوشیرواں بھی، امام ابو حنیفہ بھی تھے، اور ابراہیم آدہم بھی'' (الفاروق، ص: ۲۸٦۔۲۸۷)

فتوحات کے میدان میں بویب رمضان ۱۴ھ، قادسیہ محرم ۱۴ھ اور جلولاء ۱٦ھ ایران میں فتوحات کی تاریخ میں محیّر العقول سمجھے جاتے ہیں، شامی فتوحات میں ذوقعدہ ۱۴ھ میں فحل، ۱۴ھ میں حمص، رجب ۱۵ھ میں یرموک، فتح بیت المقدس ۱٦ھ میں، قیساریہ شوال ۱۹ھ میں اور جزیرہ ۱٦ھ میں اسلامی مملکت میں شامل ہوئے، وسط ایشیا کے علاقے آذر بائی جان ۲۲ھ طبرستان ۲۲ھ، آرمینیہ وفارس ۲۳ھ میں، کرمان، سیستان اور مکران ۲۳ھ میں فتح ہوئے ۲۰ھ میں مصر فتح ہوا اور ۲۱ھ میں اسکندریہ اسلامی قلم رَو میں شامل ہوا۔ ان تمام فتوحات ومقبوضات کا کل رقبہ ۲۲۵۱۰۳۰ میل مربع یعنی مکہ معظمہ سے شمال کی جانب ۱۰۳٦ مشرق کی جانب ۱۰۸۷ جنوب کی جانب ۴۸۳ میل تھا۔ ان تمام فتوحات کی مدت دس برس سے کچھ ہی زیادہ ہے، مزید برآں وہ تمام فوجیں جو مصر وایران وروم کی جنگوں میں مصروف رہیں ان کی مجموعی تعداد کبھی ایک لاکھ تک نہ پہنچی مگر فتوحات کی وسعت اور تیز رفتاری کی وجہ صاحب الفاروق کے نزدیک، یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت بانیٔ اسلام کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کردیا تھا روم وفارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر نہ اٹھاسکیں، البتہ اس کے ساتھ اور بھی چیزیں مل گئی تھیں جنہوں نے فتوحات میں نہیں بلکہ قیام حکومت میں مدددی۔ (الفاروق، ج۲، ص: ۵)

ان تمام لڑائیوں میں سب سے زیادہ خطرناک دو موقع تھے ایک نہاوند کا معرکہ جب ایرانیوں نے فارس کے تمام صوبوں میں ہر جگہ نقیب دوڑا کر پورے ملک میں آگ لگادی تھی اور لاکھوں فوج مہیا کر کے مسلمانوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دوسرے جب قیصر روم نے جزیرہ والوں کی عیانت سے دوبارہ حمص پر چڑھائی کی تھی۔ ان دونوں معرکوں میں صرف حضرت عمرؓ کی حسن تدبیر تھی جس نے ایک طرف ایک اٹھتے ہوئے طوفان کو دبادیا اور دوسری طرف ایک کوہِ گراں کے پَرَ کچے اڑادیئے، فتوحات کی ان تفصیلات سے علامہ شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے آج تک کوئی شخص فاروق اعظمؓ کے برابر فاتح اور کشور کشا نہیں گزرا (الفاروق ج،۲ص:۱۰)

علامہ شبلیؒ نظام خلافت وحکومت کے قیام واستحکام کے سلسلے میں یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ دراصل حضرت عمرؓ کے عہد سے شروع ہوتا ہے آپ نے نظام حکومت کو اس قدر ترقی دی کہ وفات تک حکومت کے جس قدر مختلف شعبے ہیں سب وجود میں آچکے تھے اس نظام خکومت کا سب سے بڑا امتیاز مجلس شوری کا انعقاد تھا، اس مجلس شوری میں اوس وخزرج دونوں خاندانوں کے لوگ شریک تھے، مجلس شوری کے تمام اراکین کے نام اگرچہ معلوم نہیں ہوسکے تاہم اس قدر معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ اس میں شامل تھے، یہ مجلس شوریٰ استحسان وتبرع کے طور پر نہ تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرمادیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں، ان کے خاص الفاظ ہیں:

لاخلافة الا عن مشورة (جلد دوم، ص:۱۵)

حضرت عمرؓ نے پورے ملک کو آٹھ صوبوں پر تقسیم کیا مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر، فلسطین، مؤرخین کے اس بیان کو علامہ شبلی اجمال قرار دیتے ہیں جس کی تفصیل آپ نے فراہم کی ہے۔ فاروقی فتوحات کو جو وسعت اور ہمہ گیریت حاصل تھی اس کے لحاظ سے یہ آٹھ صوبے کافی نہیں ہوسکتے تھے، اس تفصیل کے مطابق یہ آٹھ صوبے وہ تھے جنہیں خود حضرت عمرؓ نے قائم کئے تھے ان کے علاوہ جوممالک پہلے فتح ہوکر مختلف صوبوں میں تقسیم ہوچکے تھے انہیں حضرت عمرؓ نے اسی

طرح رہنے دیا تھا اور وہ ان آٹھ صوبوں کے علاوہ تھے، پھر حضرت عمرؓ نے صوبہ جات اور اَضلاع کی تقسیم کے بعد ملکی عہدداروں کے انتخاب اور ان کی کارروائی کا دستور عمل بھی تیار کیا اور حکومت کے اعضاء وجوارح اور عہدے داران کے انتخاب میں جس نکتہ رَسی، جوہر شناسی اور تدبیر وسیاست سے کام لیا ہے انصاف یہ ہے کہ تاریخ عالم کے ہزاروں اوراق الٹ کر بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ملکی انتظام میں حضرت عمرؓ نے محاصل کا باقاعدہ انتظام سب سے پہلے کیا اور اس کی ابتداء عراق سَواد کے خراج کے نظم ونسق سے ہوئی، اسی طرح حضرت عمرؓ کا قائم کردہ محکمہ قضاء بھی منفرد اور ممتاز ہے۔ آپ نے عدالت کو انتظامیہ سے آزاد کیا تمام ضلعوں میں عدالتیں قائم کیں، قاضی مقرر کئے اور قضا کے اصول وآئین بھی متعین کئے۔ ان عدالتی اصولوں کی تفصیل آپ کے اس فرمان میں ملتی ہے جو آپ نے گورنر کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام لکھا تھا، اسی طرح شعبہ افتاء بھی حضرت عمرؓ کے زمانے میں پوری طرح منظم تھا۔ آپ کے دور میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابو درداءؓ وغیرہ صحابہ کے سوا کوئی دوسرا فتوی دینے کے مجاز نہ تھا، آپ کے زمانہ میں پولس کا شعبہ مستقل طور پر قائم ہوگیا تھا جس کا نام احداث تھا اور پولس افسر کو صاحب الاحداث کہتے تھے، آپ ہی نے اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے جیل خانے بنوائے، اسی طرح مستقل طور پر بیت المال کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی، سب سے پہلے ۱۵ھ مدینہ منورہ میں بہت بڑا خزانہ قائم کیا اور حضرت عبد اللہ بن ارقم کو خزانے کا افسر مقرر کیا پھر ملک کے دوسرے شہروں میں بھی بیت المال کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ حضرت عمرؓ نے پبلک ورک یا نظارتِ نافعہ کا شعبہ بھی قائم کیا اس شعبے میں سرکاری عمارات، نہریں، سڑکیں، پُل اور شفا خانے شامل تھے۔

حضرت عمرؓ نے پورے ملک کی ایک مستقل فوج بنائی مگر اس کی ابتداء قریش

اور انصار سے کی حضرت مخرمہ بن نوفل، جبیر بن مطعم اور عقیل بن ابی طالبؓ کو بلا کر انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ قریش اور انصار کا ایک دفتر قائم کریں جس میں ہر شخص کا نام ونسب تفصیل سے درج ہو۔ اسی طرح دوسرے قبائل کے رجسٹر بھی تیار ہوئے اور تمام فوجیوں کی تنخواہیں بھی مقرر ہوئیں۔ آپ نے پورے ملک میں جو فوجی مراکز قائم کئے وہ ہیں مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، اردن اور فلسطین۔ فوجوں کے رہنے کے لئے بارکیں بنوائیں اور گھوڑوں کے لئے اسطبل خانے، ان صدر مقامات کے علاوہ بڑے بڑے شہروں اور مناسب مقامات میں نہایت کثرت سے فوجی چھونیاں بھی قائم کیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے خلافت فاروقی کے عادلانہ اور منصفانہ نظام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، آپ کے دور میں اظہار رائے کی بھرپور آزادی تھی۔ مختلف طبقوں کی تالیف قلب اور عربوں کے حریت پسند جوہر کی قدر افزائی پوری طرح موجود تھی مگر رعب داب کا یہ عالم تھا کہ حضرت خالدؓ کو عین اس وقت جب تمام عراق وشام میں لوگ ان کا کلمہ پڑھنے لگے تھے معزول کر دیا تو کسی نے دم نہ مارا اور خود حضرت خالدؓ کسی قسم کا خیال دل میں نہ لا سکے۔ امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی شان وشوکت محتاج بیان نہیں ہے لیکن حضرت عمرؓ کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا، عمرو بن العاصؓ کے بیٹے عبد اللہ نے ایک شخص کو بے وجہ مارا تھا۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ کے سامنے ان کو اسی مضروب کے ہاتھ سے کوڑے پٹوائے اور باپ بیٹے دونوں عبرت کا تماشا دیکھا کئے۔ سعد بن وقاصؓ فاتح ایران کو معمولی شکایت پر جوابدہی میں طلب کیا تو ان کو بے عذر حاضر ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو سیاست وتدبیر کے فن میں جو کمال تھا کسی مدبرّ اور فرماں روا کے حالات میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی (الفاروق، ج ۲، ص: ۱۶۵)۔ حضرت عمرؓ خلافت سے کسی قسم کا جاہ واعزاز حاصل کرنا نہ چاہتے تھے انہوں نے مجبوری میں اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ بار گراں ان کے سوا کسی سے اٹھ نہیں سکتا ذمہ داری قبول کی تھی اور اسی

لئے اعلیٰ درجہ کی فروتنی وخاکساری کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی خود اعتمادی بھی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اسی لئے پہلے ہی دن خطبہ میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

"لولا رجائی ان اکون خیرکم لکم واقواکم علیکم وان اشدکم اضطلاعاً ماینوب من مھمامرکم ماتولیت ذلک منکم".

"یعنی اگر مجھ کو یہ امید نہ ہوتی کہ میں تم لوگوں کے لئے سب سے زیادہ کارآمد، سب سے زیادہ وہ قوی اور مہمات امور کے لئے سب سے زیادہ قوی بازو ہوں تو میں اس منصب کو قبول نہ کرتا"

اس سے زیادہ وہ الفاظ ہیں جو امام محمد نے موطا میں روایت کئے ہیں:

"لوعلمت ان احداً اقوی علی ھذا الامرمنی لکان ان اقدم فیضرب عنقی اھون علیّ"

(یعنی اگر میں جانتا کہ کوئی شخص اس کام (خلافت) کے لئے مجھ سے زیادہ قوت رکھتا ہے تو خلافت قبول کرنے کے بہ نسبت میرے نزدیک یہ زیادہ آسان تھا کہ میری گردن ماردی جائے) (الفاروق، ج ۲ ص: ۱۶۹۔۱۷۰)

حضرت عمرؓ کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ قدیم سلطنتوں اور حکمرانوں کے قواعد اور انتظامات سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور ان میں جو چیزیں پسند کے قابل ہوتی تھیں اس کو اختیار کرتے تھے۔ خراج، عُشور، دفتر، رسد، کاغذات حساب ان تمام انتظامات میں انہوں نے ایران اور شام کے قدیم قواعد پر عمل کیا۔ البتہ جہاں کوئی نقص پایا ان کی اصلاح کردی۔ آپ نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ ملک کا کوئی واقعہ آپ سے مخفی نہ رہنے پائے۔ آپ نے انتظاماتِ ملکی کے ہر شعبے پر پرچہ نویس اور واقعہ نگار مقرر کر رکھے تھے۔ جس کی وجہ سے ملک کا ایک چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ان تک پہنچتا تھا۔ پھر بڑے اور اہم امور کے ساتھ ساتھ نہایت چھوٹے چھوٹے کام بھی وہ خود ہی انجام دیتے تھے۔ وظائف کی تقسیم خود اپنے ہاتھ سے کرتے،

مجاہدین کے گھروں پر جاجا کر ان کے بال بچوں کی خبر گیری کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے۔ سب سے زیادہ توجہ اس بات پر رہتی کہ رعایا کہ کوئی شکایت ان تک پہنچنے سے نہ رہ جائے۔ یہ معمول رکھا تھا کہ ہر نماز کے بعد صحن مسجد میں بیٹھ جاتے اور لوگوں کی شکایات سنتے۔ اگر کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے اٹھ جاتے۔ راتوں کو دورہ کیا کرتے، سفر میں راہ چلتے ہوئے لوگوں سے حالات پوچھتے باہر سے آنے والی تمام سفارتوں سے وہاں کے حالات تفصیل سے سنتے۔

علامہ شبلیؒ نے امامت اور اجتہاد کے تعلق سے حضرت عمرؓ کی مجتہدانہ حیثیت اور فقہی اور کلامی مسائل میں آپ کی بصیرت پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ دین کے مزاج اور شریعت کی روح کو سمجھنے اور نہایت جرأت اور بہادری سے لوگوں کے سامنے اس کو پیش کرنے کی جو صفت حضرت عمرؓ میں موجود تھی اس کی نظیر صحابہؓ کے زمانے میں بھی بہت کم ملتی ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم وتکریم کے ساتھ توحید حقیقی کے ساتھ کی تعلیم حضرت عمرؓ کا امتیازی وصف ہے اسی لئے آپ نے حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر علانیہ کہا تھا:

"انی اعلم انک حجر وانک لا تضر ولا تنفع"

(میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان)

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک درخت کے نیچے لوگوں سے جہاد پر بیعت لی تھی اس بنا پر درخت متبرک سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر اس کو جڑ سے کٹوادیا۔ علامہ شبلی کے نزدیک حضرت عمرؓ نے علم اسرار الدین کی بنیاد ڈالی اور احکام شریعت کے متعلق یہ اصول قائم کیا کہ شریعت کے تمام احکام مصالح عقلی پر مبنی ہیں (الفاروق، ج۲/ ۱۹۳)۔ حدیث اور فقہ کا فن بھی انہیں کا ساختہ پرداختہ ہے، بزرگ صحابہ میں کم از کم بیس محدث اور فقیہہ تھے مگر اس فن کے اصول وقواعد سب سے پہلے حضرت عمرؓ ہی نے قائم کئے۔ ان فنون میں حضرت عمرؓ کی فضیلت کو صحابہؓ تسلیم کرتے تھے۔ بلاد اسلام میں فقہہ کے جو مراکز رہے ہیں وہ ہیں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ اور شام، ان تمام مراکز کے

بانی فقہاء حضرت عمرؓ ہی کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے۔

حضرت عمرؓ اگر چہ خود ایک بہت بڑے فقیہہ تھے مگر احتیاط کے طور پر وہ اکثر مسائل کو عموماً صحابہ کی مجلس میں پیش کرتے تھے اور ان کے مشورے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرتے اور اسے نافذ کرتے تھے۔ فقہ کے جو مسائل حضرت عمرؓ سے صحیح روایتوں کے ساتھ منقول ہیں ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے، ان میں سے تقریباً ہزار مسئلے ایسے ہیں جو فقہ کے مقدم اور اہم مسائل ہیں اور ان تمام مسائل میں ائمہ اربعہ نے ان کی تقلید کی ہے مگر اس سے بڑھ کر حضرت عمرؓ نے مسائل کی تفریع واستنباط کے اصول اور ضوابط قرار دیئے جس کو آج کل اصول فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ خبر آحاد کے قابل استدلال ہونے، قیاس سے کام لینے اور استنباط احکام کے دوسرے اصولوں کو استعمال کرنے کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کے نظریات اور افکار بہت اہم ہیں۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں صحابہؓ نے آپ سے اختلاف بھی کیا مثال کے طور پر خمس کا مسئلہ ہے قرآن کہتا ہے:

"وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ" (انفال : ۴۱)

(اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں رسولؐ کے رشتہ داروں کا بھی حصہ ہے مگر حضرت عمرؓ پیغمبر کے قرابت داروں کو مطلقاً خمس کا حقدار نہیں سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے اہل بیت کو کبھی خمس میں سے حصہ نہیں دیا۔ اسی سلسلے میں باغ فدک کا معاملہ بھی رہا ہے جو مدتوں اختلافات کی آماجگاہ رہا ہے۔ ایک فرقہ کا خیال ہے کہ یہ باغ خاص آنحضرتؐ کی جائیداد تھی کیوں کہ اسے بزور فتح کرکے حاصل نہیں کیا گیا تھا اور اس وجہ سے اس آیت کے تحت داخل ہے:

"وَمَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (حشر: ٦)

(اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دے، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں، بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرمادیتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔)

اور جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خاص جائیداد ٹھہری تو آنحضرتؐ کے وارثین اس کے مستحق ہوئے لیکن حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مطالبہ اور تقاضا کے باوجود آل نبی کو اس سے محروم رکھا۔ اسی طرح متعدد ایسے مسائل ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے اختلاف کیا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ان اولیات کی ایک فہرست فراہم کی ہے جن کی ایجاد و تحقیق کا سہرا حضرت عمرؓ کے سر بندھتا ہے:

۱۔ بیت المال یعنی خزانہ قائم کیا
۲۔ عدالتیں قائم کیں، اور قاضی مقرر ہوئے۔
۳۔ تاریخ اور سنہ قائم کیا، جو آج تک جاری ہے۔
۴۔ امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔
۵۔ فوجی دفتر ترتیب دیا۔
۶۔ والینٹروں کی تنخواہیں مقرر کیں۔
۷۔ دفتر مال قائم کیا۔
۸۔ پیمائش جاری کی۔
۹۔ مردم شماری کرائی۔
۱۰۔ نہریں کھدوائیں۔
۱۱۔ شہر آباد کرائے۔
۱۲۔ ممالک مقبوضہ کو صوبوں میں تقسیم کیا۔
۱۳۔ عشور مقرر کئے۔

۱۴۔ دریا کی پیداوار مثلاً عنبر وغیرہ پر محصول لگایا، اور محصّل مقرر کئے۔

۱۵۔ حربی تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی۔

۱۶۔ جیل خانہ قائم کیا۔

۱۷۔ دُرّہ کا استعمال کیا۔

۱۸۔ راتوں کو گشت کر کے رعایا کے دریافت حال کا طریقہ نکالا۔

۱۹۔ پولس کا محکمہ قائم کیا۔

۲۰۔ جا بجا فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔

۲۱۔ گھوڑوں کی نسل میں اصیل اور مجنبس کی تمیز قائم کی، جو اس وقت عرب میں نہ تھی۔

۲۲۔ پرچہ نویس مقرر کئے۔

۲۳۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے آرام کے لئے مکانات بنوائے۔

۲۴۔ راہ پر پڑے ہوئے بچوں کی پرورش اور پرداخت کے لئے روزینے مقرر کئے۔

۲۵۔ مختلف شہروں میں مہمان خانے تعمیر کرائے۔

۲۶۔ یہ قاعدہ قرار دیا کہ اہل عرب (گو کافر ہوں) غلام نہیں بنائے جا سکتے۔

۲۷۔ مفلوک الحال عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کئے۔

۲۸۔ مکاتب قائم کئے۔

۲۹۔ معلموں اور مدرسوں کے مشاہرے قائم کئے۔

۳۰۔ حضرت ابوبکرؓ کو اصرار کے ساتھ قرآن مجید کی ترتیب پر آمادہ کیا، اور اپنے اہتمام سے اس کام کو پورا کیا۔

۳۱۔ قیاس کا اصول پورا کیا۔

۳۲۔ فرائض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا۔

۳۳۔ فجر کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کا اضافہ کیا، چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں اس کی تفصیل مذکور ہے۔

۳۴۔ نماز تراویح کی جماعت قائم کی۔

۳۵۔ تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی جائیں، طلاق بائن قرار دیا۔

۳۶۔ شراب کی حد کے لئے اسّی کوڑے مقرر کئے۔

۳۷۔ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔

۳۸۔ بنوتغلب کے عیسائیوں پر بجائے جزیہ کے زکوٰۃ مقرر کی۔

۳۹۔ وقف کا طریقہ ایجاد کیا۔

۴۰۔ نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر تمام لوگوں کا اجماع قرار دیا۔

۴۱۔ مساجد میں وعظ کا طریقہ قائم کیا، ان کی اجازت سے تمیم داری نے وعظ کہا، اور یہ اسلام میں پہلا وعظ تھا۔

۴۲۔ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

۴۳۔ مساجد میں راتوں کو روشنی کا انتظام کیا۔

۴۴۔ ہجو کرنے پر تعزیر کی سزا قائم کی۔

۴۵۔ غزلیہ اشعار میں عورتوں کے نام لینے سے منع کیا، حالانکہ یہ طریقہ عرب میں مدّتوں سے جاری تھا۔ (الفاروق جلد ۲، ص: ۲۷۷۔۲۸۰)

علامہ شبلی نعمانیؒ حضرت عمر فاروقؓ کو ایک جامع کمالات شخصیت ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں:

لیس من اللہ بمستنکر　　　ان یجمع العالم فی واحدٍ

خدا کی قدرت سے یہ کیا بعید ہے کہ تمام عالم ایک فرد میں سما جائے۔

فاضل مصنف کتاب کے آخر میں حضرت عمرؓ کی شخصیت کی جامعیت پر بڑے دل نشین اور مؤثر اسلوب میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہو؟ جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں، کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے ہاں پانی بھر آتا ہو، فرشِ خاک پر پڑ رہتا ہو، بازاروں میں پڑا پھرتا ہو، جہاں جاتا ہو جریدہ وتنہا چلا

جا تا ہو، اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو، دررودربار۔ نقیب وچاوش، حشم وخدم کے نام سے آشنا نہ ہو، اور پھر یہ رعب داب ہو کہ عرب وعجم اس کے نام سے لرزتے ہوں، اور جس طرف رخ کرتا ہو، زمین دہل جاتی ہو، سکندر وتیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے، جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا، عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا، لیکن چاروں طرف غُل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے''۔

☆☆☆

اسلامی ریاست "الفاروق" کی روشنی میں

مولانا نظام الدین اصلاحی

کتاب الفاروق علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات میں ایک اہم ترین تصنیف کی حیثیت سے جانی جاتی ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ موصوف نے اپنی تصنیف المالون کے دیباچے میں اپنا یہ عندیہ ذکر فرمادیا کہ میں حضرت عمر فاروق کی سیرت پر الفاروق نامی کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوں جب المالون چھپ کر قدر دانوں کے ہاتھ میں پہنچی اور انہوں نے الفاروق نامی کتاب کا ذکر دیباچے میں پڑھا تو پورے ملک میں لوگوں کے اندر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے اس کے لئے مطالبے شروع ہوگئے علامہ نے اس پر کچھ کام کرنے کے بعد جب اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس تصنیف کا کام ملتوی کردیا تو مطالبات اور اصرار اس شدید پیمانے پر ہوا کہ تمام دوسرے علمی کاموں کو مؤخر کرکے اپنی پوری توجہ اس کتاب کی ترتیب وتدوین پر صرف کرنی پڑی۔

حضرت عمر کی زندگی گوناں گوں اسباب کی وجہ سے بڑی ہی پر کشش اور انقلابی زندگی رہی ہے اور آپ کی خدمات تاریخ میں محفوظ ہیں اس کے احسان سے ملت اسلامیہ اور اہل سیاست دونوں ہی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔

زمانہ تصنیف

جس دور میں اس تصنیف کی طرف علامہ موصوف نے توجہ فرمائی یہ وہی پُر آشوب دور تھا جب ۱۸۵۷ء کے ناکام خونی انقلاب سے ملت اسلامیہ کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور برطانوی حکومت پورے زور وشور کے ساتھ اس ملک پر اپنے پنجے گاڑ چکی تھی یہی وہ زمانہ تھا جب مغرب میں اسلام اور خصوصیت سے حضرت عمر کے خلاف گندے اور سطحی قسم کے اعتراضات کئے جارہے تھے اور ہر طرف سے اسلام اور اسلامی اہم شخصیات کے خلاف پروپیگنڈے کئے جارہے تھے حضرت عمرؓ کے خلاف تو یہ جھوٹا الزام پوری دنیا میں پھیلا دیا گیا تھا کہ انہوں نے

اسکندریہ کا کتب خانہ یہ کہہ کر جلا دینے کا حکم دیا کہ قرآن مجید کے آجانے کے بعد اب کسی کتاب کی ضرورت نہیں رہ گئی لہذا پورا کتب خانہ خاکستر میں تبدیل کردیا گیا اسی طرح حضرت عمر کا متشدد ہونا حقوق نسواں کا مخالف ہونا آزادی فکر ونظر کو کچل دینے والا اور اسی طرح کے بہت سے ناز یبا اتہامات سے نوازا جارہا تھا چنانچہ جب علامہ شبلی مرحوم نے کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کے واقعہ کو علمی وتاریخی دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کردیا تو پورے ہندوستان میں ملت اسلامیہ مرحوم کی تحقیق پر سراپا شکر وامتنان بن گئی موصوف کا یہ تحقیقی کارنامہ مقالات شبلی حصہ ششم میں دیکھا جاسکتا ہے، الفاروق کے اندر علامہ شبلی مرحوم نے چونکہ کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ پر قلم نہیں اٹھایا تھا اس لئے اس کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے بلکہ الفاروق کے منظر عام پر آجانے کے بعد یہ ضرورت پیش آئی کہ کتب خانہ کے جلائے جانے کے الزام پر متوجہ ہوتے اور اس کی حقیقت واضح فرماتے چنانچہ موصوف نے ادھر توجہ کی اور اسے دلائل کی روشنی میں اس کی غلطی واضح کردی اور اب اس تحقیق کو مغرب نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔

اسلامی ریاست کے خدوخال الفاروق کی روشنی میں نہایت صاف ستھرے اور واضح انداز میں دیکھے اور سمجھے جاسکتے ہیں۔

سیاسی نظام پر گفتگو کرتے وقت سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوری ہے یا شخصی کیونکہ آج کی دنیا جمہوریت کی بڑی دلدادہ ہے اور شخصی حکومت کو تحقیر کی نظر سے دیکھتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری حکومت کے خدوخال پہلی مرتبہ اس دنیا میں اسلام نے ہی واضح کئے ہیں، اسلام کے آنے سے پہلے پوری دنیائے انسانیت اس نظام جمہوریت سے واقف نہیں تھی البتہ اسلام نے اس کو نظام شورائی کا نام دیا ہے اور یہ لفظ قرآن مجید کی سورہ شوری کے اس لفظ سے لیا گیا ہے امرھم شوری بینھم[۱] مسلمانوں کے سارے امور ومعاملات شوری کے ذریعہ طے ہوتے ہیں اسی طرح نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

۱۔ سورہ شوری، آیت ۳۸

شاورهم فی الأمر فاذا علمت فتوکل علی الله[1]

علامہ شبلی نے الفاروق میں مناسب انداز سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ جمہوریت کی بنیاد کو مضبوط کرنے والے حضرت عمر تھے ساتھ ہی یہ ثابت کیا کہ اسلام میں شخصی حکومت ناپسندیدہ ہے جس کی حدیث میں ملک عضوضا کہہ کر مذمت کی گئی ہے کاروبار سلطنت میں عوام الناس کا عمل دخل جس قدر زیادہ ہوگا وہ اسی قدر اس کی جمہوری بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں یہاں تک کہ وہ جماعت کا ایک عام کارکن رہ جاتا ہے یہی بات شخصی حکومت میں نہیں ہوتی ہے شخصی حکومت میں پوری سلطنت کے کاروبار سیاسی صرف ایک ذات پر منحصر ہوتے ہیں اور وہ ہے حاکم وقت اس لئے شخصی حکومت میں اس طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ ملک کے تمام باصلاحیت افراد کی صلاحیتیں کام میں نہیں آتیں بلکہ چند ارکان واعیان سلطنت کی صلاحیتیں ہی کارآمد بنتی ہیں۔

۲۔ چونکہ تمام باصلاحیت افراد کی صلاحیتیں استعمال نہیں ہو پاتیں اس لئے ان کی صلاحیتوں میں زنگ لگ جاتا ہے اور تمام صلاحتیں بارآور ہونے کے بجائے مرجھا جاتی ہیں۔

۳۔ تمام فرقوں، قوموں کے حقوق کما حقہ محفوظ نہیں رہ پاتے اسلئے کہ جن کے حقوق کی حفاظت کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ وہ امور سلطنت کی انجام دہی سے دور رہتے ہیں۔

۴۔ جب ذمہ داران حکومت کے سوا کوئی دوسرا شخص حکومتی معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہوتا۔ اسلئے پوری قوم کے اندر ذاتی اغراض ومفادات کا حصول ہی مقصد بن جاتا ہے اور قومی وملکی ارتقاء سے لوگوں کی نظریں ہٹ جاتی ہیں۔

حضرت عمر کے زمانے میں کہیں جمہوری حکومت کی مثال موجود نہیں تھی پڑوسی سلطنتیں جمہوری نہ تھیں ایران میں شخصی حکومت تھی روم میں کبھی جمہوری حکومت تھی لیکن حضرت عمر سے بہت پہلے وہاں بھی شخصی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لئے بجا طور سے یہ کہا جائے گا، کہ

۱۔ سورہ، آل عمران: آیت: ۱۵۹

حضرت عمر نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے ایک اسلامی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی حکومت بھی شورائی تھی مگر یہ آپ کا دور حکومت اتنا مختصر ہے کہ آپ اس سلسلے میں کچھ زیادہ کام کرنے کا موقع ہی نہ پا سکے۔

حضرت عمر کا شورائی نظام

سب سے بڑا کام جو حضرت عمر نے انجام دیا وہ شوری کا انعقاد ہے یہ اس زمانہ کی پارلیمنٹ کہی جا سکتی ہے حکومت کے اہم معاملات اسی مجلس کے ذریعہ طے پاتے تھے پوری ملت کے اندر گویا دو گروہ تھے جن کے مقام و مرتبہ کو گویا اس وقت کے سب ہی لوگوں نے تسلیم کر لیا تھا ایک مہاجرین کا گروہ اور دوسرا انصار کا گروہ مجلس شوری جب تشکیل پاتی تھی ان دونوں گروہوں کے قابل ذکر افراد اس میں لئے جاتے تھے خود انصار بھی دو قبیلوں پر مشتمل تھے قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج چنانچہ ان دونوں شاخوں کے افراد انصار کے نمائندہ بنتے تھے اور شوری میں شامل کئے جاتے تھے ان میں سے چند نمایاں اسمائے گرامی یہ تھے حضرت علی، عبد الرحمان بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت مجلس شوری کا اجلاس بلانے کا بھی ان کے یہاں ایک طریقہ تھا جو معروف و متداول تھا ایک منادی الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر لوگوں میں اعلان کرتا کہ سب لوگ مسجد میں نماز کے لئے جمع ہو جائیں پہلے حضرت عمر دو رکعت نفل ادا کرتے اور پھر منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے اور بحث طلب امور (ایجنڈا) کو واضح فرماتے اور بحث طلب امور پیش کئے جاتے [۱]

لیکن جب کوئی اہم معاملہ پیش ہوتا تھا تو اس میں مہاجرین و انصار کا اجلاس عام طلب کیا جاتا تھا اور اس پر کھل کر بحث ہوتی تھی مثلاً جب شام و عراق کا ملک فتح ہوا اور صحابہ نے اصرار کیا کہ یہ تمام مفتوحہ زمینیں فوج کی جاگیر بنا دی جائیں کیونکہ یہ مال غنیمت ہیں اور مال غنیمت فوج کا حق ہوتا ہے تو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تمام قدمائے مہاجرین و انصار کے علاوہ دس بڑے بڑے سردار تمام لوگوں میں امتیازی مقام رکھتے تھے اور جن میں سے پانچ قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے تھے کئی دن تک اجلاس چلا اور تمام لوگوں نے نہایت بے

۱۔ الفاروق، ج: ۲ ص: ۱۴۰

باکی اور آزادی کے ساتھ اظہار خیال کیا۔

اس موقع پر حضرت عمر نے جو تقریر کی وہ جمہوریت اور شورائیت کے سلسلے کی شاہکار تقریر ہے

انی لم ازعجکم الا لان تشرکوا
فی امانتی فیما حملت من امورکم
فانی واحد کاحدکم ولست ارید
ان تتبعوا اھذا الذی ھوای[۱]

میں نے آپ لوگوں کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ لوگ میری اس امانت کے معاملات میں میرے ساتھ شریک ہوں جو خلافت کے امور کو میں نے اٹھا رکھا ہے کیونکہ میں بھی آپ کی طرح کا ایک فرد ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کے پیچھے چلیں،

حضرت عمرؓ نے صاف طور سے لوگوں کے سامنے اس بات کا اعلان کیا کہ امور سلطنت میں تمام مسلمان شریک ہوں خلیفہ دوسرے لوگوں سے اپنی ذاتی حیثیت میں برتر نہیں ہے اسی جذبۂ شورائیت کو قرآن وحدیث کے ذریعہ پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی جذبہ امیر المومنین بھی لوگوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں کیا اس سے بڑھ کر جمہوریت کی مثال کوئی اور دی جاسکتی ہے اسی طرح نہاوند کی جنگ کا جب سخت معرکہ پیش آیا اور عجمیوں نے بے مثال فوجی تیاری کے ساتھ حملہ کرنے کی اسکیم بنائی تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ لوگوں نے اس جنگ میں خلیفہ وقت حضرت عمر کی شرکت کو ضروری قرار دیا اس موقع پر بہت بڑی مجلس شوری منعقد ہوئی جس میں اس اہم مسئلہ کو اس میں پیش کیا گیا اور ایجنڈے کا جزو یہ قرار پایا کہ کیا امیر المومنین اس جنگ میں بنفس نفیس شریک ہوں حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت عبد الرحمان نے جو تقریریں اس موقع پر کی ہیں اسے تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے۔

پہلی تقریر حضرت عمر نے منبر سے ارشاد فرمائی اس میں ایجنڈا رکھا اور لوگوں سے مشورہ طلب فرمایا سوال یہ کیا کہ میں اس جنگ میں شرکت کروں۔

۱۔ الفاروق، ج:۲ص:۱۵

حضرت عثمان نے اس اجلاس شوری میں حسب ذیل تقریر فرمائی:

تسیر انت باھل ھذین الحرمین الی المصرین البصرۃ والکوفۃ مبلقی جمیع المشرکین بجمع المسلمین فانک اذا سرت بمن ملک و عندک قل فی نفسک ما قد تکاثر من عدد القوم وکنت اعز عزا واکثرھا امیر المومنین فاشھدہ یراک واعوانک ولا تفت عنه. [۱]

دوسرے ارکان مجلس نے بھی تقریریں کیں آخر میں حضرت علی نے تقریر کی جو یہ ہے:

> **ان الاعاجم ان ینظروا الیک غدا قالوا ھذا امیر المومنین واھل العرب فکان ذلک اشد تکلیم والبھم علی نفسک ویقولن ھذا اھل العرب فاذا اقتطعتموہ اقتطعتم اھل العرب.** [۲]

چنانچہ حضرت علی کی رائے سب پر بھاری پڑی اور طے ہوا کہ امیر المومنین کا جنگ میں بنفس نفیس شریک خلاف مصلحت ہے لہذا حضرت عمر نے اس میں شرکت نہیں کی البتہ بڑی تیاری اور اعلی حکمت عملی کے ساتھ اس جنگ کی رہنمائی آپ نے کی اور فتح حاصل ہوئی۔

☆☆☆

۱۔ جمرۃ خطب العرب، خطب عمر بن الخطاب خطبہ ۱۰۸ص: ۲۳۵

۲۔ حوالہ مذکور

حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ اور "الفاروق"

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

اسلامی سیاست اور شوریٰ

اسلام کا نظام حکومت شورائی اور جمہوری ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل، قوت واقتدار کی جولا نگاہ میں الوہی نصب العین کا قیام و دوام امت مسلمہ کی بھر پور شرکت وشراکت، اہل حل وعقد کی مشاورت اور اربابِ علم وتفقہ کے اجتہاد وبصیرت کی عملی تنفیذ پر منحصر ہے شوریٰ اسلامی حکومت کا خاصۂ لازمہ اور امانت کبریٰ کے عہدہ کے لئے ایک ناگزیر وصف ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوسکتا۔ "اس حکومت کی صحیح تعبیر کیلئے یہ کہنا قطعاً درست ہوگا کہ شوریٰ حکومت کی جان ہے بلکہ شوریٰ ہی حکومت ہے"[1]

قرآن کریم نے رسول اکرم ﷺ کو ہدایت کی کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آلِ عمران: ۱۵۹)

(اور ان کو شریک مشورہ رکھو پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو)

اس آیت کی شان نزول بڑی اہم ہے جنگ احد میں اللہ کے رسول ﷺ نے تمام صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا کہ مدینہ میں محصور ہو کر دفاع کیا جائے یا شہر سے باہر نکل کر اقدامی پوزیشن اختیار کی جائے۔ آپ کی ذاتی رائے قلعہ بند ہو کر جنگ لڑنے کی تھی مگر صحابہ کی اکثریت نے باہر نکل کر حملہ کرنے پر زور دیا تو آپ نے اکثریت کی رائے کے احترام میں مدینہ سے باہر نکل کر مشرکین کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی جس کی ایک بڑی وجہ حکم رسول کی خلاف ورزی تھی مگر اکثریت کی رائے کو نافذ کرنے کے جو نتائج نکلے ان کی شناعت کے باوجود اللہ کے نبی کو اپنے صحابہ کو شریک مشورہ رکھنے کی تاکید ہوئی۔[2]

ایک دوسری آیت میں صحابہ کرام کی نمایاں صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ اپنے معاملات

باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں:

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (الشوریٰ:۳۸)

(جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے یہاں ایک اہم سوال قائم کیا ہے کہ قرآن کا معروف اسلوب تو یہ ہے کہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے مگر اس کے برعکس اس آیت میں نماز اور انفاق کے بیچ میں شوریٰ کا تذکرہ ہوا ہے اس میں کیا حکمت کارفرما ہے؟ مولانا اصلاحی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نظم اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصل شکل نماز میں محفوظ کردی گئی ہے ''اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کیلئے ایک بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم وتقویٰ والے کو اپنی امامت کے لئے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدود الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہے، اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور اس کے رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اسکو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام قعود، یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگذاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابق شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں''۔ [۳۲]

شوریٰ کی اسی قانونی اہمیت کے پیش نظر چھٹی صدی کے مستند عالم امام ابن

عطیہ (۴۸۱ھ-۵۴۶ھ) نے زور دے کر کہا کہ إن الشوریٰ هی من قواعد الشریعة وعزائم الأحکام (شوریٰ شریعت کے قوانین میں سے ایک اساسی قانون اور پختہ احکام کی بنیاد ہے)۔[۴]

شوریٰ قانون ہی نہیں ایک زبردست حکمت عملی بھی ہے۔اگر اسلام کا نظام حکومت امام کے اختیار مطلق پر مبنی ہوتا تو نہ شوریٰ کا حکم آتا اور نہ پیغمبر اسلام اور خلفاء کرام اس پر عمل کرتے۔ حضور اکرم ﷺ کے قول وفعل سے ثابت ہوتا ہے کہ شوریٰ قانون بھی ہے اور حکمت عملی بھی جب شوریٰ کا حکم آیا تو حضرت ابن عباسؓ کے بیان کے مطابق حضور اکرمؐ نے فرمایا۔

> ''اگر چہ اللہ اور اس کا رسول شوریٰ سے بے نیاز ہیں مگر شوریٰ کا حکم اس لئے ہے کہ امت کے لئے رحمت ہو۔اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا کبھی اعلیٰ درجہ کی رہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کردے گا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا''۔[۵]

فاروقی نظام سیاست کی ماہیت:

شوریٰ کی اسی اہمیت کے پیش نظر علامہ شبلی نعمانی حضرت عمر بن الخطابؓ کے قائم کردہ نظام حکومت کے متعلق سب سے پہلے یہی مسئلہ اٹھاتے ہیں کہ اس حکومت کی ساخت کیا تھی یعنی شخصی تھی یا جمہوری؟''گر چہ اس وقت عرب کا تمدن جس حد تک پہنچا تھا اس کے لحاظ سے حضرت عمرؓ کی خلافت پر جمہوری یا شخصی دونوں میں سے کسی ایک کا بھی اطلاق نہیں ہوسکتا، لیکن ایسے موقع پر صرف اس بات کا پتہ لگانا کافی ہے کہ حکومت کا جو انداز تھا وہ جمہوریت سے ملتا تھا یا شخصیت سے یعنی سلطنت کا میلان ذاتی اختیارات پر تھا یا عام رائے پر''۔[۶]

اس تحریر سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی نگاہ میں فاروقی نظام حکومت اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ اسے باقاعدہ جمہوری کہا جاسکے اور یہ کہ اس کی وجہ فاروقی نظام حکومت میں کسی کمی یا نقص کی موجودگی نہ تھی مگر خود تمدن عرب ارتقاء کے اس مرحلہ پر نہ پہنچ سکا تھا کہ

کوئی با قاعدہ جمہوریت تشکیل پا سکے۔ گویا شبلی موجودہ جمہوریت کو انتہائی ترقی یافتہ اور تمدن کا نقطۂ عروج قرار دے کر اس سے حضرت عمرؓ کی حکومت کا تقابل کرتے ہیں۔ یہاں اسلامی سیاسیات کے طالبعلم کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

۱۔ کیا جمہوریت واقعی تمدنی و اجتماعی ترقی کی تکمیل ہے؟ یا علامہ اقبال کے بقول اس کا چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ہے اور یہ دوسرا روپ زیادہ قریب حقیقت ہے کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
ہے وہی ساز کہن مغربی کا جمہوری نظام　　جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

۲۔ کیا جمہوریت اسلامی شورائی ہی کی شکل ہے یا دونوں میں بُعد المشر قین ہے؟

۳۔ کیا دونوں کا نظریۂ حیات و کائنات، فلسفۂ مادیت اور ماوراء مادیت اور جہانی و آفاقی فلسفہ یکساں ہے؟ کیا دونوں کے نزدیک انسان کا خدا سے تعلق، انسان کا دوسرے انسانوں سے تعلق اور اس کائنات سے تعلق ایک ہی ماہیت، نوعیت اور پسِ منظر رکھتا ہے؟[۷]

اسلامی سیاسیات کا طالب علم یہاں اس لئے بھی حیران و ششدر ہوتا ہے کہ مغربی اصطلاحِ جمہوریت ایک بالکل الگ نظامِ سیاست و تمدن کی ترجمان کرتی ہے جو اپنے ساتھ مغربی تصورات اور اپنے پیچھے مغرب کی تاریخ کا ایک پورا سلسلہ قاری کے ذہن میں لے آتی ہے[۸]

جمہوری اور شخصی سلطنت کا موازنہ:

علامہ شبلی نے حضرت عمرؓ کے طریق حکومت کی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے جمہوری اور شخصی حکومتوں کے درمیان موازنہ کیا ہے۔ آپ کے نزدیک ان دونوں سلطنتوں میں مابہ الامتیاز وصف عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا زیادہ حق حاصل ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا یہاں تک کہ

سلطنت جمہوری کی اخیر حد یہ ہے کہ مسند نشین حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائیں اور وہ جماعت کا رکن کا صرف ایک ممبر رہ جائے برخلاف اس کے شخصی سلطنت میں تمام دار ومدار صرف ایک شخص پر ہوتا ہے اس بنا پر شخصی سلطنت سے خواہ مخواہ نتائج ذیل پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ بجائے اس کے کہ ملک کے تمام قابل اشخاص کی قابلیتیں کام آئیں، صرف چند ارکان سلطنت کی عقل وتدبیر پر کام چلتا ہے۔

۲۔ چونکہ بجز چند عہدیداروں کے اور لوگوں کو ملکی انتظامات سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، اس لئے قوم کے اکثر افراد سے انتظامی قوت اور قابلیت رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگتی ہے۔

۳۔ مختلف فرقوں کے اور جماعتوں کے خاص خاص حقوق کی اچھی طرح حفاظت نہیں ہوتی کیونکہ جن لوگوں کو ان حقوق سے غرض ہے ان کو انتظام سلطنت میں دخل نہیں ہوتا اور جن لوگوں کو دخل ہوتا ہے ان کو غیروں کے حقوق سے اس قدر ہمدردی نہیں ہوسکتی جتنی کہ خود ارباب حقوق کو ہوسکتی ہے۔

۴۔ چونکہ بجز ارکان سلطنت کے کوئی شخص ملکی اور قومی کاموں میں دخل دینے کا مجاز نہیں ہوتا اس لئے قوم میں ذاتی اغراض کے سوا قومی کاموں کا مذاق معدوم ہوجاتا ہے۔

فاضل مصنف کے خیال میں مندرجہ بالا نتائج شخصی سلطنت کے لوازم ہیں اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوسکتے برخلاف اسکے جمہوری سلطنت میں اس کے برعکس نتائج ہوں گے۔ اس بنا پر جس سلطنت کی نسبت جمہوری وشخصی کی بحث ہو اس کی نوعیت کا اندازہ نتائج سے بھی کیا جاسکتا ہے۔

نتائج کی بنیاد پر شخصی اور جمہوری حکومتوں کے درمیان یہ موازنہ بڑی حد تک درست ہے مگر اصل موازنہ وہ ہے جو فکری، نظریاتی اور علمی سطح پر ہوتا ہے اور یہیں سے شخصی حکومت اور جمہوری حکومت کے درمیان اصل خط فاصل قائم ہوتی ہے اس کا امکان ہے کہ شخصی حکومت

قائم ہو اور نتائج بالا سے بڑی حدتک محفوظ ہو جیسے ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ (م۱۷۰۷ء) اور سلطان فتح علی ٹیپوؒ (م۱۷۹۹ء) کی حکومتوں کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے کہ شخصی حکومت ہونے کے باوجود عوام کا عمل دخل کسی جمہوری حکومت سے کم نہ تھا۔ اسی طرح اس کا اندیشہ بھی موجود ہے کہ حکومت جمہوری ہو مگر نتائج بالا کی وہ حامل ہو بلکہ اس سے بدتر نتائج کی ذمہ دار ہو جیسے آج کل کی پارلیمانی جمہوریتوں کا حال ہے کہ حزب اقتدار کی مرضی، پسند اور ترجیحات کے اردگرد ملک کے سارے وسائل اور مفادات ومصالح منڈلاتے رہتے ہیں۔

شخصی اور جمہوری حکومتوں کے درمیان اصل فرق اقتدار کی مرکزیت اور اس کا ذمہ دارانہ احتساب ہے۔ قوت واقتدار کا مرکز ثقل کیا ہے؟ ایک فرد، چند افراد یا عوام؟ اور حکومت کس کے سامنے جوابدہ ہے یا جوابدہی اور احتساب کا تصور بالکل مفقود ہے ان دو اہم مسائل کو دیکھ کر ہی کسی حکومت کو شخصی یا جمہوری قرار دیا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی نے ''سلطنت جمہوری کی اخیر حد'' یہ قرار دی ہے کہ ''مسند نشین حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائیں اور وہ جماعت کا رکن کا صرف ایک رکن رہ جائے'' اس طرح کی کوئی سلطنت نہ ماضی میں کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ مستقبل میں اسکے قائم ہونے کا امکان ہے ہاں افلاطون کی ''الجمہوریۃ'' میں اس کا خیالی خاکہ پایا جاتا ہے یا الفارابی کی ''المدینۃ الفاضلۃ'' میں اس کا انعکاس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بےغرضی و بےلوثی اور ایثار واخلاص کے کتنے ہی مراحل طے کرلے وہ انسان ہی رہتا ہے اور اقتدار پسندی اور جاہ ومنصب کی ہوس اس کی سرشت میں داخل ہے جس سے پیچھا چھڑانا تقویٰ واحسان کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

علامہ شبلی جمہوری اور استبدادی حکومتوں کے مزاج اور خصوصیات سے بحث کرنے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ گو عرب کا فطری مذاق جمہوریت کا نہ تھا نہ گردوپیش میں قائم حکومتیں جمہوری تھیں۔ ایران تو جمہوریت سے آشنا ہی نہ ہوسکا البتہ روم کبھی اس شرف سے ممتاز تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے بہت پہلے وہاں شخصی حکومت قائم ہوچکی تھی مگر ان کے

دور میں تو وہ بالکل ایک جابرانہ خود مختار سلطنت رہ گئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی۔[9]

یہاں بھی علامہ شبلی کو بعض تحفظات لاحق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"............اور اگرچہ وقت کے اقتضاء سے اس (جمہوری حکومت) کے تمام اصول وفروع مرتب نہ ہو سکے تاہم جو چیزیں حکومت جمہوری کی روح ہیں سب وجود میں آ گئیں"۔[10]

یہاں فاضل مصنف کا یہ تبصرہ محل نظر ہے۔ جمہوری حکومت کے وہ کون سے "اصول وفروع" تھے جو مرتب نہ ہو سکے۔ طریقۂ انتخاب، نظام حکومت، عدلیہ، انتظامیہ اور قانون سازیہ کے علیحدہ اختیارات، عوام کے حقوق وفرائض کی تعین، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، قانونی حدود میں اختلاف رائے کی آزادی، قابل اشخاص اور باصلاحیت افراد کی شرکت، عوامی احتساب غرضیکہ جمہوری حکومت کے وہ کون سے اصول تھے جو حضرت عمرؓ کے دور میں مرتب ومنظم نہ ہو سکے خود فاضل ممدوح نے بڑی تفصیل سے ان تمام موضوعات سے بحث کی ہے۔ باقی رہے فروعی وتکنیکی مسائل تو ان کی تعیین کی ضرورت نہ تھی اور نہ یہ مفید اور مناسب تھی۔

فاروقی شوریٰ کی ساخت:

علامہ شبلی کے نزدیک حضرت عمرؓ کے دور میں مجلس شوریٰ کا انعقاد "جمہوریت" کا اصل الاصول تھا۔ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تھا تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آ سکتا تھا۔

فاروقی مجلس شوریٰ میں انصار ومہاجرین دونوں کے نمائندے شریک تھے۔ یہ مجلس دو ایوانی تھی۔ ایوان خاص کے اراکین میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے اسماء گرامی ملتے ہیں۔ مجلس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا تھا الصلوٰۃ جامعۃ (یعنی سب لوگ نماز کے لئے جمع ہو جائیں) جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو حضرت عمرؓ

مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا۔

مجلس شوریٰ عام کے جلسے اس وقت ہوتے تھے جب کہ کوئی عوامی مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ یہ دراصل مہاجرین وانصار کا اجلاس عام ہوتا تھا جس میں سارے شرکاء بحث میں حصہ لیتے تھے بسا اوقات ایک اجلاس میں فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا اور کئی دنوں کے مباحثے کے بعد اتفاق رائے یا کثرتِ رائے سے فیصلہ ہوتا تھا۔

علامہ شبلی نے دوایوانی شوریٰ کے علاوہ ایک اور مجلس کا تذکرہ بھی کیا ہے جس میں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ مجلس ہمیشہ مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور صرف مہاجرین صحابہ اس میں شریک ہوتے تھے یہ گویا حضرت عمرؓ کی مجلس عاملہ تھی جس میں اضلاع اور صوبوں کی روزانہ ملنے والی خبریں زیر بحث آتی تھیں اور کوئی بحث طلب امر ہوتا تو لوگوں سے استصواب کیا جاتا۔ مجوسیوں پر جزیہ مقرر کرنے کا مسئلہ اول اسی مجلس میں پیش ہوا تھا۔[11]

شوریٰ کی قانونی حیثیت:

فاروقی مجلس شوریٰ میں امیر اور مجلس شوریٰ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ شوریٰ کی قانونی حیثیت کیا تھی؟ امیر شوریٰ کے فیصلوں کو ماننے کا پابند تھا یا اسے مسترد کرنے کا مجاز تھا؟ ان نکات پر علامہ شبلی نے کوئی زیادہ صراحت اور قطعیت سے گفتگو نہیں کی ہے مگر ان کے فحوائے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ کی حیثیت اعلیٰ اختیاراتی مجلس کی تھی اور کثرت رائے سے فیصلہ کرنے کا طریقہ نافذ تھا۔ وہ کہتے ہیں:[12]

"مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کی مشورت استحسان وتبرّع کے طور پر نہ تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں، ان کے خاص الفاظ یہ ہیں:

لا خلافة إلا عن مشورة[13]

ایک دوسرے مقام پر وہ صراحت کرتے ہیں کہ جب کوئی مرحلہ درپیش ہوتا

تو ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور ''کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرتِ رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا''۔[۱۴]

شوریٰ کے فیصلوں میں ''کثرت رائے'' کے طریقہ کا نفاذ نشاندہی کرتا ہے کہ امیر اس دائرہ سے باہر نہ تھا اور کثرت رائے سے جو فیصلہ ہو جاتا تھا حضرت عمرؓ اس کی پابندی کرتے تھے۔

اختلاف کی صورت میں امیر یا خلیفہ کے پابندِ شوریٰ ہونے کا یہ موقف تاریخی حقائق سے زیادہ قریب بھی ہے اور شورائیت کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ بھی۔ علامہ شبلی کا یہ تجزیہ بڑا بصیرت افروز، چشم کشا اور مبنی بر صداقت ہے۔ مولانا حامد الانصاری غازی بھی تقریباً یہی رائے رکھتے ہیں ان کے مطابق اسلامی حکومت کا امام طاقتور ہوتا ہے۔ عام حالات میں اس کی حکم سے دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے مگر اس کا ہر فیصلہ قانون اسلام کے مطابق ہونا چاہیئے اور خاص حالات میں اسے شوریٰ کے فیصلے کو اپنا فیصلہ سمجھنا چاہیئے[۱۵] جدید مصنفین میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا اسم گرامی اسلامی سیاسی افکار کے حوالہ سے بڑا ممتاز ہے۔ مگر مولانا مودودی نے اختلاف باہم کی صورت میں امیر یا خلیفہ کو حق استرداد (Veto Power) عطا کیا ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ سوال بڑا اہم ہے کہ شوریٰ کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ محض صدر ریاست کی مشیر ہے جس کے مشوروں کو رد یا قبول کرنے کا صدر ریاست کو اختیار ہے یا صدر ریاست اس کی اکثریت یا اس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے؟ مولانا مودودی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اس کے متعلق کوئی قطعی حکم مجھے نہیں ملا۔

> ''البتہ خلافت راشدہ کے تعامل سے علماء اسلام نے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظم ریاست کا اصل ذمہ دار صدر ریاست ہے اور وہ اہل الحل والعقد سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے مگر اس بات کا پابند نہیں ہے کہ ان کی اکثریت یا ان کی متفقہ رائے پر ہی عمل کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو ویٹو کے اختیارات حاصل ہیں''۔[۱۶]

مگر مولانا مودودی جب دور جدید کے معاشرہ اور اس کے فکری و عملی زوال کا تجزیہ

کرتے ہیں تو اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ

''اس طرز کی مجلس شوریٰ میں اگر صدر ریاست اور ارکان مجلس اپنی اپنی رائے پر اڑ جائیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنی رائے واپس نہ لے تو استصواب عام (Referendam) کرالیا جائے پھر جس کی رائے کو بھی رائے عام رد کردے وہ مستعفی ہو جائے لیکن جب تک ہمارے لئے اپنے ملک میں اس روح اور اس ذہنیت اور اس طرز کی مجلس شوریٰ بنانا ممکن نہیں ہے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم انتظامیہ کو مقننہ کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند کردیں'' [۱۷]

یہاں مولانا مودودی کی فکر میں ژولیدگی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف خلافت راشدہ کا تعامل وہ امیر یا خلیفہ کو پابند شوریٰ نہ ہونے اور اسے حق استرداد حاصل ہونے کو قرار دیتے ہیں مگر دور جدید کے مسائل کی نزاکتوں پر وہ غور کرتے ہیں تو امیر یا خلیفہ یا انتظامیہ کو مقننہ یا شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند کردیتے ہیں۔ علامہ شبلی کا ذہن اس ابہام اور ژولیدگی سے پاک ہے۔ ان کے نزدیک خلافت راشدہ کا تعامل بطور خاص خلافت فاروقی کا نمونہ یہی تھا کہ کثرت رائے سے فیصلے ہوتے تھے اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا خلیفہ پابند تھا۔

علامہ شبلی نے مشاورت کے علاوہ استصواب عام کی مثالیں بھی نقل کی ہیں [۱۸] حضرت عمرؓ کے دور میں مجلس شوریٰ خاص وعام کے علاوہ عام رعایا کی رائے اور مرضی معلوم کرنے کا طریقہ بھی کبھی کبھی اختیار کیا جاتا تھا، خاص طور سے صوبوں اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کئے جاتے تھے۔ کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عمال خراج مقرر کئے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص کا انتخاب کرکے بھیجیں جو ان کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانت دار اور قابل ہو۔ چنانچہ کوفہ سے عثمان بن فرقد، بصرہ سے حجاج بن علاط اور شام سے معن بن یزید کو لوگوں نے منتخب کرکے بھیجا اور حضرت عمرؓ

نے انہی لوگوں کو ان مقامات کا حاکم مقرر کیا۔[19]

حضرت عمرؓ کے شورائی مزاج کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ مرض الموت میں اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا۔ صحابہ کرام آپ سے بار بار درخواست کرتے تھے کہ اس مہم کو طے کر جایئے۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے معاملہ پر مدتوں غور کیا تھا اور اکثر اس کو سوچا کرتے تھے۔ بار بار لوگوں نے ان کو اس حالت میں دیکھا کہ سب سے الگ متفکر بیٹھے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔ دریافت کیا، معلوم ہوا کہ خلافت کے بارے میں غلطاں پیچاں ہیں طویل غور وفکر کے بعد آپ نے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس میں حضرات علیؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ شامل تھے۔ اس کمیٹی پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ افہام وتفہیم کے بعد اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ یہ امت کے چیدہ افراد تھے جن کا علم وتقویٰ اور شرف وکمال مسلّم تھا اور جن کے جنّتی ہونے کی بشارت زبان رسالت مآبؐ سے اسی دنیا میں دی جا چکی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کمیٹی کو حکم دیا کہ وہ بعض دیگر اکابر امت مثلاً عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسنؓ کو بھی شریک مشورہ کرلے لیکن ساتھ ہی یہ صراحت بھی کردی کہ ان حضرات کی حیثیت محض مشیروں کی ہے اور خلافت کا بار مذکورہ بالا چھ افراد ہی میں سے کوئی سنبھالے گا کیونکہ خلافت کا ان افراد سے ہٹ جانا امت کے انتشار کا سبب بن سکتا ہے۔ مہاجرین پر مشتمل اس کمیٹی کے تعین کے بعد حضرت ابو طلحہؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم انصار کے پچاس منتخب اشخاص کے ذریعہ اس کمیٹی کو مجبور کردیں کہ وہ تین دن کے اندر اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرلے۔[20]

مجلس شوریٰ کے اجلاس

علامہ شبلی نعمانی نے فاروقی شوریٰ کے جن اجلاسوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں شام ومصر وعراق میں پھیلی وبائے عمواس کے بارے میں ہے۔ وبا کا آغاز ۱۷ھ کے اخیر میں ہوا اور کئی مہینے تک نہایت شدّت رہی حضرت عمرؓ کو جب اول خبر پہنچی تو اسکی تدبیر اور انتظام کیلئے خود روانہ ہوئے۔ سُرغ پہونچ کر ابو عبیدہؓ وغیرہ سے جو ان کے استقبال کو آئے تھے، معلوم ہوا کہ بیماری کی شدّت بڑھتی جارہی ہے۔ چنانچہ آپ نے مہاجرین اولین

اور انصار کو بلایا اور مشورہ طلب کیا۔ مختلف لوگوں نے مختلف رائیں دیں لیکن مہاجرین فتح نے ایک زبان ہو کر کہا کہ آپ کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ پکار دیں کہ کل کوچ ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ چونکہ تقدیر کے مسئلہ پر نہایت سختی سے اعتقاد رکھتے تھے ان کو نہایت غصہ آیا اور طیش میں آکر کہا۔

أفراراً من قدر الله ؟ (یعنی اے عمرؓ، تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟

حضرت عمرؓ نے ان کی سخت کلامی کو گوارا کیا اور کہا:

نعم أفرّ من قضاء الله إلى قضاء الله (یعنی ہاں میں تقدیر الٰہی سے بھاگتا ہوں مگر بھاگتا بھی تقدیر الٰہی کی طرف ہوں[۲۱]

مجلس شوریٰ کا ایک اہم اجلاس ۲۱ھ میں معرکہ نہاوند کے بارے میں منعقد ہوا جب یزدگرد کی تخت نشینی کے دور میں مروان شاہ نے ڈیڑھ لاکھ کی فوج کے ساتھ درفش کادیانی لہراتے ہوئے پیش قدمی کی۔ گورنر کوفہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ کو ان حالات کی اطلاع دی۔ آپ نے مسجد نبوی میں مجلس شوریٰ عام کا بڑا اجلاس منعقد کیا اور خط کا مضمون سنا کر فرمایا: اس مرتبہ تمام ایران کمربستہ ہو کر چلا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا سے مٹا دے، تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟

طلحہ بن عبید اللہؓ نے اٹھ کر کہا، امیر المومنین! واقعات نے آپ کو تجربہ کار بنا دیا ہے۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ جو حکم آپ دیں بجالائیں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میری رائے ہے کہ شام، یمن، بصرہ کے افسروں کو لکھا جائے کہ اپنی اپنی فوجیں لیکر عراق کو روانہ ہوں اور آپ خود اہل حرم کو لیکر مدینہ سے اٹھیں، کوفہ میں تمام فوجیں آپ کے نیچے جمع ہوں اور پھر نہاوند کی طرف رخ کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ کی اس رائے کو سب نے پسند کیا لیکن حضرت علیؓ چپ تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بولے کہ شام اور بصرہ سے فوجیں ہٹیں تو ان مقامات پر سرحد کے دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا اور آپ نے مدینہ چھوڑا تو عرب میں ہر طرف قیامت برپا ہو جائے گی اور خود اپنے ملک کا تھامنا مشکل ہوگا۔ میری رائے ہے کہ آپ یہاں سے نہ ہلیں اور شام، یمن، بصرہ وغیرہ میں فرمان بھیج دیئے جائیں کہ

جہاں جہاں جس قدر فوجیں ہیں ایک ایک ثلث ادھر روانہ کر دی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا، میری بھی یہی رائے تھی لیکن میں تنہا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔[۲۲] مولانا عبدالرحمٰن کیلانی[۲۳] نے واقعہ کی جو تفصیل رقم کی ہے اس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا مشورہ بھی شامل ہے۔ اس روایت کے مطابق جب کثرت رائے خلیفہ کی قیادت کے حق میں سامنے آئی تو آپ نے فرمایا کہ میں اس رائے کو ناپسند کرتا ہوں خلیفۂ وقت کا خود مدینہ منورہ سے تشریف لے جانا خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ اگر کسی سردار کو جنگ میں ہزیمت حاصل ہو تو خلیفہ بآسانی اس کا تدارک کر سکتے ہیں لیکن خدانخواستہ خود خلیفۂ وقت کو میدان جنگ میں کوئی چشم زخم پہنچے تو پھر مسلمانوں کے کام کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا۔[۲۴]

شوریٰ کے اس اجلاس کی کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ کی رائے یہی تھی کہ خلیفہ مدینہ میں رہ کر فوج کی قیادت کرے مگر مجلس شوریٰ میں بحث و مباحثہ کے بعد ہی یہ فیصلہ نافذ کیا۔ اکابر صحابہ حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی رائے سامنے آئی اور حضرت عمرؓ نے اس سے اتفاق کا اعلان کیا تو تمام صحابہ کرام کو اس پر اطمینان ہو گیا۔

فاروقی مجلس شوریٰ عام کا ایک تاریخی اجلاس وہ ہے جو ۱۶ھ میں عراق عرب میں خراج کے نظم و نسق کے متعلق منعقد ہوا علامہ شبلی نے اس اجلاس کی قدرے تفصیل مہیا کی ہے۔ امرائے فوج کا اصرار تھا کہ تمام مفتوحہ مقامات صلۂ فتح کے طور پر ان کی جاگیر میں عنایت کئے جائیں اور وہاں کے باشندوں کو ان کی غلامی میں دے دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی فتح کے ساتھ سعد بن وقاصؓ کو وہاں کی مردم شماری کے لئے حکم دیا تھا۔ سعدؓ نے نہایت جانچ کے ساتھ مردم شماری کا کاغذ مرتب کر کے بھیجا۔ کل باشندوں اور اہل فوج کی تعداد کا موازنہ کیا گیا تو ایک ایک مسلمان کے حصہ میں تین تین آدمی پڑتے تھے۔ اسی وقت حضرت عمرؓ کی رائے قائم ہو چکی تھی کہ زمین باشندوں کے قبضہ میں رہنے دی جائے اور ان کو ہر طرح آزاد چھوڑ دیا جائے لیکن اکابر صحابہ میں سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ اہل فوج کے ہم زبان تھے حضرت بلالؓ نے اس قدر کد کی کہ حضرت عمرؓ نے دق ہو کر فرمایا:

اللهم اکفنی بلالاً (اے خدا، مجھ کو بلال سے نجات دے!)

حضرت عمرؓ یہ استدلال پیش کرتے تھے کہ اگر ممالک مفتوحہ فوج کو تقسیم کر دیئے جائیں تو آئندہ افواج کی تیاری، بیرونی حملوں کی حفاظت، ملک کے امن وامان قائم رکھنے کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟

حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کہتے تھے کہ جن کی تلواروں نے ملک کو فتح کیا ہے، انہی کو قبضے کا بھی حق ہے۔ آئندہ نسلیں مفت کیونکر پا سکتی ہیں؟[۲۵]

فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ:

''چونکہ حضرت عمرؓ کی حکومت کا طریقہ جمہوری تھا، یعنی جو فیصلہ ہوتا تھا کثرتِ رائے پر ہوتا تھا''

اسلئے ایک عام اجلاس ہوا جس میں تمام قدماء مہاجرین اور انصار میں سے پانچ قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے سردار وکیل کے طور پر شریک ہوئے۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا تاہم کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ کئی دن تک یہ مرحلہ رہا۔ حضرت عمرؓ کو دفعۃً قرآن مجید کی ایک آیت یاد آئی جو اس بحث کے لئے نصِ قاطع تھی یعنی "لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَۚ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلاَ يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَۚ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ (اَلْحَشْر: ۸-۱۰)

(یہ مال ان غریب مہاجرین کیلئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اسکی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں۔

(اور وہ ان لوگوں کیلئے بھی ہے (جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دار الہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں

کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اور وہ ان لوگوں کے لئے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں)

یہاں **والذین جاءوا من بعدهم** سے حضرت عمرؓ نے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے لیکن اگر فاتحین کو تقسیم کردیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر نہایت پرزور تقریر کی۔ علامہ شبلی نے یہ تقریر یہاں نقل نہیں کی ہے مگر احادیث کی کتابوں میں وہ تقریر موجود ہے:

عن مالک بن أوس قال قرأ عمر بن الخطاب إنما الصدقات للفقراء والمساكين حتى بلغ عليم حكيم۔

ثم قرأ واعلموا أنما غنمتم من شئی فإن لِلله خمسه وللرسول حتى بلغ وابن السبيل ثم قال هذه لهؤلاء.

ثم قرأ ما أفاء الله على رسوله من أهل القرىٰ حتى بلغ للفقراء .... والذين جاءوا من بعد هم

ثم قال هذه استوعبت المسلمين عامة فلئن عشت فليأتين الرّاعی وهو لسروِ وحمير نصيبه منها ولولم يعرق فيها جبينه

(رواہ فی شرح السنۃ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، باب الفئی)

حضرت مالک بن اوسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے یہ آیت پڑھی **إنما الصدقات للفقراء والمساكين** یہاں تک کہ **عليم حكيم** تک پہونچے۔

پھر یہ آیت پڑھی **واعلموا إنما غنمتم من شئی** یہاں تک کہ **ابن السبيل** تک پہنچے پھر کہا یہ ان لوگوں کا حصہ ہے۔

پھر یہ آیت پڑھی **ما أفاء الله على رسوله من أهل القرىٰ** یہاں تک کہ **للفقراء** وغیرہ تک پہنچے اور اس آیت کی تلاوت کی **والذين جاءوا من بعد هم** پھر فرمایا۔

اس آیت نے تمام مسلمانوں کا احاطہ کرلیا ہے۔ پس اگر میں زندہ رہا تو سرو اور حمیر

کے اس چرواہے کو بھی اس میں سے حصہ پہنچے گا جس کی پیشانی پر پسینہ نہیں آیا۔

علامہ شبلی کہتے ہیں کہ اس پر زور تقریر کے بعد تمام لوگ بول اٹھے کہ بے شبہ آپ کی رائے بالکل صحیح ہے۔ اس استدلال کی بنا پر یہ اصول قائم ہوگیا کہ جو ممالک فتح کئے جائیں وہ وہ فوج کی ملک نہیں ہیں بلکہ حکومت کی ملک قرار پائیں گے اور پچھلے قابضین کو بے دخل نہیں کیا جائیگا۔[۲۶]

یہ اجلاس شوریٰ کی قانونی اور دستوری حیثیت کو واضح کرنے میں بڑا موثر ہے۔ اس سے وضاحت ہوتی ہے کہ:

۱۔ حضرت عمرؓ مفتوحہ ممالک کو سرکاری جائداد قرار دینے کی رائے میں پوری طرح یکسو تھے مگر اسلام کے شورائی نظام کی بقا و استحکام کی خاطر مجلس شوریٰ عام میں اسے مباحثہ کے لئے پیش کیا۔ استبداد اور خود رائی سے کوسوں دور تھے ورنہ آپ یہ نہ فرماتے کہ اے اللہ، مجھے بلال سے نجات دے!

۲۔ سورہ حشر کی آیت **والذین جاءوا من بعدھم** کی تلاوت نے شوریٰ کی فضا بدل کر رکھ دی۔ یہ آیت اس باب میں گویا برہانِ قاطع ثابت ہوئی اور صحابہ کرام کو حیرت ہوئی کہ اس آیت پر ان کی نظر کیوں نہ گئی تھی۔

۳۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن و احادیث کے متون اور صریح احکام و تعلیمات شوریٰ کے دائرہ میں نہیں آتیں۔ جن امور کے بارے میں قرآن وسنت اور اجماع میں کوئی رہنمائی موجود نہیں ہے انہی امور پر شوریٰ میں بحث ہوسکتی ہے اسی لئے آیت **والذین جائوا من بعدھم** کی تلاوت کے بعد بحث و اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے اپنی ذاتی رائے کو سرکاری پالیسی اسی وقت قرار دیا جب کہ مجلس شوریٰ کی اکثریت اس پر مطمئن ہوگئی اور اس نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔

ان مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی قائم کردہ مجلس شوریٰ دوایوانی تھی اور قانونی اعتبار سے اس کی حیثیت مسلّم تھی۔ اتفاق رائے یا کثرت رائے سے ہونے والے اس کے فیصلے نافذ العمل ہوتے تھے اور ان کی پابندی خلیفہ کے لئے بھی اسی طرح ناگزیر تھی

جس طرح اراکین شوریٰ کے لئے اور خلیفہ کو کسی قسم کا حق استرداد حاصل نہ تھا۔ یہ علامہ شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے فاروقی شوریٰ کے خدو خال پوری طرح واضح کئے اور مقننہ کے سامنے انتظامیہ کی جوابدہی کا تصور واضح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے شورائی نظام کا مفصل خاکہ پہلی بار اسلامی تاریخ میں پیش کیا اسی لئے یہ اقدام بجا طور پر اولیات عمرؓ میں سرفہرست جگہ پانے کا مستحق ہے [۷۲] اور اگر شبلی کی اولیات کی کوئی فہرست مرتب ہوگی تو مجلس شوریٰ کے حوالہ سے الفاروق جیسی شاہکار تصنیف اس میں نمایاں ہوگی۔

تعلیقات وحواشی

۱۔ مولانا حامد الانصاری غازی، اسلام کا نظام حکومت، مکتبہ الحسن لاہور، طبع سوم، ص: ۲۹۹

۲۔ اس آیت کے سبب نزول اور اسکی حکمتوں کے لئے دیکھئے سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۷۱، ج: ۴، ص: ۱۲۰۔۱۱۸، اس نکتہ نظر کی وضاحت کیلئے دیکھئے۔

El- Awa, M.S. On the Political system of the Islamic State, American Trust Publications, Indiana, 1980. P. 87.

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، طبع اول، ۱۹۷۸ء، ص: ۱۷۹۔۱۸۰

۴۔ ابوحیان اندلسی، البحر المحیط، ج: ۳، ص: ۱۹

۵۔ بیہقی، شعب الایمان، عن ابن عباسؓ (بسند حسن)، روح المعانی ج: ۴، ص: ۹۴

۶۔ علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶م، ج ۲، ص: ۱۱

۷۔ اسلام کے نظریۂ خلافت اور دور جدید کی جمہوریت کے مابین واضح فرق کیلئے مطالعہ کیجئے۔ مولانا عبد الرحمٰن کیلانی، خلافت و جمہوریت، مجلس التحقیق الاسلامی لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۵م، نیز مولانا حامد الانصاری غازی، حوالہ بالا، ص: ۴۴۰۔۴۵۰

۸۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، مارچ، ۱۹۸۷ء، ص: ۴۷۹۔۴۸۱

۹۔ الفاروق، حوالہ بالا، ج: ۲ ص: ۱۳

۱۰۔ نفس مصدر

۱۱۔ نفس صدر، ص: ۱۵۔۱۶، مورخ بلاذری نے اس مجلس کا حال ایک ضمنی تذکرے میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ **کا ن للمهاجرين مجلس في المسجد فكان عمر يجلس معهم فيه ويحدثهم عماينتهي إليه من أمر الآفاق فقال يوماً ما أدرى كيف أصنع بالمجوس۔**

۱۲۔ الفاروق، حوالہ بالا، ج:۲ص:۱۲

۱۳۔ کنزالعمال بحوالہ مصنف بن ابی شیبہ، ج،۳،ص:۱۳۹

۱۴۔ الفاروق، ج:۲ص:۱۳

۱۵۔ مولانا حامد الانصاری غازی، حوالہ بالا، ص:۴۴۱

۱۶۔ اسلامی ریاست، حوالہ بالا، ص: ۳۳۰۔۳۳۱ مولانا مودودی صدر ریاست کو ویٹو پاور عطا کرنے کے ساتھ خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرہ ہی میں اسے قابل عمل قرار دیتے ہیں۔ مولانا کے بقول اگر شوریٰ کا طرز اور اس کی روح اور اہل شوریٰ کی ذہنیت اور سیرت وہی ہو جو خلافت راشدہ کے اس نمونے میں ہم دیکھتے ہیں تو پھر اس سے بہتر کوئی طریقہ کار نہیں جو وہاں اختیار کیا گیا۔

۱۷۔ نفس صدر، ص: ۳۳۲۔۳۳۳۔ مولانا عبد الرحمٰن کیلانی بھی اختلاف کی صورت میں آخری فیصلہ کا اختیار میر مجلس کو دیتے ہیں اور اس فیصلہ میں اسے کثرت رائے کا پابند قرار نہیں دیتے۔ دیکھئے حوالہ بالا، ص:۱۵۱۔۱۶۴

۱۸۔ الفاروق، حوالہ بالا، ج:۲،ص:۱۶۔۱۷

۱۹۔ قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۶۴

۲۰۔ الفاروق، حصہ اول، ص: ۱۹۸۔۲۰۰۔ تفصیل کیلئے دیکھئے، مولانا سید جلال الدین انصر عمری، اسلام کا شورائی نظام، مرتب اختر حجازی، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۱۷۔۱۲۰

۲۱۔ الفاروق حصہ اول، ص: ۱۵۳۔۱۵۴ امام مسلم نے عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت سے

اس مجلس مشاورت کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے اس اجلاس کے بعض دوسرے اہم گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے اس روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے پہلے مہاجرین اولین کو مشورہ کے لئے بلایا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا مگر ان کے درمیان اختلاف رائے ہوگیا۔ بعض کی رائے تھی کہ آپ دینی کام کے لئے نکلے ہیں ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ اسے چھوڑ کر واپس جائیں اور بعض کہتے تھے کہ آپ کے ساتھ صحابہ اور دوسرے لوگ ہیں ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ انہیں اس وبا کے حوالہ کر دیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں واپس کر دیا پھر انصار کو بلایا اور ان کے سامنے مسئلہ رکھا۔ انہوں نے بھی مہاجرین کی طرح اختلاف کیا۔ آپ نے انہیں بھی یہی کہا کہ اب آپ لوگ واپس جائیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان قریشی مہاجرین کو طلب کیا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ان میں سے دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہ کیا اور کہنے لگے، ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ آپ لوگوں کو اس وبا میں نہ جھونکیں۔ تب حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ علی الصباح روانگی ہے۔

یہ اعلان سن کر ابو عبیدہ بن الجراح حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا، کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کاش یہ بات ابو عبیدہؓ کے سوا کوئی اور کہتا۔ پھر کہنے لگے: ہاں ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ذرا سوچو تو، اگر آپ اپنے اونٹ کسی وادی میں چرانے لے جائیں جس کا ایک حصہ خشک اور بے آب و گیاہ ہو اور دوسرا حصہ سرسبز و شاداب ہو تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اگر خشک حصہ میں چرائیں تو وہ بھی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا اور اگر سبزہ زار میں چرائیں تو وہ بھی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا؟

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اتنے میں عبد الرحمٰن بن عوفؓ آگئے جو اپنے کسی کام کی وجہ سے اس وقت غیر حاضر تھے کہنے لگے

إن عندي علماً سمعت رسول الله صلى الله عليه

وسلم يقول إذا سمعتم به بأرضٍ فلا تقدموا عليه وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا منها فراراً

(صحیح مسلم، کتاب السلام، باب الطاعون)

(مجھے اس کا شرعی حکم معلوم ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب سنو کہ کسی شہر میں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر ایسی جگہ طاعون پھیل جائے جہاں تم پہلے سے موجود ہو تو وہاں سے مت بھاگ نکلو)

صحیح مسلم کی اس تفصیل سے شوریٰ کی قانونی حیثیت مزید واضح ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرق مراتب کے ساتھ اور خدمات اور قربانیوں کے لحاظ سے متعدد گروہوں سے علیحدہ علیحدہ مشورہ کیا اور اجتماعی مشاورت کے نتیجہ میں وہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جب حدیث سنادی تو مزید شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل ہوگیا۔ علامہ شبلی کے ہاں یہ تفصیلات مفقود ہیں۔

۲۲۔ الفاروق، ج:۱، ص:۱۵۲۔۱۵۴

۲۳۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، خلافت و جمہوریت، ص:۱۴۳

۲۴۔ طبری، تاریخ الرسل والملوک، ج:۳ ص:۴۸۰۔۴۸۲

۲۵۔ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت عمرؓ نے فرمایا

لولا آخر المسلمين ما افتتحت قرية إلا قسمتها بين أهلهاكما قسم النبى صلى الله عليه وسلم خيبر

(بخاری، كتاب الجهاد والسير، باب الغنيمه لمن شهد الوقعة)

(اگر مجھے بعد میں آنے والے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں جو بستی فتح کرتا اسے فتح کرنے والوں میں اسی طرح بانٹ دیتا جس طرح آنحضرت

ﷺ نے خیبر کو بانٹ دیا تھا)

۲۶۔ الفاروق، ج:۲ص: ۳۸۔۳۹

۲۷۔ شبلی نے (الفاروق، ج: ۲ ص: ۲۷۷۔۲۸۰) حضرت عمرؓ کے حالات کی تفصیل ۴۵ اولیات پر ختم کی ہے مگر معلوم نہیں کیسے اس اہم ترین اقدام فاروقی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور اسے اولیات میں شمار نہیں کیا ہے۔

☆☆☆

''الفاروق'' کے معاشی مباحث کا تجزیہ

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی

علامہ شبلی نعمانیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''الفاروق'' نہ صرف یہ کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطابؓ کے حالات زندگی کا دلکش بیان ہے بلکہ اس عہد کی سیاسی وفوجی، علمی وثقافتی اور معاشی وسماجی معلومات کا قیمتی ذخیرہ بھی ہے، جس کے ایک ایک پہلو کے جائزہ کے لئے علاحدہ مستقل مقالے درکار ہیں۔[1] پیش نظر مضمون میں ''الفاروق'' کے معاشی مباحث کے تجزیے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس وقت اسلامی معاشیات نے مستقل ومنفرد علم کی حیثیت اختیار کر لی ہے جس کے اصول ومبادی قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں. اسلامی معاشیات کے اصولوں کو خلفاء راشدین نے جس طرح سمجھا اور برتا وہ اسلامی معاشی فکر کی تاریخ کا نقطۂ آغاز ہیں۔ معاشی فکر اور معاشی تاریخ میں بہت گہرا ربط ہوتا ہے ہم معاشی فکر سے معاشی تاریخ کا پتہ لگا سکتے ہیں اور معاشی تاریخ سے معاشی فکر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ قرن اول کے لوگوں کے معاشی افکار کا تذکرہ روایات میں کم ہی ملتا ہے اسلئے اس کے جاننے کا واحد ذریعہ اس عہد کی معاشی تاریخ رہ جاتی ہے اس لحاظ سے ''الفاروق'' کے معاشی مباحث اسلامی معاشی فکر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے علم معاشیات کی رسمی تعلیم حاصل کی تھی یا نہیں لیکن ''الفاروق'' کے معاشی مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اس علم سے اچھی طرح واقف تھے، علم معاشیات سے مولانا کی واقفیت کی ایک دلیل اس واقعہ میں بھی ہے کہ جب علامہ اقبال نے اپنی کتاب ''علم الاقتصاد'' شائع کی تو پہلے اس پر مولانا سے اصلاح لی۔[2]

علامہ شبلی نعمانی نے ''الفاروق'' میں جن معاشی مسائل سے بحث کی ہے ان

کو درج ذیل بڑے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بیت المال کا قیام وانتظام
۲۔ حکومت کے ذرائع آمدنی
۳۔ مصارف عامہ
۴۔ معاشی فروغ کے لئے کوششیں
۵۔ نظام احتساب
۶۔ سکہ کا اجرا اور زر کی کیفیت اور
۷۔ شورائی معیشت یا معاشی جمہوریت۔ ہم انہی عناوین کے تحت جملہ مباحث پر گفتگو کریں گے۔

بیت المال کا قیام

کسی بھی حکومت کے استحکام وبقاء کے لئے مالیات کا شعبہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بیت المال کا قیام حضرت عمرؓ کے اولیات میں شمار ہوتا ہے۔[۴۲] اس کا تصور تو خود عہد نبوی میں پایا جاتا تھا لیکن آنحضورﷺ کے زمانہ میں نہ تو اتنی آمدنی تھی اور نہ اسے روک رکھنے کی ضرورت تھی اسلئے بیت المال کے الگ قیام کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی، جب کوئی چیز آئی تو مسجد میں ڈھیر کردی گئی اور وہیں سے تقسیم ہوگئی۔ علامہ نعمانی نے کتاب الاوائل اور ابن سعد کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس مقصد کیلئے ایک مکان خاص کرلیا تھا مگر اس میں بھی شاید ہی کچھ رکھنے کی نوبت آتی۔[۴۳] حضرت عمرؓ کے عہد میں جب فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور حکومت کی آمدنی روزمرہ کے اخراجات سے بڑھی تو خود حضرت عمرؓ کو اس ادارہ کے قیام کا خیال آیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی تائید کی اور ولید بن ہشام کی اس گواہی سے انہیں تقویت ملی کہ سلاطینِ شام کے یہاں اس طرح کا مخصوص ادارہ قائم ہے۔ حضرت عمرؓ کو غیروں سے مفید بات اخذ کرنے میں عار نہیں تھا۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں ''آج کل کا زمانہ ہوتا تو غیر مذہب والوں کے نام سے اجتناب کیا جاتا، لیکن حضرت عمرؓ

نے اس رائے کو پسند کیا اور بیت المال کی بنیاد ڈالی"[۵]

ایک اچھے بیت المال کے لئے ضروری ہے کہ ایماندار وفرض شناس محافظ ہو، رکھنے کا محفوظ و مستحکم انتظام ہو۔ اس کے اندر غیر مرکزیت (Decentralization) ہو، غیر متعلق اشخاص کی دخل اندازی نہ ہو، ذرائع آمدنی مستقل و متیقن ہوں، ان کا پورا حساب کتاب مرتب ہو اور مصارف من مانی نہ ہوں۔ بیت المال کے قیام وانتظام کے تقاضوں سے خلیفۂ دوم اچھی طرح واقف تھے چنانچہ اس پر حضرت عبد اللہ بن ارقمؓ جیسے معزز صحابی کو جو لکھنے پڑھنے میں بہت مہارت رکھتے تھے اس کا گورنر مقرر کیا اور دو لائق و فاضل صحابہ عبدالرحمٰن بن عبیدؓ اور معیقبؓ انگشتری بردار رسول ﷺ کو ان کا ماتحت مقرر کیا۔[۶] اس کی عمارت پختہ اور مستحکم بنوائی۔ اس محکمہ کو آزاد اور جداگانہ سربراہی عطا کر کے حکام کے امکانی سوء استعمال کا سد باب کیا، یہی نہیں بلکہ مولانا شبلی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے وفاقی یا غیر مرکزی مالیات عامہ کو فروغ دیا، اور مقامی ضرورتوں سے فاضل آمدنی ہی مرکزی بیت المال کو منتقل ہوئی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"دار الخلافہ کے علاوہ تمام صوبجات اور صدر مقامات میں بیت المال قائم کئے اور اگرچہ وہاں کے اعلیٰ حکام کو ان کے متعلق ان کو ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے لیکن بیت المال کا محکمہ بالکل الگ ہوتا تھا اور اس کے افسر جداگانہ ہوتے تھے.."[۷]

......"صوبجات اور اضلاع میں جو خزانے تھے ان کا یہ انتظام تھا کہ جس قدر رقم وہاں کے ہر قسم کے مصارف کے لئے ضروری ہوتی تھی رکھ لی جاتی تھی، باقی سال کے ختم ہونے کے بعد صدر خزانہ یعنی مدینہ منورہ کے بیت المال میں بھیج دی جاتی تھی"۔[۸]

بیت المال کے ذرائع آمدنی مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے خرچ کی مخصوص مدات بھی ہوتی ہیں مثلاً زکوٰۃ، خمس غنائم، فئی، خراج، جزیہ وغیرہ۔ اسلامی بیت المال کی درست اور بہتر کارکردگی کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام ذرائع آمدنی کے الگ الگ رجسٹر اور ان کے اخراجات کی تفصیل درج ہو۔ مولانا شبلی نے اس سلسلہ

میں حضرت عمر فاروقؓ کے اہتمام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بیت المال کا حساب نہایت صحت سے مرتب ہوتا تھا، زکوٰۃ وصدقہ میں جو مویشی آتے تھے بیت المال سے متعلق تھے چنانچہ ان کے رجسٹر تک نہایت تفصیل سے مرتب تھے۔ جانوروں کا حلیہ، رنگ اور عمر تک لکھی جاتی تھی اور بعض وقت خود حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے"۔[9] اس طرح خرچ میں بھی کفایت شعاری اور احتیاط ملحوظ رکھتے، کسی بھی بے احتیاطی پر سخت باز پرس کرتے، اس سے نہ صرف یہ کہ بیت المال کا نظام درست رہا بلکہ حکومت کو بھی استحکام حاصل ہوا، مولانا نے بہت صحیح فرمایا کہ "حضرت عمرؓ نے بیت المال کے بارے میں جو کفایت شعاری اور تنگ ورزی برتی وہ خلافت فاروقی کی کامیابی کا بڑا سبب تھی"۔[10]

بیت المال کے نظام کی درستگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تقسیم کا طریقہ کار طے اور معلوم ہو، کسی کو من مانی کرنے کی اجازت نہ ہو، حضرت عمرؓ نے اس سے عطایا اور وظائف جاری کئے اور اس کے لئے اعداد وشمار کی روشنی میں مستفیدین کے حقوق طے کئے۔ امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال سے تقسیم وظائف میں حضرت ابو بکرؓ نے مساوات کا اصول اپنایا[11] جب کہ حضرت عمرؓ نے اسلام میں سبقت اور حضور پرنور ﷺ سے قربت جیسے معیارات کی بنا پر کمی بیشی رکھی۔[12] اس کی وجہ خلفاء کی اپنی مصلحتوں کے علاوہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں زیادہ دولت وثروت نہیں آتی تھی اور ضرورتیں سب کی پوری ہونی تھیں اس لئے مساوات قائم کیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دولت بڑھی تو سابقین اسلام اور آنحضرت ﷺ کے قرابت داروں کو کچھ ترجیح دی گئی۔ لیکن جب دولت وثروت میں اور اضافہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے بھی مساوات کی طرف لوٹنا چاہا جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کی روایت سے واضح ہے مگر آپؓ کو اس کا موقع نہیں ملا۔[13] علامہ شبلی نے "الفاروق" میں حضرت عمرؓ کے معیارات تقسیم کا ذکر کیا ہے لیکن حضرت ابو بکرؓ سے الگ اصول اپنانے اور آخر عمر میں پھر اس کی طرف لوٹنے کے ارادہ سے کوئی تعرض

نہیں کیا ہے۔

بیت المال کو خرد برد سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ منتظمین کی تنخواہیں معقول ہوں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے باتنخواہ کام لیا اور بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کیں تاکہ افسران میں خیانت کا خیال پیدا نہ ہو۔[۱۴] تنخواہ پر کام کرنے میں بعض صحابہ کو تردد تھا لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں قائل کیا۔[۱۵] علامہ شبلی آج کل کے ان اہل تقوی کو اس سے سبق لینے کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو آج بھی تنخواہوں پر کام کرنے کو عار سمجھتے ہیں لیکن نذرونیاز قبول کرنے میں انہیں جھجک نہیں ہوتی۔[۱۶]

حکومت کے ذرائع آمدنی

علماء اسلام نے اسلامی حکومت کے ذرائع آمدنی کو عام طور پر ان کے مدات صرف کے لحاظ سے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ اول زکوٰۃ جس کے آٹھ مستحقین خود قرآن نے بیان کردیئے ہیں۔ دوم خمس غنیمت جس کے مصرف کا ذکر بھی قرآن میں ہے اور تیسرے فئی اور دیگر آمدنیاں مثلاً خراج، جزیہ، لاوارث ترکے وغیرہ جو حکومت کے عام اخراجات اور فلاحی کاموں پر خرچ کئے جاسکتے ہیں۔ چونکہ علامہ شبلی عہد فاروقی کی کوئی معاشی تاریخ نہیں لکھ رہے تھے اس لئے انہوں نے اس روایتی انداز کی پیروی نہیں کی۔ معاشی مباحث سے ان کے پیش نظر اس میدان میں ان کے کارناموں کا جائزہ لینا مقصود تھا اس وجہ سے جہاں ان کے اجتہادی کارنامے بیش از بیش ہیں ان کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے اور جہاں انہوں نے پیش رو پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہے وہاں مختصر تذکرے پر اکتفا کیا ہے، چنانچہ سب سے زیادہ زور قلم خراج پر صرف کیا ہے کہ عہد فاروقی میں نہ صرف یہ کہ اس ذریعہ آمدنی کی اہمیت میں کافی اضافہ ہوگیا تھا بلکہ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے بڑے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلق مولانا نے صرف اتنا لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ اضافہ ہوا کہ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی"۔[۱۷] لیکن مولانا نے یہ واضح کردیا ہے کہ یہ خدانخواستہ رسول اللہؐ کی مخالفت نہیں ہوئی کیونکہ

آپ ﷺ نے سواری کے گھوڑوں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا تھا نہ کہ تجارت کے گھوڑوں کو جو اس دور میں پائے نہیں جاتے تھے، اب نئی صورتحال میں انہیں مستثنیٰ قرار دینا منشاء نبوت کے خلاف تھا۔[۱۸]

عشور یا Custom Duty کا بطور ذریعہ آمدنی شروع کرنا حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے جو آپ نے ایک جوابی کارروائی کے طور پر اپنایا کیونکہ جب مسلمانی تاجر دوسرے ملکوں میں جاتے تو ان سے دسواں حصہ سرحد پر وصول کیا جاتا۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے بھی جواباً ان ملکوں کے تاجروں پر دار الاسلام میں تجارت کے لئے سامان لانے پر دس فیصد محصول عائد کر دیا۔ بعد میں اہل ذمہ اور مسلمان تاجروں پر بھی یہ ٹیکس پانچ فیصد اور ڈھائی فیصد عائد کیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں آپ نے سخت تاکید کی کہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔[۱۹]

حضرت عمرؓ کے پورے دور خلافت میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر مال غنیمت آ تا رہا ہوگا، مولانا اس کی تفصیلات دے سکتے تھے لیکن سوائے اس ذکر کے کہ یہ بھی ذرائع آمدنی میں شامل تھا اور کچھ نہ لکھا، وجہ شاید یہی رہی کہ اس عہد کی معاشی تاریخ لکھنا مولانا کے پیش نظر نہیں تھا، جو چیز حضرت عمرؓ کے ساتھ مخصوص تھی اس کا خاص طور پر تذکرہ کیا مثلاً خمس غنیمت سے مفتوحہ اراضی کو نکال کر اس کے سابق مالکوں کے ہاتھ میں رہنے دیا اور اسی پر خراج عائد کیا چنانچہ خراج کے تحت اس کی تفصیلات لکھی ہیں، اس طرح خمس غنیمت کے مصارف سے متعلق بھی حضرت عمرؓ کا موقف اہمیت کا حامل تھا اس لئے اس پر نہایت اچھی بحث کی ہے جس پر ہم نیچے گفتگو کریں گے۔

جزیہ کی تفصیلات بھی مولانا نے اس حیثیت سے نہیں لکھی ہیں کہ وہ اسلامی حکومت کا کوئی اہم ذریعۂ آمدنی ہے بلکہ ذمی رعایا کے حقوق اور ان سے معاملت کے تحت اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے لکھا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے، یہ محصول نوشیرواں کے زمانہ میں بھی تھا۔ اسلام نے اس کو حفاظتِ اہل ذمہ کے معاوضہ کے

طور پر قائم رکھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے رسالہ جزیہ کا حوالہ بھی دیا۔[۲۰] البتہ جزیہ کی شرح سے متعلق مولانا نے یہ خاص بات تحریر کی ہے کہ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی شرح کو جو جنگ تبوک کے موقع پر فی کس ایک دینار مقرر کی تھی تشریعی نہیں سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے مختلف ملکوں میں اس کی مختلف شرحیں مقرر کیں۔[۲۱] اس میں انہوں نے اہل ذمہ کی ادائیگی کی سکت اور سماجی و معاشی حیثیت کو ملحوظ رکھا جو ان کی معاشی بصیرت پر دلیل ہے۔

البتہ خراج کے مسئلے کو مولانا نے قدرے تفصیل سے لیا ہے۔ اور اس باب میں حضرت عمرؓ کی اصلاحات وایجادات اور یافتوں یا انجازات (Achievements) کو خاص طور نمایاں کیا ہے۔ مولانا کے مطابق خراج کے سلسلہ میں نہ تو عربوں میں پہلے سے کوئی روایت موجود تھی اور نہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی مفصل اسوہ چھوڑا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی خراج سے متعلق کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی لیکن حضرت عمرؓ نے خراج کا انتظام، زمینوں کا بند وبست اور زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں جو اقدامات کئے اس نے فارس اور مصر وشام کی حکومتوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔[۲۲]

مولانا کے مطابق سب سے بڑا انقلاب جو حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں کیا وہ یہ تھا کہ مفتوحہ اراضی کو فوجیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اسے اس کے کاشتکاروں کے ہاتھوں میں رہنے دیا اور ان پر خراج عائد کیا گرچہ اس کیلئے انہیں کئی روز تک صحابہ کو مطمئن کرنے اور اپنا ہمنوا بنانے کیلئے گفت وشنید کرنی پڑی۔ اس عمل سے کئی فائدے ہوئے ایک تو بڑی بڑی اراضی صرف فوجیوں کے درمیان تقسیم کرنے سے جو معاشی عدم توازن ہوتا اس سے بچایا اگر زمین تقسیم کردیتے تو عربوں کو ایک ایسے کام (زراعت) میں لگا کر (جس کا انہیں تجربہ بہت کم تھا) ایک طرف زراعت کا ستیہ ناس ہوتا، دوسری طرف اسلامی مجاہدین کی توجہ بھی جہاد سے ہٹ کر دوسری طرف منعطف ہوجاتی پھر آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا اس طرح اس اقدام سے حضرت عمرؓ نے بہت سی معاشی پیش بندیاں کیں۔[۲۳]

خراج کے سلسلہ میں ایک جگہ مولانا کے بیان میں کچھ تعارض سا محسوس ہوتا ہے وہ ایک طرف تحریر کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی ''لگان کی شرحیں نوشیرواں کی مقرر کردہ شرحوں سے زائد تھیں''۔[۲۴] دوسری طرف اسی صفحہ پر رقم طراز ہیں کہ ''یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عمرؓ نے اگر چہ نہایت نرمی سے خراج مقرر کیا تھا لیکن جس قدر مالگذاری ان کے عہد میں وصول ہوئی زمانۂ مابعد میں کبھی وصول نہیں ہوئی''۔[۲۵] مولانا نے اول الذکر کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ نرم اور کم شرح کا ذکر متعدد مآخذ میں آیا ہے۔ اور خود مولانا نے ایک سے زائد جگہوں پر یہ بات کہی ہے۔[۲۶] نرم اور کم شرح کے باوجود مالگذاری میں اضافہ پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ ایسی صورت میں لوگ خوشدلی کے ساتھ اور پورا ٹیکس ادا کرتے ہیں اوراس سے معاشی سرگرمیوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے جس سے مزید آمدنی حاصل ہوتی ہے۔اسی چیز کو علامہ ابن خلدون نے بطور نظریہ کے پیش کیا چنانچہ فرماتے ہیں: ''معلوم ہونا چاہئے کہ ٹیکس کا معاملہ یوں ہے کہ قیام حکومت کے دور اول میں کم شرحوں کے باوجود بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہے اور حکومت کے آخری دور میں بڑی شرحوں کے باوجود کم آمدنی ہوتی ہے ....''۔[۲۷]

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ دور جدید میں اس نظریہ کو امریکہ کے سابق صدر ریگن کے معاشی مشیر لیفر نے عام کیا جو جدید معاشیات میں خط لیفر (Laffer's Curne) کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستانی ماہر معاشیات راجا چلیا نے جنھیں ٹیکس سے متعلق اصلاحات کا کام سپرد کیا گیا تھا اسی کی سفارش کی کہ آمدنی بڑھانے کیلئے ٹیکس کی شرح کم کی جائے اوراس کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے خراج اہل ذمہ کی زمینوں پر عائد ہوتا تھا جب کہ مسلمانوں سے عشر یا نصف عشر وصول کیا جاتا تھا اس سے جو غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی اسکا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کے ساتھ عشر کی تخصیص اگر چہ بظاہر ایک قسم کی ناانصافی یا قومی ترجیح معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں

ہے اولاً تو مسلمانوں کو بمقابلہ ذمیوں کے بہت سی زائد رقمیں ادا کرنی پڑتی تھیں مثلاً مویشی پر زکوٰۃ، گھوڑوں پر زکوٰۃ، روپے پر زکوٰۃ، حالانکہ ذمی ان محصولوں سے بالکل مستثنیٰ تھے۔ اس بناپر خاص زمین کے معاملہ میں جو نہایت اقل قلیل مسلمانوں کے قبضے آئی تھی اس قسم کی رعایت بالکل متضاد انصاف تھی۔ دوسرے یہ کہ عشر ایک ایسی رقم تھی جو کسی حالت میں کم یا معاف نہیں ہوسکتی تھی یہاں تک خود خلیفہ یا بادشاہ معاف کرنا چاہے تو معاف نہیں کرسکتا تھا، بخلاف اس کے خراج میں تخفیف اور معافی دونوں جائز تھی اور وقتاً فوقتاً اس پر عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ خراج سال میں صرف ایک دفعہ لیا جاتا تھا بخلاف اس کے عشر کا یہ حال تھا کہ سال میں جتنی فصلیں ہوتی تھیں سب کی پیداوار سے الگ الگ عشر وصول کیا جاتا تھا''۔[۲۸]

مولانا نے خراج اور عشر کا جو تقابل پیش کیا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہل ذمہ پر خراج عائد کرنے سے ان کے ساتھ ایک طرح کی رعایت کی گئی ہے یا کم از کم کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس میں یہ بات بھی شامل کی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان خراجی زمین حاصل کرتا ہے تو بعض مسالک کے اعتبار سے اسے عشر کے ساتھ خراج بھی دینا ہوگا جبکہ اہل ذمہ سے دونوں چیزیں کسی حال میں وصولی نہیں کی جاسکتیں۔ البتہ مولانا کا یہ فرمانا کہ خراج سال میں صرف ایک بار لیا جاتا تھا حضرت عمرؓ کے عہد کی ترجمانی ہے۔ اس دور میں خراج، آراضی کے رقبہ کے حساب سے ایک معین محصول جس کو مساحہ یا(Fixed land tax) کہتے ہیں بعد کے دور میں اس طرح کا معین زمینی محصول غیر مناسب محسوس ہوا چنانچہ خلیفہ ہارون رشید نے امام ابو یوسف سے اس سلسلہ میں رائے مانگی تو انہوں نے مساحہ کی جگہ مقاسمہ (بٹائی کے طور پر یاProportional Agriculture tax) اپنانے کا مشورہ دیا اور اسی کو انصاف کے تقاضوں سے زیادہ قریب بتایا۔[۲۹] ظاہر ہے جب خراج فصل پر ہوگا تو جتنی فصل اگائی جائے گی سب پر ہونا چاہئے الا یہ کہ اس سلسلہ میں کوئی خاص حکم وضع کیا جائے۔ یہاں یہ سوال ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر

مساحہ کا طریقہ غیر موزوں اور اکثر انصاف پر مبنی نہیں ہوتا تو آخر حضرت عمرؓ نے اسے کیوں اپنایا اس کا جواب امام ابو یوسف نے یہ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس سے انصاف کے تقاضے پورے ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے باقاعدہ ساری زمینوں کا دو ماہرین سے سروے کرانے کے بعد زمین کی طاقت سے بہت کم خراج طے کیا تھا۔ پھر یہ کہ اس زمانہ میں زمین کا زیادہ حصہ زرخیز اور قابل کاشت تھا اور بہت کم حصہ اس سے مختلف تھا اسلئے زیادہ حصہ کا خیال کر کے خراج طے کیا گیا جبکہ ادھر سو سال گزرنے کے بعد زمینوں کی زرخیزی اور نوعیت میں کافی فرق آیا تھا۔ اور آخری بات یہ کہ حضرت عمر کے زمانہ میں قیمتیں عام طور پر غیر متغیر تھیں جس سے خراج لینے اور دینے والے دونوں پر یکساں اثر پڑتا تھا، ہارون رشید کے زمانہ میں قیمتوں میں بڑا اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا جس کے منفی اثرات کبھی کسانوں پر پڑتے اور کبھی حکومت پر اس لئے انہوں نے مساحہ معین زمینی محصول کے بجائے مقاسمہ (فصلوں کی بٹائی) پر مبنی خراج کی سفارش کی ہے[۳۰]

مصارف عامہ:

حکومت کے ذرائع آمدنی کے ساتھ مصارف عامہ کا ذکر لازم ہے کہ اس کے بغیر کوئی بھی معاشی جائزہ نامکمل رہے گا۔ یہاں بھی مولانا نے معاشی تاریخ کی کتابوں کا انداز اختیار کرنے کے بجائے اخراجات عامہ کے تذکرے خلافت فاروقی کی مختلف سرگرمیوں اور کارناموں کے تحت کیا ہے، اس لئے اس کا بیان ''الفاروق'' کے دوسرے حصہ میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے مزید یہ کہ حکومت کے مختلف ذرائع آمدنی کے جملہ مصارف کا احاطہ کرنے کے بجائے جس مصرف کو حضرت عمرؓ سے کوئی اختصاص حاصل ہے اسی کے بارے میں لکھا ہے ظاہر ہے سیرت کی کتاب کے لئے یہی انداز موزوں ہے۔ لیکن ہم اپنے جائزے میں اس ترتیب کو ملحوظ رکھیں گے جو ہم نے حکومت کے ذرائع آمدنی کے باب میں اپنائی ہے۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف کا بیان خود قرآن میں آیا ہے معاشیات کے ایک

طالبعلم کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ ان مصارف کی شرح وتطبیق میں حضرت عمر فاروقؓ کا کیا موقف رہا۔ لیکن اس باب میں ہمیں ''الفاروق'' سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ثانی نے زکوٰۃ کے مصارف ثمانیہ میں سے فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب لیا ہے۔[۳۱] یہ بات بڑی اہم ہے کیونکہ بعض ائمہ نے زکوٰۃ کی رقم کو غیر مسلمین پر صرف کرنے سے منع کیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کی مد کو اپنے عہد میں موقوف کر دیا تھا کہ اب اسلام اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ ایسے لوگوں کی تالیف قلب کے ذریعہ ان کی ہمدردیوں اور ان کے اسلام کے حصول کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔[۳۲] مگر مولانا نے حضرت عمرؓ کے اس اہم فیصلہ کو درج نہیں کیا۔

خمس غنیمت کے مصارف خمسہ کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ حضرت عمرؓ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کا حق بحال رکھا لیکن وہ دو باتوں کے خلاف تھے ایک یہ کہ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ خمس کا پورا پانچواں حصہ ذوی القربی کا حق ہے، دوسرے یہ کہ وہ مصلحت اور ضرورت کے لحاظ سے کم وبیش تقسیم کرنا خلیفۂ وقت کا حق سمجھتے تھے۔[۳۳] علامہ شبلی نعمانی نے حضرت عمرؓ کے اس موقف کی پوری وضاحت کی ہے۔[۳۴]

اسی طرح اموال فئی میں سے بھی جو اللہ کے رسول ﷺ کو ملتا ہے اس کی حیثیت خالصہ کی ہوتی ہے نہ کہ مملوکۂ خاص کی۔ خالصلہ دراصل مملوکۂ حکومت ہوتا ہے جو سربراہ حکومت کو اس کے ذاتی اخراجات پورا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے چونکہ وہ مملوکہ خاص نہیں بلکہ مملوکۂ حکومت ہوتا ہے اس لئے اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی بلکہ امام یا سربراہِ حکومت کے انتقال کے بعد وہ حکومت کو لوٹ آتا ہے، مولانا کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کو جو باغ فدک فئی سے ملا تھا اس کی یہی حیثیت تھی اسلئے وہ ان کے بعد ان کے ورثہ میں تقسیم نہیں ہوا۔ مولانا نے اس

معرکتہ الآرا مسئلہ کو جس سہولتِ بیان اور قوت دلیل سے منقح کیا ہے اس سے ان کی عظیم دینی وسیاسی اور عمیق قانونی ومعاشی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔[۳۵]

چونکہ اسلام نے اہل حاجت کی حاجت روائی کے لئے زکوٰۃ کا ایک پورا نظام دیا ہے اور خمس غنیمت میں بھی ان کا خاص ذکر ہے اور یہ دونوں ہی ذرائع آمدنی عہد فاروقی میں کافی ووافر تھے اس لئے خراج ، جزیہ، عشور وغیرہ سے ہونے والی آمدنی کو عام فلاح وبہبود اور معاش ومعیشت کی ترقی میں ترجیحی طور پر صرف کیا جاتا تھا۔ پبلک ورک یا نظارت نافعہ کے عنوان سے مولانا نے اس سلسلہ میں ہونے والے کاموں کو گنایا ہے۔ مثلاً سینچائی اور آب رسانی کے لئے متعدد اہم نہروں کی تعمیر، سڑکوں اور پلوں کی فراہمی ، بندرگاہ کا قیام ، مساجد، فوجی قلعے اور چھاؤنیاں، سرائے ، عدالتیں، مدارس اور شہروں کی تعمیرات وغیرہ۔ غرضیکہ ایک فلاحی ریاست کیلئے جو بھی چیزیں درکار تھیں ان پر اموال مصالح خرچ کئے گئے۔[۳۶]

معاشی فروغ کیلئے کوششیں:

''الفاروق'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو فرد اور ریاست کے معاشی استحکام کی بڑی فکر تھی اور اس کیلئے زبانی ہدایات کے علاوہ عملی اقدامات بھی کئے ۔آپ نے عطایا بھی جاری کئے لیکن بقول مولانا شبلی نعمانی ''وہ اس بات کی سخت کوشش کرتے تھے کہ لوگوں میں کاہلی اور مفت خوری کا مادہ نہ پیدا ہونے پائے، جن لوگوں کی تنخواہیں اور خوراک مقرر کی تھیں وہ صرف وہ لوگ تھے جن سے کبھی نہ کبھی فوجی خدمت کی توقع ہو سکتی تھی یا جنہوں نے پہلے کوئی نمایاں خدمت کی تھی یا وہ ضعیف جو بیماری کی وجہ سے خود کسب معاش نہیں کر سکتے تھے''[۳۷] وہ گداگری کے سخت مخالف تھے۔ مولانا نے محدث ابن جوزی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک سائل حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو اس کی جھولی آٹے سے بھری ہوئی تھی ، چھین کر اونٹوں کے آگے ڈال دی اور فرمایا کہ اب جو مانگنا ہے مانگ''[۳۸] حضرت عمرؓ جب کسی کو بظاہر خوشحال دیکھتے تو اس کے پیشہ کے بارے

میں دریافت کرتے اور جب معلوم ہوتا کہ وہ کچھ کرتا دھرتا نہیں تو آپ کی نظروں سے گھر جاتا۔[۳۹] آپ کا کہنا تھا کہ ذلیل پیشہ بھی دست سوال دراز کرنے سے بہتر ہے۔ انہوں نے علماء تک سے کہا کہ مسلمانوں پر اپنا بار نہ ڈالو۔[۴۰] عام طور پر لوگ اپنے مال کی سرمایہ کاری سے غافل نہیں ہوتے لیکن اپنی دیکھ بھال میں پڑے دوسروں کے مال کی طرف شاید یہ توجہ نہیں ہوتی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی طرف توجہ دلائی اور اپنی تحویل میں موجود یتیم کے مال کو سرمایہ کاری کے لئے دیا تاکہ یوں ہی بے کار پڑا رہنے اور ہر سال زکوٰۃ نکالنے سے سطح نصاب سے نیچے نہ پہنچ جائے۔[۴۱] حضرت عمرؓ کے اس اسوہ میں بڑی نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو مال کو یوں ہی روک رکھتے ہیں اور اس میں اضافہ کی فکر نہیں کرتے۔

ریاست کی معاشی ترقی کیلئے حضرت عمرؓ نے کئی تدابیر کیں۔ اس عہد میں زراعت ہی سب سے اہم ثروت تھی۔ اس کے فروغ کے لئے پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ اس شعبہ کو عربوں سے دور رکھا کہ وہ اس پیشہ سے اچھی طرح واقف نہیں تھے اور مفتوحہ زمینوں کو ان کے سابق مالکوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ سابق مالکوں سے ہماری مراد ہے عام رعایا جو کہ بذات خود کاشتکاری کرتے تھے نہ کہ امراء ورؤساء جو ان کا استحصال کرتے تھے۔ اسی طرح ایک طرف زمین کی تقسیم نو (Redistribution) کی، دوسری طرف براہ راست فلاحین (کاشتکاروں) سے معاملہ کر کے انکے انہماک اور کارکردگی کو مہمیز کیا۔ پھر بہت سی نہروں کو تعمیر کیا جس سے آبپاشی وآب رسانی میں آسانی ہوئی اور پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ زراعت کے فروغ کے لئے خراج کی شرح کو کم رکھا اور وصولی میں ہر طرح کی آسانی فراہم کی، یہی وجہ ہے کہ جتنا خراج انکے عہد میں وصول ہوا اتنا نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کسی دور میں ہوا۔[۴۲]

اس دور میں معاش کا دوسرا اہم شعبہ تجارت کا تھا۔ اس کی ترقی کے لئے آپ نے سڑکیں اور پل تعمیر کرائے اور بعض ان نہروں کی تعمیر کرائی جو جہاز رانی کے

کام بھی آتی تھیں۔ اور اس کیلئے ہر طرح کی ترغیب وتشویق (Incentive) سے کام لیا۔ جوابی کارروائی کے طور پر آپ نے عشور (Custom Duty) کو عاید کیا لیکن اس سلسلہ بڑی تاکید کی کہ ایک مال پر دوبار محصول نہ وصول کیا جائے [۴۳] اس سے آپ کے عہد میں تجارت کو بھی کافی فروغ ہوا۔ البتہ صنعت کی ترقی سے متعلق ''الفاروق'' میں کوئی قابل ذکر تفصیل موجود نہیں ہے۔

نظام احتساب:

معیشت کو پاک صاف اور ترقی پر گامزن رکھنے کیلئے حسبہ یا احتساب کا نظام ناگزیر ہے، رسول اللہ ﷺ خود اس کام کو انجام دیتے تھے، خلافت کی توسیع اور کاموں کی کثرت کی وجہ سے احتساب کا باقاعدہ نظام قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، مولانا نے کنزالعمال کے حوالہ سے ابن سعد کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے بازار کی نگرانی کیلئے عبد اللہ بن عتبہ کو مقرر کیا تھا اور آپ کا یہ فعل عہدۂ احتساب کا ماٴخذ ہے۔ [۴۴] مولانا کے مطابق ''جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا اس کے پاس جس قدر مال اور اسباب ہوتا تھا اس کی مفصل فہرست تیار کرا کر محفوظ رکھی جاتی تھی اور عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا''۔ [۴۵] حضرت عمرؓ کا عہد اس طرح کی داروگیر اور مؤاخذۂ واحتساب کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فتوحات کی وجہ سے دولت کی ریل پیل کے باوجود نظام حکومت میں کہیں کوئی رخنہ نہیں پیدا ہوا۔

سکہ کا اجرا اور زر کی کیفیت:

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے درہم ودینار اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے جاری کئے ۔مولانا نے علامہ مقریزی کی کتاب النقود الاسلامیہ اور الماوردی کی الاحکام السلطانیہ کے حوالہ سے لکھا ہے اسکے آغاز کا سہرا بھی حضرت عمرؓ کے سر ہے۔ [۴۶] بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اونٹ کی کھال کے سکے جاری کرنے کے بارے میں بھی خیال ظاہر کیا تھا مگر اس

اندیشہ سے کہ اونٹ فنا نہ ہو جائیں اس ارادہ کو ترک کر دیا۔[۴۷] مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اگرچہ معاشرت نہایت ارزاں اور روپیہ گراں تھا، تنخواہیں علی قدر مراتب عموماً بیش قرار تھیں''۔[۴۸] روپیہ کی گرانی یا قلت کی شکل میں معاشرت کی ارزانی یا قیمتوں میں کمی ایک بہت اہم معاشی نکتہ ہے جس کو معاشیات زر میں نظریہ مقدار زر یا Quantity Qeory of Money سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن اس شکل میں بیش قرار تنخواہیں بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ شاید اسی لئے ''علی قدر مراتب'' کی قید لگا کر اسے بعض مصلحتوں کے پیش نظر چند لوگوں تک محدود کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ بیان اس مشہور اثر سے متصادم ہے جس میں کہا گیا ہے درہم و دینار کے ارزاں ہونے اور اونٹوں کے گراں ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے خونبہا کی رقم کو اور بڑھا دیا۔[۴۹]

شورائی معیشت یا معاشی جمہوریت:

''الفاروق'' کے معاشی مباحث سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ خلافت فاروقی صحیح معنوں میں شورائی معیشت پر قائم تھی اور ہر طرف معاشی جمہوریت کی کارفرمائی تھی۔ شورائی معیشت یا معاشی جمہوریت سے ہماری مراد ایسا معاشی نظام ہے جس میں معاشی امور باہم مشورے سے طے ہوتے ہوں اور ترقی کے مواقع اور نتائج سے سبھی بہرہ مند ہوتے ہوں۔ کوئی نظام خواہ کتنا ہی ظالمانہ ہو لیکن اس میں کچھ نہ کچھ لوگوں کو پھلنے پھولنے اور عیش و عشرت کے مواقع مل ہی جاتے ہیں گرچہ عامۃ الناس ظلم واستحصال کی چکی میں پستے ہوں۔ معاشی جمہوریت کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں کچھ مخصوص لوگوں کے ٹھاٹھ باٹ کے بجائے جو بھی وسائل و مواقع ہیں اس میں سب شریک ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے شورائی معیشت کا نظام قائم کیا، مفتوحہ زمینوں کی تقسیم یا اس پر خراج کا مسئلہ ہو،[۵۰] بحرین سے آیا ہوا مال تقسیم ہوتا ہو،[۵۱] خود اپنے مصارف طے کرنے ہوں،[۵۲] یا بیت المال سے کوئی چیز لینے کی ضرورت ہو،[۵۳] ہر موقع پر آپ

نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ اسی طرح عراق ومصر کی زمینوں کے بندوبست میں وہاں کے اہل رائے سے استصواب کیا۔[۵۴] جب وہاں سے خراج وصول ہوکر آتا تو وہاں کے دس دس آدمیوں کو بلا کر تحقیق کراتے کہ اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔[۵۵] پیدا ہونے والے ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کیا۔[۵۶] بیت المال سے اہل حاجت کی مدد کرنے میں مسلم وذمی کے درمیان فرق نہیں کیا۔[۵۷] اسی کے ساتھ گداگری اور مفت خوری کی دل شکنی بھی کی ہے۔[۵۸] قحط کے زمانہ میں دوسرے مقامات سے فاضل غلہ جات منگوا کر سب کی ضرورتیں پوری کیں۔[۵۹] اس دوران خود لذیذ چیزیں کھانا ترک کر دیں کہ عام لوگوں کو یہ دستیاب نہیں تھیں۔[۶۰] جمہوریت، سوشلزم اور مساوات کے دعوے داروں کو اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیئے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''الفاروق'' میں دور فاروقی کے معاشی خدوخال نمایاں کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بحثیں بہت مختصر اور بعض سرے سے غائب ہیں۔ کتاب کے معاشی مباحث پڑھنے کے بعد بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ عہد فاروقی کی معاشی تاریخ کا مکمل اور جامع مطالعہ ہو۔[۶۱] کیونکہ یہ مطالعہ اسلامی معاشی فکر کے استنباط اور نظریہ سازی کیلئے بہت ممدومعاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆

حواشی وتعلیقات

۱۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ''الفاروق'' پر منعقدہ سیمینار نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کردیا ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالات کی روشنی میں ''الفاروق'' کا ایک ایسا ایڈیشن مرتب کیا جائے جس میں کتاب کے اصل متن وحواشی کو برقرار رکھتے ہوئے ضروری ومناسب اضافے کئے جائیں کیونکہ نشر واشاعت کی ترقی کی وجہ سے ادھر سو سال میں بہت سے قابل قدر مراجع آسانی سے دستیاب ہوگئے ہیں جو پہلے کسی دسترس سے باہر تھے۔

۲۔ علامہ اقبال اپنی کتاب ''علم الاقتصاد'' کے دیباچۂ مصنف میں رقم طراز ہیں:۔
''مخدوم ومکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی''
اقبال، محمد، علم الاقتصاد، صفحہ: ۷

۳۔ نعمانی، شبلی، ''الفاروق'' جلد دوم، صفحہ: ۲۲۸

۴۔ ایضاً صفحہ ۵۹

۵۔ ایضاً صفحہ ۶۰

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً صفحہ ۶۱

۹۔ ایضاً صفحہ ۱۱۷

۱۰۔ ایضاً صفحہ ۱۵۸

۱۱۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۹۷۹، ص: ۴۲

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً صفحہ ۴۶

۱۴۔ نعمانی، شبلی، الفاروق، ص: ۳۰

۱۵۔ ایضاً صفحہ ۲۳

۱۶۔ ایضاً صفحہ ۲۴

۱۷۔ ایضاً ص: ۴۶

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً صفحہ ۴۷

۲۰۔ ایضاً صفحہ ۱۳۵

۲۱۔ ایضاً صفحہ ۱۹۱

۲۲۔ ایضاً ص: ۳۲۔۴۲

۲۳۔ ایضاً ص: ۴۲۔۴۳

۲۴۔ ایضاً ص: ۳۶

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً صفحات ۳۸، ۴۳، ۱۲۳ وغیرہ

۲۷۔ ابن خلدون، المقدمہ، بدون مکان، دار الفکر، بدون تاریخ، ص: ۲۲۱

۲۸۔ نعمانی، شبلی، الفاروق ص: ۴۵۔۴۶۔

۲۹۔ ابو یوسف، کتاب الخراج ص: ۵۰

۳۰۔ ایضاً ص: ۴۸

۳۱۔ نعمانی، شبلی، الفاروق، ص: ۱۲۸، ۱۶۰

۳۲۔ الکاسانی، علاؤ الدین، بدائع الصنائع، بیروت، شرکۃ المطبوعات العلمیہ ۱۹۷۹ جلد ۲، ص: ۴۵

۳۳۔ نعمانی، شبلی، الفاروق، ص: ۱۹۹۔۲۰۰

۳۴۔ ایضاً ص:۲۰۱۔۲۰۲

۳۵۔ ایضاً صفحات:۲۰۴۔۲۰۹

۳۶۔ ایضاً صفحات۶۲۔۶۶

۳۷۔ ایضاً صفحات:۱۶۱۔۱۶۲

۳۸۔ ایضاً ص:۱۶۲

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ ایضاً ص:۱۶۰۔۱۶۱

۴۲۔ ایضاً صفحات،۳۶۔۳۷

۴۳۔ ایضاً ص:۴۷

۴۴۔ ایضاً ص:۵۸

۴۵۔ ایضاً ص:۲۵

۴۶۔ ایضاً ص:۱۱۸۔۱۱۹

۴۷۔ البلاذری، فتوح البلدان، تحقیق رضوان محمد رضوان، بیروت، دار الکتاب العلمیہ، ۱۹۸۳،ص:۴۵۶

۴۸۔ نعمانی، شبلی، الفاروق ص:۳۰

۴۹۔ ابن حنبل، احمد، مسند۔ بیروت، دار الفکر، بدون تاریخ، مجلد۵ ص:۳۲۷

۵۰۔ نعمانی، شبلی، الفاروق ص:۳۴۔۳۵۔۴۳

۵۱۔ ایضاً، ص:۵۹

۵۲۔ ایضاً ص:۱۵۷، ۲۳۸۔۲۳۷

۵۳۔ ایضاً ص:۱۵۷

۵۴۔ ایضاً ص:۳۳

۵۵۔ ایضاً ص:۳۶، ۱۲۳

۵۶۔ ایضاً ص:۱۶۴

۵۷۔ ایضاً ص:۱۲۷

۵۸۔ ایضاً ص:۱۶۲

۵۹۔ ایضاً ص:۱۶۱

۶۰۔ ایضاً ص:۱۶۵

۶۱۔ عرفان محمود رانا نے ''Eccnomic System under Upmar the great'' کے عنوان سے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب پیش کی ہے جس میں انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کی کتاب پر کافی انحصار کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں تو شبلی جیسی جامعیت ہے اور نہ ان سبھی پہلوؤں کا احاطہ ہے جن کا تعلق معاشی مباحث سے ہے۔ کتاب کا ناشر ہے شیخ محمد اشرف، لاہور، طبع ثانی ۱۹۹۱ صفحات:۱۵۲۔

☆☆☆

'الفاروق' کی بعض ادبی خصوصیات

سید علیم اشرف جائسی

تاریخ کی کتاب میں ادبی خصوصیات ومحاسن کی تلاش بالکل ویسا ہی عمل ہے جیسا کسی ادبی تصنیف میں تاریخی احداث ووقائع کی جستجو کی جائے۔ اور وہ بھی حضرت فاروق اعظم کی سوانح پر مشتمل کسی کتاب میں جہاں واقعات ومہمات کی کثرت، اور معارک واحداث کا ازدھام وتسلسل مصنف کے قلم کو دم مارنے کی گنجائش نہیں دیتا، انشا نگاری کا امکان اور بھی کم ہوجاتا ہے، یہ عام قاعدہ ہے، لیکن عبقریت عام قاعدوں کی پابند نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے قواعد واصول خود وضع کرتی ہے، جہاں عام قلم موضوع کی تنگنائی کا شکار ہوجاتا ہے، وہاں یہ نئے آفاق تلاش کرتی ہے، سنگلاخ زمینوں سے لطافت کے چشمے نکالتی ہے اور بے آب وگیاہ ریگستانوں میں بھی قوت تخیل اور شوکت بیان سے دل آویز نخلستان تعمیر کرتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی (1857ء۔18 نومبر 1912ء) کی کتاب الفاروق اس ضمن میں ایک روشن نام ہے، کتاب پر ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کی تازگی و شگفتگی پر امتداد زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔

الفاروق کی تاریخی قدر وقیمت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اور بلا شبہ یہ اردو میں جدید معیار تحقیق اور انداز ترتیب پر لکھی جانے والی اولین سوانح عمریوں میں سے ایک ہے بلکہ اردو زبان میں اس معیار وانداز کا سہرا بھی شبلی کے سر ہی ہے جنہوں نے المامون اور النعمان کی تصنیف کے ساتھ اس رسم وراہ کی بنیاد ڈالی، لیکن الفاروق کی شہرت قبولیت اور عالمگیریت کے پس پشت جو عامل کارفرما ہے وہ صرف تحقیق وتالیف کا اعلیٰ معیار اور جدید تاریخی اسلوب ومنہج نہیں ہے.......... تاریخ کی کتابوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تاریخ کے طلبہ کے لئے لکھی جاتی ہیں یا کتب خانوں کی زینت کیلئے، ادبی چاشنی اور تفنن کی کثرت بھی کسی تاریخی کتاب کو دیرپا شہرت اور آفاقیت سے ہمکنار نہیں کرسکتی کیونکہ عموما یہ تاریخ نویسی

کے بنیادی تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتی ہیں، پہلی قسم کی کتابوں میں ٹوائن بی سے لیکر پروفیسر خلیق احمد نظامی تک کی کتابوں کو پیش کیا جا سکتا ہے، دوسری قسم کی کتابوں میں عقاد اور طٰہٰ حسین کی تاریخ نما کتابوں کا شمار ہو سکتا ہے، الفاروق ان دونوں قسموں سے منفرد اور ممتاز ہے اور یہی امتیاز وانفرادیت اس کی قبولیت عام اور شہرت دوام کا سبب ہے۔

شبلی نعمانی نے اپنی تاریخی کتابوں بالخصوص الفاروق میں مغربی اور جدید معیار بحث وتحقیق کا تو استعمال کیا لیکن تحریر میں اس کی اتباع نہیں کی اور اس کے بجائے ایک ایسا معتدل اسلوب بیان اختیار کیا جو نہ خالص علمی ہے اور نہ نرا ادبی بلکہ اس کے لئے انہوں نے ایک ایسا طرز تحریر اختیار کیا جسے ہم علمی۔ ادبی یا علمی متادب اسلوب کہہ سکتے ہیں، اور اصول بحث وتحقیق اور زبان وبیان کے درمیان انہوں نے ایک ایسا توازن قائم کیا کہ ان میں کوئی دوسرے کے حدود حرم میں داخل نہ ہونے پائے، یہی معتدل امتزاج الفاروق کی عظمت کا سبب ہے، اور اسی منبع سے اس کی شہرت، قبولیت، دوام اور آفاقیت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

خود شبلی کو بھی اپنی اس تصنیف پر بڑا ناز تھا، جب مصری ادیب ومؤرخ رفیق بک عظیم نے اپنے سلسلہ کتب ''مشاہیر اسلام'' میں فاروق اعظم کی سوانح لکھی تو شبلی نے اسے پڑھ کر مولانا حمید الدین فراہی کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''آج کل مصر میں سیرۃ الفاروق لکھی گئی، بڑا اہتمام کیا گیا، مشہور مصنف نے لکھا، لیکن دیکھا تو الفاروق کے عشر عشیر نہ تھی'' [۱]

اور بعید نہیں کہ یہ سلسلہ شبلی کے سلسلے ''ہیروز آف اسلام'' کے عالمی اثر اندازی کا ہی نتیجہ ہو، ایک دوسری جگہ شبلی صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

> ''میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں'' [۲]

سلیقے کی نثر:

الفاروق کے ادبی محاسن کو انشاء پردازی نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ دونوں میں وہی فرق ہے جو آمد اور آورد میں ہوتا ہے یا جو فرق سلیقہ اور تکلف میں ہوتا ہے اگر شبلی نے الفاروق

کے تاریخی مواد کو جمع کرنے کیلئے مصر، ترکی، شام، اور فلسطین وغیرہ ممالک کے دورے کیے تو اپنے طرز تحریر اور اسلوب بیان کی جستجو میں عالم فکر وخیال کی شاہراہوں پر طویل مسافتیں طے کی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے تاریخ میں ادب کی دلکشی اور رعنائی اور ادب میں تاریخ کی شان وشوکت سمودی ہے۔

شبلی کے اس وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سر سید احمد خاں لکھتے ہیں: ''...... اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی حالت پر موجود ہے'' .... ''یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا''۔[۳]

شبلی کو اس بات کا پورا شعور تھا کہ ''تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں بالکل جدا ہیں'' الفاروق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

''مؤرخ کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے''۔[۴]

لیکن یہ سادگی اگر آمدو برجستگی اور سلیقے سے پرکار ہوتی ہے تو معیوب نہیں ہے معیوب وہ انشاء پردازی ہے جس میں آورد وتکلف ہو، لیکن شبلی کی یہ پرکاری اور بلند آہنگی بہتوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے اور یہ لوگ اسے تکلف وانشاء پردازی پر محمول کر کے اسے تاریخ نویسی کے تقاضوں کے منافی قرار دے دیتے ہیں، ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں کہ:

''شبلی کی نثر میں تخیل نے جو لالہ وگل کھلائے ہیں ان سے ان کی نثر کی شان میں بڑا اضافہ ہوا ہے مگر ان کی تاریخ نگاری کو اس سے بہت نقصان ہوا ہے''۔[۵]

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ''لالہ وگل'' شبلی کے سلیقے نے کھلائے ہیں تخیل نے نہیں ورنہ الفاروق میں کئی ایسے مقامات ہیں جہاں ان کے اشہب تخیل کے لئے وسیع جولانگاہ تھی

لیکن وہ بڑی سادگی اور اختصار کے ساتھ وہاں سے گزر گئے ہیں، حضرت عمر کے اسلام لانے کا واقعہ اس سلسلے میں مثال کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔اور لطف یہ ہے کہ ڈاکٹر موصوف اپنے اسی مضمون میں شبلی کے سلیقے کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''مولانا شبلی کے یہاں حسن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے..............آزاد کے یہاں یہ چیز کوشش ،تکلف اور اہتمام سے پیدا کی گئی ہے مگر شبلی کی عبارتوں میں مدعا اور مضمون کے اقتضاء سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے..........''[۶]

منطقی طرز استدلال:

شبلی کے نثر کی ایک خصوصیت انکا منطقی طرز استدلال ہے جو ان کی تحریر کو وزنی اور باوقار بناتا ہے، معقولیت کی یہ میراث انہیں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے ملی جن سے انہوں نے منطق وفلسفے کی تعلیم پائی۔

یہ منطقی طرز استدلال ایک طرف ان کے خطیبانہ انداز اور شاعرانہ طبیعت کو حد اعتدال سے گزرنے نہیں دیتا اور دوسری طرف قاری کو اپنے حصار میں باندھے رہتا ہے، الفاروق میں چونکہ قدم قدم پر صاحب سوانح کے مادحین وقادحین کے نقطہائے نظر میں اختلاف ملتا ہے لہذا اس کتاب میں شبلی کے نثر کی یہ خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے، چنانچہ واقعہ قرطاس[۷] اور سقیفۂ بنو ساعدہ[۸] کے احوال کا بیان ہو یا حضرت خالد کی معزولی سے متعلق تاریخی غلطیوں کا ذکر[۹] ہو، ذمیوں کے حقوق اور جزیہ پر مستشرقین اور اہل مغرب کے اعتراضات کا جواب مقصود ہو[۱۰] یا شہر بانو سے متعلق زمخشری کی روایت کی تردید مطلوب ہو[۱۱] ہر جگہ انکا منطقی طرز استدلال چھایا نظر آتا ہے اور انکا معقولاتی اسلوب استنباط قاری کے ذہن کے تمام شکوک وشبہات دور کرتا چلا جاتا ہے۔

مفتون احمد کے بقول:

''مولانا شبلی کا اسلوب ایک منطقی طرز کا حامل ہے، وہ سبب اور نتیجے کا خیال رکھتا ہے جس سے انکار کرنا آسان نہیں وہ تاریخ کی کتابوں کے

لئے خاص طور پر موزوں ہے"۔[۱۲]

سلاست و شگفتگی:

الفاروق تاریخ جیسے خشک موضوع پر ہے لیکن اس کے باوجود سلاست و روانی کا یہ عالم ہے کہ گویا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جارہا ہے اور بارہا یہ روانی اپنے آخری حدود پر پہنچ کر برجستگی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے حضرت عمر کے سفر بیت المقدس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ناظرین کو انتظار ہوگا کہ فاروق اعظم کا سفر، اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا کس سروسامان سے ہوگا؟ لیکن یہاں نقارہ ونوبت، حذم وحشم، لاؤلشکر ایک طرف معمولی ڈیرہ خیمہ تک نہ تھا، سواری میں گھوڑا تھا اور چند مہاجرین وانصار ساتھ تھے تاہم جہاں یہ آواز پہنچتی تھی کہ فاروق اعظم نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے زمین دہل جاتی تھی"۔[۱۳]

قارئین کی جگہ ناظرین کا استعمال خاص معنویت رکھتا ہے گویا ان کا قاری ان تاریخی احوال وحوادث کو پڑھ ہی نہیں رہا ہے بلکہ ان کا مشاہدہ بھی کر رہا ہے، حضرت عمر کی سادگی وتواضع کے بیان میں ان کے طرز تحریر کی سادگی اور پرکاری کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"ان کی عظمت وشان کے تاج پر سادگی کا طرہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے، ان کی زندگی کی تصویر کا ایک رخ یہ ہے کہ روم وشام پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر وکسریٰ کے سفیروں سے معاملہ پیش ہے، خالد وامیر معاویہ سے باز پرس ہے، سعد بن ابی وقاص، ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص کے نام احکام لکھے جارہے ہیں، دوسرا رخ یہ ہے کہ بدن پر بارہ پیوند کا کرتا ہے، سر پہ پھٹا عمامہ ہے، پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں، پھر اس حالت میں یا تو کاندھے پر مشک لئے جارہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنا ہے یا مسجد کے گوشے میں فرش خاک پر لیٹے ہیں اس لئے کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور نیند کی جھپکی سی آگئی ہے۔"[۱۴]

منطقی طرز استدلال کہیں کہیں اس سلاست وروانی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے مگر عموماً ان کا طرز بیان اتنا سادہ ہے کہ بقول سید ناصر حسین نقوی:

''تھوڑی سی مشق کے بعد ویسی ہی عبارت لکھی جا سکتی ہے''۔[15]

فاروق اعظم کا جاہ وجلال انکے سوانح نگار کو اپنی شگفتگی کے اظہار کا بہت کم موقع دیتا ہے لیکن شبلی کا قلم یہاں بھی اپنے لئے راہیں ہموار کر لیتا ہے، شہنشاہ ایران کی بیٹی شہر بانو کی گرفتاری اور حضرت علی کے ذریعے انہیں امام حسین کو دئے جانے والے مشہور واقع کے رد میں مولانا نے بہت سے عقلی ونقلی دلائل دئے ہیں، اسی سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

''اس کے علاوہ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کی عمر ۱۲ر برس کی تھی کیونکہ جناب ممدوح ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے، اور فارس ۱۷ھ میں فتح ہوا، اس لئے یہ امر مستبعد ہے کہ حضرت نے ان کی نابالغی میں ان پر اس قسم کی عنایت کی ہوگی''۔[16]

تشبیہ واستعارات:

الفاروق میں شبلی نے تشبیہ واستعارات کا خوب خوب استعمال کیا ہے، اس نے ان کی تاریخ نگاری پر کیا اثرات مرتب کئے یہ میرا موضوع نہیں ہے البتہ ان کی تحریر میں غیر معمولی دلکشی اور دل آویزی پیدا ہوگئی ہے، تشبیہ کی مثال:

''مسلمان سیلاب کی طرح بڑھتے چلے گئے اور تیراندازوں کو خس وخاشاک کی طرح ہٹاتے پار نکل گئے''

ان کے خوبصورت استعاروں میں سے بھی صرف ایک نمونے پر اکتفاء کرتا ہوں:

''ان کی عظمت وشان کے تاج پر سادگی کا طرہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے''

احساس تفوق وبرتری کا اثر ان کے اسلوب پر:

شبلی کی شگفتگی ان کی نثر کو متانت ووقار کے اس اعلیٰ معیار سے نیچے نہیں آنے دیتی

جسے شبلی کے احساس عظمت وفضیلت نے قائم کیا تھا، اس احساس عظمت و برتری نے ان کی شخصیت کی طرح ان کی زبان و بیان اور اسلوب کو بھی متاثر کیا تھا، ان کا یہی داخلی احساس تھا جس نے انہیں خاص طور سے عظمائے اسلام کی سوانح لکھنے کی طرف متوجہ کیا، ان کے اس احساس کی تشکیل تین عناصر سے ہوتی ہے:

۱۔ خاندانی پس منظر اور نسلی اثرات،

۲۔ معاصرین کی علمی کم مائیگی۔ جسے وہ ''قوم کی بدمذاقی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور الفاروق میں جابجا اس کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں،

۳۔ شخصیت کی جامعیت۔ شبلی جدید وقدیم کے جامع تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ نہ تو اپنے عصر کے سب سے بڑے معقولی یا منقولی عالم تھے نہ وہ شعر وادب میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے نہ عصری آگہی اور اصلاح وارشاد میں انہیں امامت کا درجہ حاصل تھا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ مجموعی طور پر یہ تمام صفات جس طرح اور جس درجے کی ان کی ذات میں جمع تھیں دوسری کسی بھی معاصر شخصیت میں نہ تھیں۔

اس احساس عظمت نے ان کے اسلوب بیان کو اگر ایک طرف متانت سنجیدگی اور وقار عطا کیا تو دوسری طرف اس میں خطیبانہ اور مدرسانہ عناصر بھی داخل کر دیئے جو بسا اوقات طبع پر سخت گراں گزرتے ہیں۔ الفاروق سے اس کے بعض نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ''پہلے حصہ میں تم فتوحات کی تفصیل پڑھ آئے ہو''[۱۷]

۲۔ ''شاید تم کو خیال ہو''[۱۸]

۳۔ ''حضرت عمر کے الفاظ پر غور کرو''[۱۹]

۴۔ ''تم نے اکثر پڑھا ہوگا''[۲۰]

۵۔ ''ان مثالوں سے تم خود اندازہ لگا سکتے ہو''[۲۱]

۶۔ ''تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہو''[۲۲]

اس احساس تفوق و برتری نے کہیں کہیں استعلائی اسلوب کا رنگ اختیار کر لیا ہے، چند نمونے بطور مشتے از خروارے:

۱۔ ''حضرت عمر کے سوانح و حالات تفصیل کے ساتھ اور اس صحت کے ساتھ لکھے جا چکے جو تاریخی تصنیف کی صحت کی آخری حد ہے'' [۲۳]

۲۔ ''اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جو نقص قدیم تاریخوں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں، ان کی آج یہاں کہاں تک تلافی کی جا سکتی ہے'' [۲۴]

۳۔ ''یہ امر بھی جتا دینا ضرور ہے کہ............'' [۲۵]

۴۔ ''لیکن میں بے باکانہ اس راز کی پردہ دری کرتا ہوں'' [۲۶]

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف معلیانہ اسلوب ہے ورنہ بات میں سرے سے کوئی راز ہے ہی نہیں۔

۵۔ وفات رسول ﷺ کے وقت حضرت عمر پر وہ وارفتگی طاری تھی کہ وہ آپ ﷺ کو متوفی کہنے والوں کو قتل کی دھمکی دینے لگے تھے، مگر علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ:

''لیکن قرائن اس رویت کی تصدیق نہیں کرتے'' [۲۷]

جبکہ یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے، اور ''قرائن'' کے بجائے جو اکلوتا قرینہ انہوں نے ذکر کیا ہے وہ اتنا کمزور ہے کہ اس کی تردید کے لئے کسی قرینے کی ضرورت ہی نہیں ہے بداہت ہی کافی ہے۔

لیکن بایں ہمہ اس احساس برتری کے بعض مثبت پہلو بھی ہیں یہ انکی تحریر کو ایسا وقار بخشتا ہے اور اس میں ایسی ثقاہت اور ایسا اعتماد پیدا کرتا ہے جس کا اثر قارئین پر ان کے منطقی طرز استدلال سے کم نہیں پڑتا، بلکہ اکثر انکا قاری مرعوب ہی نہیں مبہوت ہو جاتا ہے، الفاروق کے دوسرے حصے کی ابتدایوں کرتے ہیں:

''پہلے حصے میں تم فتوحات کی تفصیل پڑھ آئے ہو اس سے تمہارے دل پر اس عہد کے مسلمانوں کے جوش ہمت، عزم و استقلال کا قوی اثر پیدا ہوا ہوگا لیکن اسلاف کی داستان سننے میں تم نے اس کی پرواہ نہ کی ہوگی کہ واقعات کو فلسفۂ تاریخ کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن ایک نکتہ سنج مؤرخ کے دل میں فوراً یہ سوالات پیدا ہونگے کہ چند صحرا نشینوں نے

کیوں کر فارس وروم کا دفتر الٹ دیا''۔[۲۸]

جوش بیان ان کی تحریر کا نمایاں وصف ہے، وہ بھی اسی احساس کی عطا ہے، اسلاف کے کارناموں کے بیان اور معترضین کے جواب میں ان کی تحریر کا وصف پوری آب وتاب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے چونکہ الفاروق میں اس کی بڑی گنجائش تھی لہذا یہ خاصیت کتاب میں جا بجا نظر آتی ہے۔ مثال کی چنداں ضرورت نہیں۔

اس احساس کی ایک اور دین ان کے زبان وبیان کی متانت اور سنجیدگی ہے، ان کے عہد میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کے اثر سے جدید نثر کی بنا پڑ رہی تھی، سلاست، سادگی اور عام بول چال کی زبان کا استعمال اس نثر کی بنیادی خصوصیات تھیں لیکن اس دروازے سے لوگوں کی تحریروں میں عامیت، سوقیت اور ابتذال بھی داخل ہو گئے تھے، آزاد ہوں حالی ہوں یا نذیر احمد ہوں حتی کہ خود سرسید کی تحریریں اس سے خالی نہیں ہیں، ان حضرات کی مختصر ترین تحریروں میں بھی کہیں نہ کہیں بازاری الفاظ وفقرے درآئے ہیں لیکن شبلی اور صرف شبلی اس انفرادیت کے حامل ہیں کہ ان کے یہاں یہ معایب بالکل نہیں ملتے، تقریبا پانچ سو صفحے کی کتاب الفاروق میں ایک بھی ایسا مقام نہیں ہے، جس میں ابتذال یا بازاریت کا کوئی شائبہ ہو۔

اسی احساس تفوق نے ان کی تحریروں میں ظرافت کے عنصر کو ختم کر دیا ہے چنانچہ الفاروق میں ایک جگہ لطیفہ کا عنوان ڈالا ہے لیکن معنون لہ پر کسی طرح بھی لطیفے کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

ایجاز بیانی:

ادبی نقطۂ نظر سے الفاروق کا ایک اور خاص وصف اس کا ایجاز واختصار ہے۔ شبلی نے حصہ اول میں ۱۶۵ عنوانوں اور حصہ دوم میں ۳۱۹ عنوانوں پر مشتمل فاروق اعظم کی سیرت وسوانح کو بیان کیا ہے۔ اور کسی گوشے کو تاریک وتشنہ نہیں چھوڑا ہے، لیکن بایں ہمہ کتاب کا حجم ان کی ایجاز بیانی کا شاہکار ہے جبکہ کتاب میں جگہ جگہ ایسے مواقع دستیاب ہیں جہاں تطویل واطناب کے غیر معمولی امکانات ہیں حتی کہ وہ اپنے جوش بیان میں بھی اپنے اس وصف سے

دست بردار نہیں ہوتے ہیں۔

بیت المقدس میں حضرت عمر کے دخول کا تذکرہ ہو یا ان کے اسلام لانے کا بیان ہو یہ واقعے اطناب وتفصیل کی بڑی گنجائش رکھتے ہیں مگر وہ انہیں انتہائی مختصر پیرائے میں ذکر کرتے ہیں، اس ضمن میں وہ عرب کے مشہور ادیب جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ/۸۶۹ء) کی اتباع کرتے نظر آتے ہیں جس کے وہ بڑے مداح اور ثنا خواں تھے۔

دوسری زبانوں کے الفاظ وتراکیب:

شبلی نے الفاروق میں جابجا عربی وفارسی کے الفاظ وتراکیب کا استعمال کیا ہے، یہاں مراد وہ الفاظ وتراکیب ہیں جو اردو میں کم مانوس یا غیر مانوس ہیں، بلاشبہ اس کا سبب ان کی ثقافت اور انکا علمی پس منظر ہے، مثلاً فرماتے ہیں کہ:

۱۔ ''جو آنکھیں فاروق اعظم کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں''۔[۲۹]

۲۔ ''مجلس شوریٰ کا انعقاد، اور اہل الرائے کی مشورت استحسان وتبرع کے طور پر نہ تھی''۔[۳۰]

کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے، مگر حالی کی طرح ان کی کثرت سے اپنے اسلوب کو بوجھل نہیں کیا ہے، پولیٹکل، پالیٹکس، ممبر، کمیشن، پبلک ورک، فیوڈل سسٹم، والنٹیئر، اور سوشلزم وغیرہ الفاظ الفاروق میں متعدد جگہ وارد ہوئے ہیں، عربی وفارسی کے غیر مانوس الفاظ کے آزادانہ استعمال کے ساتھ ساتھ بعض عربی الفاظ وتراکیب کا ترجمہ بھی کردیا ہے اور بسا اوقات یہ ترجمہ اپنی اصل سے زیادہ غیر مانوس اور ثقیل ہوگیا ہے، جیسے ''سلسلۃ الذہب'' کی جگہ بعض مقام پر زنجیر زر لکھ دیا ہے۔

مبالغہ اور تعمیم:

مبالغہ اور تعمیم ان کی تحریروں کا جزء لاینفک ہے جبکہ یہ نہ تو ان کی علمی شخصیت سے میل کھاتا ہے اور نہ فن تاریخ سے، الفاروق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ صفحہ اول سے ہی اس کی ابتداء ہو جاتی ہے، مثلاً:

۱۔ ''الفاروق کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا تھا''۔[۳۱]

۲۔ ''تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا''۔[۳۲]

۳۔ ''ہمارے معزز اور محترم دوست شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی بجمیع القابہ کو تمام ہندوستان جانتا ہے''۔[۳۳]

۴۔ ہمارے شمس العلماء کی کتاب تمدن عرب جس کی شہرت عالمگیر ہو چکی ہے''۔[۳۴]

الفاروق اگر چہ تاریخ جیسے خشک موضوع پر ہے لیکن شبلی پوری کتاب میں ایک شاعرانہ فضا قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں، اور ان کی جمال پسندی اور قوت تخیل نے اس فضا کے رنگ کو شوخ بنانے کا کام کیا ہے، اس نے تاریخی حقیقت نگاری کو کتنا متاثر کیا اس سے قطع نظر اردو ادب کو ایک ایسا اسلوب بیان اور طرز تحریر دیا ہے جو بعد میں آنے والوں کا مطمح نظر بن گیا بقول علامہ سید سلیمان ندوی :

''تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ، حضرات علماء کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا اور اب تو وہ علمی اور مذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن چکی ہے''۔[۳۵]

اس میں سرسید کے فیض صحبت کا بڑا دخل تھا سید صاحب کا اس سے انکار خلاف واقعہ بات ہے مولانا عبد السلام ندوی نے تو شبلی کو جدید اردو انشاء پردازی کی شاہراہ کا بانی قرار دے دیا ہے،[۳۶] یہ حقیقت سے اور بھی بعید ہے، حق یہ ہے کہ سرسید نے اس شاہراہ کی بنیاد ڈالی ہے اور عملاً چلکر دکھایا بھی ہے، خود شبلی کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

شبلی سرسید سے متاثر تھے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے مگر وہ کسی کے کورانہ مقلد نہ تھے اس لئے کہ اثر پزیری اور بات ہے اور تقلید اور بات ہے، شبلی اپنے طرز تحریر کے خود بانی ہیں، ان پر سرسید کا خواہ کتنا ہی اثر کیوں نہ ہو اپنے بعد کے انشاء پردازوں پر انہوں نے سرسید سے کم اثر نہیں ڈالا ہے۔

اسی طرح ان کے جملہ فضل وکمال کو سرسید کے نام کرنا بھی ظلم کے مترادف ہے جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے ''شبلی نامہ'' اور محمد امین مارہروی نے ''ذکر شبلی'' میں کیا ہے، حقیقت اس افراط وتفریط کے درمیان ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اعلی درجے کی علمی اور ادبی صلاحیت واستعداد

رکھتے تھے، جسے سرسید کی رفاقت نے جلا بخشا ورنہ

ما تنفع الخيل الكرام ولا القنا
إن لم يكن فوق الكرام كرام[۳۷]

☆☆☆

حوالے وحواشی

۱۔ عبداللطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ، باراول، دہلی: شبلی اکادمی ۱۹۴۵ء، ۸۸

۲۔ نفس مصدر، نفس صفحہ

۳۔ دیباچہ المامون، اعظم گڑھ، دارالمصنفین ، ۱۹۲۹ء، ۳

سرسید نے یہ تبصرہ المامون کے دیباچے میں کیا ہے، لیکن یہ ''الفاروق'' پر بھی صادق آتا ہے اور بدرجۂ اتم صادق آتا ہے، کیونکہ دونوں کی اشاعت میں ۱۰؍سال کا فرق ہے اور یقیناً اس عرصے میں شبلی کا یہ وصف پختہ تر ہوگیا تھا۔

۴۔ دیباچہ ''الفاروق''، ۱۸

۵۔ ''شبلی کا اسلوب بیان'' ادیب، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۴۷

۶۔ نفس مصدر، ۲۴۰

۷۔ الفاروق، ۱: ۵۴

۸۔ الفاروق، ۱: ۵۹

۹۔ الفاروق، ۱: ۱۵۰

۱۰۔ الفاروق، ۲: ۱۳۵۔۱۵۲

۱۱۔ الفاروق، ۲: ۱۵۸

۱۲۔ مولانا شبلی ایک مطالعہ، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۶ء ، ۱۱۱

۱۳۔ الفاروق، ۱: ۱۴۳

۱۴۔ الفاروق، ۲: ۲۷۰

۱۵۔ ''شبلی بحیثیت انشاء پرداز'' ادیب، علی گڑھ، ستمبر، ۱۹۶۰ء ، ۲۲۸

۱۶۔ الفاروق، ۲: ۱۵۸

۱۷۔ الفاروق، ۲: ۲

۱۸۔ الفاروق،۲: ۱۶۳
۱۹۔ الفاروق،۲: ۱۷۰
۲۰۔ الفاروق،۲: ۲۱۹
۲۱۔ الفاروق،۲: ۲۱۹
۲۲۔ الفاروق،۲: ۲۸۸
۲۳۔ الفاروق،۲: ۲۸۱
۲۴۔ الفاروق،۱: ۱۳
۲۵۔ الفاروق،۱: ۱۸
۲۶۔ الفاروق،۱: ۱۴۸
۲۷۔ الفاروق،۱: ۵۷۔۵۸
۲۸۔ الفاروق،۲: ۲
۲۹۔ الفاروق،۱: ۱
۳۰۔ الفاروق،۲: ۱۵
۳۱۔ الفاروق،۱: ۱
۳۲۔ الفاروق،۱: ۱
۳۳۔ الفاروق،۱: ۲
۳۴۔ الفاروق،۱: ۳
۳۵۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ۳۴
۳۶۔ مفتون احمد، ''مولانا شبلی ایک مطالعہ'' حوالہ سابق، ۱۱۵
۳۷۔ اصیل گھوڑے اور (مضبوط) نیزے کچھ بھی سودمند نہیں ہو سکتے اور اگر ان پر سوار ہونے والے خود بھی اصیل و بہادر نہ ہوں۔

☆☆☆

الفاروق کے تراجم

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی کی شخصیت جامع کمالات تھی انہوں نے مدۃ العمر علم وفن کی جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمت انجام دی اس کا آج بھی سارا زمانہ معترف ہے ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

علامہ شبلی نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''بتیس[۳۲] برس (۱۸۸۲ء۔۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا[۱]''

اس بتیس برس کی مدت میں انہوں نے ایسی معرکہ آراء کتابیں اور گراں مایہ مقالات سپرد قلم کیے جن کی عظمت وبلند پایگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کتابوں کے متعدد ایڈیشن طبع ہو کر عوام وخواص دونوں میں نہایت مقبول ہوئے اور اکثر کتابوں کے ترجمے بھی دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، پشتو اور ملیالم وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ علامہ شبلی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق تو ادا ہی کیا اس کے علاوہ تعبیر وبیان کا ایسا انوکھا اور اچھوتا پیرایہ اختیار کیا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے ذریعہ علامہ شبلی کا فیض ابھی تک جاری ہے اور ان کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کا یہ بیان سراسر غلط ثابت ہوا کہ:

مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکا وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ میں ہے ان کی بعض کتابیں

۱۔ حیات شبلی ص:۱، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء

کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔[۱]

یقیناً زمانہ کے دست وبرد سے کوئی نہیں بچ سکا بقائے دوام کا دعوی کس کو زیب دیتا ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ علامہ شبلی کی تصانیف پر پون صدی اور بعض تصانیف پر ایک صدی سے زائد مدت گذرنے کے بعد بھی شب وروز کی گردشوں سے پھپھوندیں نہیں لگیں اور دنیا کے علوم وفنون میں نئے نئے انقلابات رونما ہونے کے باوجود ان کی کتابوں کے بے شمار ایڈیشن طبع ہو کر حسن قبول کی سند حاصل کرتے جارہے ہیں اور ان سے استفادے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے ان کی کتابیں کتب خانوں کے ساتھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے ماہرین اور اہل علم کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں اور غیر زبانوں میں تصانیف شبلی کے ترجمے ہورہے ہیں ان کی سب سے زیادہ مقبول ومعروف کتاب سیرۃ النبی ہے جس کی ناتمامی کا داغ حسرت لئے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تاہم ان کی دوسری شہرۂ آفاق بلند پایہ اور وقیع تصنیف الفاروق جو اردو زبان کی مقبول ترین کتابوں میں ہے اہل علم وفن اور ارباب نظر نے اس کی سب سے زیادہ پذیرائی کی خود علامہ شبلی کو اپنی تمام تصنیفات میں الفاروق سب سے زیادہ پسندیدہ تھی[۲] اس کی تصنیف وتالیف کے لئے علامہ شبلی نے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور وہاں کے متعدد کتب خانوں اور نادر وکمیاب کتابوں سے استفادے کے بعد اس کی تالیف کی۔

الفاروق جنوری ۱۸۹۹ء میں مطبع نامی کانپور بعد سے پہلی بار طبع ہوئی اس وقت سے آج تک برابر طبع ہو کر اہل علم کی تشنگی بجھارہی ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، پشتو، اور ملیالم میں ترجمہ ہو کر ان کے حلقوں میں بھی مقبول ومتداول ہے۔ یہاں ان تراجم کا ایک سرسری تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ مولانا عبدالحق مقدمہ خطوط شبلی ص: ۲۶ محل السلطان بک ایجنسی بھوپال، ۱۹۱۱ء

۲۔ مکاتب شبلی، ج: ۲۔ ص: ۲۳۵

ترکی ترجمہ

الفاروق کا سب سے پہلے ترکی زبان میں ترجمہ ہوا ترکوں سے علامہ شبلی کو خاص محبت تھی محمد عمر رضا آفندی نے الفاروق کا ترکی میں ترجمہ کر کے اس محبت کا حق ادا کیا ہے۔ جسے آمدی مطبع سی استنبول نے ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۵ھ میں حضرت عمر کے نام سے شائع کیا اس ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن کون طوغدی مطبع سی استنبول نے ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۴۷ھ میں شائع کیا، یہ دونوں مطبوعہ نسخے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

مالاباری ترجمہ

اس کے بعد الفاروق کا مالاباری (ملیالم) زبان میں ترجمہ ہوا یہ ترجمہ جناب عبد السلام وکم کے قلم سے ہے اسے اسلامیہ پبلشنگ ہاؤس وکم تراونکور نے وی وی پریس تروندرم سے طبع کرا کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا یہ مطبوعہ نسخہ بھی دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

فارسی ترجمہ

علامہ شبلی اور ان کی تصانیف کے قدر داں اور مرتبہ شناس امراء ورؤسا اور فرمانبروایانِ ریاست بھی تھے الفاروق کی تالیف وتکمیل میں سرکار آصفیہ حیدرآباد کا اشتراک شامل تھا اور وہ سلسلہ آصفیہ میں داخل تھی اس طرح سیرۃ النبی کی تالیف میں بیگم بھوپال کی دلچسپی وتوجہ سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں علامہ شبلی کا یہ قطعہ بیگم صاحبہ کی علم نوازی ومعارف پروری کو زندہ جاوید کر گیا۔

مصارف کی محرف سے مطمئن ہوں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم از افشاں ہے

رہی تالیف وتصنیف وروایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض درہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

علامہ شبلی کے ابتدائی تاریخی رسالہ بدا الاسلام کے اردو ترجمے کی سعادت نواب حمید اللہ خاں بھوپال کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو کے حصہ میں آئی اسی طرح الفاروق کے فارسی ترجمہ کی سعادت جناب اسد اللہ خاں صاحب افغانستان کی والدہ اور محمد نادر خاں بادشاہ افغانستان کی ہمشیرہ عزت مآب علیا جناب کا مقدر بنی اس کی تصحیح و ترتیب کا کام جناب نجف علی عاصی جلال پوری نے انجام دیا جسے قندھار سے حاجی عبد الستار نے شائع کیا اس کا دوسرا ایڈیشن مسلم پرنٹنگ پریس لاہور نے ۱۳۵۱ھ میں شائع کیا یہ دوسرا ایڈیشن کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہے۔

انگریزی ترجمہ

الفاروق شائع ہوئی تو اسے انگریزی میں منتقل کرنے کی کئی لوگوں نے کوشش کی سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں علامہ شبلی کے شاگرد[۱] مولانا ظفر علی خاں نے شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی اور مولوی عزیز مرزا کی تحریک پر اس کام کا آغاز کیا اور الفاروق کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا[۲] جسے ۱۹۳۹ء میں شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا اس ترجمہ کے اب تک چار ایڈیشن علی الترتیب ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۷ء۔ ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکے ہیں پانچواں ایڈیشن عمار پبلیکیشن دہلی نے شائع کیا۔

الفارق کا انگریزی ترجمہ شیخ عطاء اللہ صاحب لاہور نے بھی شروع کیا تھا مگر وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے[۳] البتہ دوسرا انگریزی ترجمہ جناب محمد سلیم کے قلم سے نکلا یہ ترجمہ بھی شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہوری نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا پھر ۱۹۶۲ء میں وہیں سے دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا۔

پشتو ترجمہ

الفاروق کو پشتو زبان میں بھی ترجمہ ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جو پشتو اہل قلم جناب غلام قادر کا کارنامہ ہے یہ ترجمہ ۱۹۴۹ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے راقم الحروف

۱۔ البصیر شبلی نمبر، ص:۷۶

۲۔ شذرات سلیمانی حصہ سوم، ص:۲۲۵

۳۔ البصیر شبلی نمبر، ص:۷۶

کی نظر سے یہ ترجمہ نہیں گذرا۔

عربی ترجمہ

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ الفاروق کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ عربی داں طبقہ کے لئے اس سے استفادہ آسان ہو مگر ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی اور اب الحمد للہ ایک صدی بعد ان کی یہ تمنا پوری ہوئی ہے۔ جناب دکتور سمیر عبد الحمید ابراہیم استاذ جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ نے عربی مبین میں الفاروق کو منتقل کیا ہے جسے مکتبہ دار السلام ریاض نے ۱۹۹۹ء میں نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ان ترجموں اور متعدد اشاعتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الفاروق کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کے کس قدر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہندی میں بھی کیا جائے تا کہ برادران وطن کو بھی اس سے استفادہ کا موقع ملے اور انہیں یہ اندازہ بھی ہو کہ اسلام اور اسلامی تاریخ کس چیز کا نام ہے۔

☆☆☆

''الفاروق'' کے بعض حواشی۔ایک مطالعہ

محمد جرجیس کریمی

تمہید

تصنیف وتالیف کی طرح حاشیہ نگاری بھی ایک فن ہے۔کبھی مصنف خود اپنی کتاب پر حاشیہ نگاری کرتا ہے اور کبھی مصنف کے علاوہ دوسرے ارباب تحقیق اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ حاشیہ ہر مصنف کی ایک ضرورت ہے اور کبھی کبھی حاشیہ کے ذریعہ مصنف اپنی گردن بھی بچاتا ہے۔ حاشیہ میں عام طور پر وہ بات کہی جاتی ہے جو اصل متن میں نہ کہی گئی ہو یا نہ کہی جاسکتی ہو، کبھی حاشیہ کے ذریعہ اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے تو کبھی متن کتاب کے معنی ومفہوم کے برعکس دوسرے معنی ومفہوم بیان کیے جاتے ہیں۔ اصل کتاب میں ایک رائے کو ترجیح دی گئی ہوتی ہے تو مصنف اس کے تحت حاشیہ نگاری کر کے اس رائے کے خلاف رائے کا اظہار کرتا ہے غرض کہ مختلف پہلو سے حاشیہ یا حواشی کی ضرورت واہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

حاشیہ یا حواشی کی قدر وقیمت اصل کتاب کی قدر وقیمت ہی سے متعین کی جاسکتی ہے کیونکہ جو کتاب جس قدر اہم ہوگی اس کے حواشی بھی اسی قدر اہمیت کے حامل ہوں گے مصنف اور حاشیہ نگار کی علمی صلاحیت میں تفاوت سے بھی حاشیہ کی قدر وقیمت میں تفاوت واقع ہوگی ان تفصیلات کی روشنی میں الفاروق مصنفہ علامہ شبلی نعمانی کے حواشی کی قدر وقیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جن کو خود مصنف نے قلمبند کیا ہے ذیل میں ہم الفاروق کے چند حواشی کا مطالعہ پیش کرتے ہیں تا کہ اندازہ ہو جائے کہ مصنف نے تصنیف کتاب اور حواشی میں کس دقیقہ سنجی اور تبحر علمی کا مظاہرہ کیا ہے۔

متن:

مدینہ پہونچ کر سب سے پہلے آن حضرتؐ نے مہاجرین کے رہنے سہنے کا انتظام کیا

انصار کو بلا کران میں اور مہاجرین میں برادری قائم کی.........آنحضرتؐ طرفین کے رتبہ اور حیثیت کا فرق مراتب ملحوظ رکھتے تھے یعنی جو مہاجر جس درجے کا ہوتا اسی رتبے کے انصاری کو اس کا بھائی بناتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ کو جس کا بھائی قرار دیا ان کا نام عتبان بن مالک تھا جو قبیلہ بنو سالم کے سردار تھے۔

حاشیہ:

دیکھو سیرۃ ابن ہشام حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری (ص: ۳۳۱) عتبان کے بجائے اوس بن خولی کا نام لکھا ہے لیکن تعجب ہے کہ خود علامہ موصوف نے اصابہ میں ابن سعد کے حوالے سے عتبان ہی کا نام لکھا ہے اور اوس بن خولی کا جہاں حال لکھا ہے حضرت عمرؓ کی اخوت کا ذکر نہیں کیا، ص: ۳۵۔

مطالعہ:

فتح الباری میں اوس بن خولی کے تعلق سے یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر اور اوس بن خولی کے درمیان مواخات اس قدر گہری تھی کہ وہ جو کوئی بھی بات جہاں کہیں بھی سنتے ایک دوسرے کو کہہ سناتے تھے دیکھئے فتح الباری مقدمہ، ص: ۳۲۱۔

متن:

آنحضرتؐ نے اس غرض سے خندق کے ادھر ادھر کچھ کچھ فاصلہ پر اکابر صحابہ کو معین کر دیا تھا کہ دشمن ادھر سے نہ آنے پائے۔ ایک حصے پر حضرت عمرؓ معین تھے چنانچہ یہاں ان کے نام کی ایک مسجد آج بھی موجود ہے ایک دن کافروں نے حملہ کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے زبیر کے ساتھ آگے بڑھ کر روکا اور ان کی جماعت درہم برہم کر دی۔

حاشیہ:

یہ واقعہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے لیکن میں نے اس کی سند نہیں پائی، ص: ۴۹۔

مطالعہ:

اگر بالفرض حضرت عمر الفاروقؓ کا اس خاص واقعہ میں صراحت کے ساتھ شریک

ہونے کی سند نہیں ملتی تو بھی اس سے ان کے مقام ومرتبے میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ سیرت وتاریخ کی کتابوں میں یہ صراحت ہے کہ حضرت علیؓ اوران کے ساتھ کچھ مسلمان (نفر من المسلمین) حملہ آوروں سے مقابلے کے لئے گئے۔ ہوسکتا ہے ان میں حضرت عمرؓ بھی ہوں عدم صراحت عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہے واللہ اعلم بالصواب۔

متن:

حنین میں دونوں فوجیں صف آراء ہوئیں۔ مسلمانوں نے پہلے حملہ میں ہوازن کو بھگادیا لیکن جب مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہوئے تو ہوازن نے حملہ کیا اور اس قدر تیر برسائے کہ مسلمانوں میں ہل چل پڑگئی اور بارہ ہزار آدمیوں میں سے معدودے چند کے سوا باقی سب بھاگ نکلے اس معرکہ میں جو صحابہ ثابت قدم رہے ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے اور ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل ہیں چنانچہ علامہ طبری نے صاف تصریح کی ہے۔ محمد بن اسحاق نے جو امام بخاری کے شیوخِ حدیث میں داخل ہیں اور مغازی وسیر کے امام مانے جاتے ہیں کتاب المغازی میں لکھا ہے" وبا پیغمبر چندتن از مہاجر وانصار واہل بیت باز ماندہ بودند مثل ابوبکر وعلی وعمر وعباسؓ"

حاشیہ:

ابن اسحاق کی اصل کتاب میں نے نہیں دیکھی لیکن اس کا ایک نہایت قدیم ترجمہ زبان فارسی میں میری نظر سے گذرا ہے اور عبارت منقولہ اسی سے ماخوذ ہے یہ ترجمہ ۶۱۲ھ میں سعد بن زنگی کے حکم سے کیا گیا تھا اور اس کا ایک نہایت قدیم نسخہ الہٰ باد کے کتب خانہ عام میں موجود ہے، ص: ۵۷۔

مطالعہ:

علامہ طبری نے ابن اسحاق کے حوالے ہی سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے (دیکھئے تاریخ الطبری، ج: ۳، ص: ۴۷) لہذا اس پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے امام بخاری نے مختلف سندوں سے کسی قدر اجمال کے ساتھ واقعہ زیر بحث کا ذکر کیا ہے (کتاب المغازی باب قول

اللہ ویوم حنین)

متن:

سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر عبد اللہ بن عباس خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا۔

حاشیہ:

بخاری باب کتابۃ العلم میں جو حدیث مذکور ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اس واقعہ میں موجود تھے اس لئے محدثین نے اس پر بحث کی ہے اور بہ دلائل قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ موجود نہ تھے دیکھو فتح الباری باب کتابۃ العلم، ص:٦١

مطالعہ:

واقعہ زیر بحث میں حضرت عبد اللہ بن عباس کی موجودگی تسلیم کر لینے سے بھی حقیقت واقعہ پر کوئی اثر مرتب ہونے والا نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کیا لکھنا چاہتے تھے یہ واضح نہیں ہے محدثین نے اس کے مختلف معنی بیان کیئے ہیں ایک معنی یہ ہے کہ اس سے مراد احکام شرعیہ کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھنا مقصود تھا جس سے اختلاف ختم ہو جاتے دوسرا معنی یہ ہے کہ اپنے بعد خلفاء کے نام لکھنا چاہتے تھے تا کہ بعد میں اختلافات نہ ہوں ظاہر ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خلفاء میں سب سے پہلے حضرت علیؓ کا نام لکھنا چاہتے تھے جیسا کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں اور جس کی وجہ سے حدیث مذکور پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ اپنے بعد حضرت ابو بکر کو خلیفہ بنانے کو تحریری طور پر توثیق کرنا چاہتے تھے دیکھئے فتح الباری حوالہ مذکور بعض دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر جب کہ آنحضور ﷺ نے قلم دوات منگایا تھا اور جب لوگ آپس میں اختلاف کے شکار ہو گئے آپؐ نے بعض وصیتیں بھی کی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کیا جائے دوسری یہ تھی کہ باہر سے آنے والے وفد (سفیر، قاصد) کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے تیسری کے بارے میں روایت ہے کہ آپؐ خاموش رہے یا راوی کے ذہن سے بات نکل گئی کہ وہ کیا تھی (بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیؐ) سوال

یہ ہے کہ اگر وہ بات اتنی اہم تھی تو آپؐ خاموش کیوں رہے یا راوی کیسے بھول گیا؟

متن:

تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ جب آنحضرتؐ نے کاغذ قلم مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں، ص: ۶۲

حاشیہ:

علامہ قرطبی نے یہ تاویل کی ہے اور اس پر ان کو ناز ہے کہ "لوگوں نے یہ لفظ انکار اور استعجاب کے طور پر کہا تھا یعنی یہ کہ آنحضرتؐ کے حکم کی تعمیل کرنے چاہیئے خدانخواستہ آنحضرتؐ کا قول ہذیان تو نہیں کہ اس پر لحاظ نہ کیا جاوے یہ تاویل لگتی ہوئی ہے لیکن بخاری ومسلم کی بعض روایتوں میں ایسے صاف الفاظ ہیں جن میں اس تاویل کا احتمال نہیں مثلا ہجر ہجر (دو دفعہ) یا ان رسول اللہ ﷺ یھجر (صحیح مسلم) ص: ۶۲۔

متن:

ایک پیغمبر کا وفات کے قریب یہ کہنا "قلم دوات لاؤ میں ایسی چیز لکھدوں کہ تم آئندہ گمراہ نہ ہو" اس میں ہذیان کی کیا بات ہے، ص: ۶۲

حاشیہ:

ہمارے نکتہ سنجوں نے یہ مضمون آفرینی کی ہے کہ چونکہ رسول للہ ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے اس لئے آپکا یہ فرمانا کہ "میں لکھ دوں" ہذیان کا قرینہ تھا لیکن ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ لکھنے کے معنی لکھوانے کے بھی آتے ہیں اور یہ مجاز اعموماً شائع اور ذائع ہے، ص: ۶۲

متن:

بخاری ومسلم کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہؐ کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے، ص: ۶۳۔

مطالعہ:

حضرت عمرؓ سے بڑھ کر ان لوگوں نے آنحضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی

جنہوں نے آپؐ کو منع کرنے کے باوجود دوا پلائی۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے ہم نے مرض الموت میں آپ کو دوا پلائی حالانکہ آپؐ اشارے سے منع فرمارہے تھے کہ دوا نہ پلاؤ ہم نے سمجھا کہ بیماری کی وجہ سے آپؐ ناپسند فرمارہے ہیں بعد میں جب آپ کو (بیہوشی سے) افاقہ ہوا تو آپؐ نے حکم دیا کہ جو لوگ مجھے دوا پلانے میں شریک تھے انہیں بھی میرے سامنے دوا پلائی جائے (بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیؐ) کسی واقعہ کے ظاہر معنی کی وجہ سے وقوع واقعہ سے انکار کر دینا مناسب نہیں ہے جب کہ صحیح سندوں کے ساتھ وہ واقعہ بیان ہوا ہو۔

متن:

عریش پہونچے تھے کہ حضرت عمر کا خط پہونچا اگر چہ اس میں آگے بڑھنے سے روکا تھا لیکن چونکہ شرطیہ حکم تھا عمرو نے کہا کہ اب تو ہم مصر کی حد میں آ چکے ہیں، ص: ۱۹۳۔

حاشیہ:

مقریزی وغیرہ میں لکھا ہے کہ قاصد مقام رفح میں عمرو سے ملا انہوں نے اس خیال سے آگے بڑھنے سے منع کیا ہوگا قاصد سے خط نہیں لیا اور کہا کہ جلدی کیا ہے۔ منزل پر پہونچ کر لے لوں گا۔ عریش کے قریب پہونچے تو خط لے کر کھولا اور پڑھکر کہا کہ امیر المومنین نے لکھا ہے کہ ''مصر نہ پہونچ چکو تو رک جانا لیکن ہم تو مصر کی حد میں آ چکے'' لیکن عمرو بن العاص کی نسبت ایسی حیلہ سازی کے اتہام کی کیا ضرورت ہے اولا تو بلاذری وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ خط ان کو عریش ہی میں ملا لیکن رفح میں ملا ہو تب بھی کچھ ہرج نہیں کیونکہ رفح خود مصر میں داخل ہے، ص: ۱۹۳۔

مطالعہ:

یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ ایک آدمی امیر المومنین کا خط لے کر آتا ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ خط فلاں مقام میں جا کر پڑھوں گا صرف اس خدشہ کے تحت کہ خط میں آگے بڑھنے سے منع کیا گیا ہوگا امیر المومنین کے خط کو نہیں کھولا جارہا ہے سوال یہ ہے کہ اگر امیر المومنین نے حکم دیا ہوتا کہ کسی بھی حال میں آگے نہ بڑھو تو عمرو بن العاص کیا کرتے؟ صحیح بات یہ ہے کہ اسلامی فوج جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے اس قدر

موجزن تھی کہ آگے بڑھتی چلی جارہی تھی یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے اندازہ کے برخلاف انتہائی تیز رفتاری سے اسلامی فوج مصر کی حدود میں داخل ہوچکی تھی جب ان کا خط حضرت عمرو بن العاص کو موصول ہوا۔

متن:

تمام صحابہ میں اس وقت چھ شخص تھے جن پر انتخاب کی نگاہ پڑ سکتی تھی علیؓ، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد وقاص اور عبدالرحمان بن عوف لیکن حضرت عمر ان سب میں کچھ نہ کچھ کمی پاتے تھے۔ ص: ۲۰۳

حاشیہ:

حضرت عمر نے اور بزرگوں کی نسبت جو خردہ گریاں کیں گو ہم نے ان کو ادب سے نہیں لکھا لیکن ان میں جائے کلام نہیں البتہ حضرت علی کے متعلق جو نکتہ چینی حضرت عمر کی زبانی عام تاریخوں میں منقول ہے یعنی یہ کہ ''ان کے مزاج میں ظرافت ہے'' یہ ایک خیال ہی خیال معلوم ہوتا ہے حضرت علیؓ ظریف تھے مگر اس قدر جتنا ایک لطیف المزاج بزرگ ہوسکتا ہے'' حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کے تعلقات قریش کے ساتھ کچھ ایسے پیچ در پیچ تھے کہ قریش کسی طرح ان کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ ص: ۲۰۳

مطالعہ:

پھر سوال پیدا ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان چھ لوگوں میں حضرت علیؓ کا نام کیوں شمار کیا تھا جن کے خلیفہ بننے کے اس قدر امکانات تھے جس قدر دوسرے کے تھے؟ صحیح بات یہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ میں یہ چھ اشخاص اس قدر مجموع الصفات تھے کہ حضرت عمرؓ نے ان میں سے کسی ایک کو منتخب نہ کیا اور آخری فیصلہ خود انہیں لوگوں پر چھوڑ دیا۔

متن:

فتوحات عراق، ص: ۸۷ (عنوان)

حاشیہ:

جغرافیہ نویسوں نے عراق کے دو حصے کیے ہیں، یعنی جو حصہ عرب سے ملحق ہے اس کو عراق عرب اور جو حصہ عجم سے ملحق ہے اس کو عراق عجم کہتے ہیں، عراق عرب کی حدود اربعہ یہ ہیں، شمال میں جزیرہ، جنوب میں بحر فارس، مشرق میں خوزستان اور مغرب میں دیار بکر ہے جسکا مشہور شہر موصل ہے دار السلطنت اس کا بغداد ہے اور جو بڑے بڑے شہر اس میں آباد ہیں وہ بصرہ۔ کوفہ، واسط وغیرہ، ص: ۸۷۔

مطالعہ:

پہلے زمانے میں "العراقان" یا العراقین سے اس ملک کے دو قدیم ترین اسلامی شہر کوفہ اور بصرہ مراد لئے جائے تھے بعد میں اس نام کا اطلاق العراق اور الجبال دونوں پر ہونے لگا عراق ایک ہموار میدانی ملک ہے جو مغرب میں دشت شام سے، جنوب میں عرب کے لق ودق میدانوں اور صحرائی نیز خلیج ایران کے شمالی ساحل سے مشرق میں جبل حمرین کی جنوبی شاخوں اور مغربی خوزستان سے، اور شمال میں الانبار سے تکریت تک کھینچے ہوئے خط سے گھرا ہوا ہے، عراق کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ انہتر ہزار دو سو چالیس مربع میل ہے (دیکھئے دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ عراق)

متن:

قادسیہ کی جنگ اور فتح، ص: ۱۰۲

حاشیہ:

قادسیہ عراق عرب کا مشہور شہر تھا اور مدائن سبعہ کے وسط میں تھا اب ویران پڑا ہوا ہے ہمارے نقشے میں اس کو شہر مدائن کے متصل سمجھنا چاہتے، ص: ۱۰۲۔

مطالعہ:

کچھ عرصہ پہلے قادسیہ کا صحیح محل وقوع معلوم نہیں تھا بعض مورخین نے شہر اُخیضر (جو کوفے سے پچیس میل جنوب میں واقع ہے) اور القادسیہ کو ایک ہی شہر ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے بعد میں تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ قادسیہ کا اصل محل وقوع یہ ہے گرین ایچ کے مطابق ۳۱ر درجے ۴۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۴۴ درجے ۸ دقیقے طول بلد مشرقی پر نجف کے عین جنوب میں کوفے سے ۱۹ میل دور واقع ہے (دیکھئے دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ قادسیہ)

متن:

خنساء جو عرب کی مشہور شاعرہ تھی، ص: ۱۰۸

حاشیہ:

خنساء کے واقعات نہایت دلچسپ اور عجیب وغریب ہیں۔ اس کا دیوان بیروت میں چھپ گیا ہے اور اس کے مفصل حالات علامہ ابو الفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں لکھے ہیں۔ اصناف شعر میں مرثیہ گوئی میں اس کا کوئی نظیر نہیں گزرا چنانچہ بازار عکاظ میں اس کے خیمے کے دروازے پر ایک علم نصب کیا جاتا تھا جس پر لکھا ہوتا تھا ارثی العرب یعنی تمام عرب میں سب سے بڑھ کر مرثیہ گو وہ اسلام بھی لائی اور حضرت عمرؓ کے دربار میں حاضر ہوئی تھی، ص: ۱۰۸

مطالعہ:

اس کا اصلی نام تُماضر بنت عمرو بن الحارث بن الشرید ہے وہ بنو سلیم میں سے تھی اس کی مرثیہ گوئی اور شاعری کے بارے میں علمائے ادب نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس کے اشعار میں وہ شاعرانہ خوبیاں تو نہیں تھیں جو دوسرے مرثیہ گویوں کے اشعار میں تھیں مگر اس کی نظموں میں حقیقی سوز وگداز ضرور ہے البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ اس نے اپنی مرثیہ سے بعد میں آنے والے مرثیہ گویوں کو متاثر کیا۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں تکرار بہت ہے (تفصیل کیلئے دیکھئے دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ خنساء)

متن:

عراق عجم، ص: ۱۷۳

حاشیہ:

عراق عجم کی حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں طبرستان جنوب میں شیراز، مشرق میں خوزستان اور مغرب میں شہر مراغہ واقع ہے اس وقت اس کے بڑے شہر اصفہان ہمدان اور رے سمجھ جاتے تھے اس وقت رے بالکل ویران ہوگیا ہے اور اس کے قریب طہران آباد ہوگیا ہے جو شاہان قاچار کا دار السلطنت ہے، ص: ۱۷۳

مطالعہ:

فی الوقت یہ علاقے ایران کے حصے ہیں موجودہ ایران کا رقبہ چھ لاکھ اٹھائیس ہزار مربع میل ہے اور یہ ۲۵ و ۴۰ درجے عرض بلد شمالی اور ۴۴ و ۶۳۰۳۰ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے ازمنہ اوسطی میں سلطنتوں کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی حدود وقتاً فوقتاً بدلتی رہی ہیں لہذا اُس وقت کے بارے میں کوئی معین حد بندی پر قائم رہنا مشکل ہے۔

متن:

فارس، ص: ۱۸۵

حاشیہ:

حال کے جغرافیہ میں عراق کی حدود گھٹا کر فارس کی حدود بڑھا دی گئی ہے مگر ہم نے جس وقت کا نقشہ دیا ہے اس وقت فارس کے حدود یہ تھے شمال میں اصفہان جنوب میں بحر فارس مشرق میں کرمان اور مغرب میں عراق عرب اس کا سب سے بڑا مشہور شہر شیراز ہے، ص: ۱۸۵

مطالعہ:

فی الحال یہ ایران کا ساتواں صوبہ ہے مشرق میں ۵۰ درجے سے ۵۵ درجے طول بلد اور شمال میں ۲۷ درجے سے لے کر ۳۱ درجے ۴۵ دقیقے عرض بلد پر واقع ہے اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی جنوب میں لنگہ سے لے کر شمال میں یزدخواست تک ۶۸۰ کلومیٹر ہے اس کی چوڑائی مغرب میں بندر دِلم سے لے کر مشرق میں آبادہ تک ۵۲۰ کلومیٹر ہے صوبے کا مجموعی رقبہ تقریباً دولاکھ کلومیٹر ہے (دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ فارس)

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی کی تصانیف فاروقی

(ایک مطالعہ)

احسان اللہ خاں ندوی

اسلامی تاریخ میں عہد نبوت اور دور خلافت راشدہ کو مثالی حیثیت حاصل ہے یوں تو چاروں خلفاء نے اپنے اپنے زمانے میں قرآن وسنت کی روشنی میں امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا لیکن حضرت عمر فاروقؓ کو اس اعتبار سے ایک مقام حاصل ہے کہ انہوں نے ابھرتی ہوئی اور روز بروز وسعت اختیار کرتی ہوئی اسلامی مملکت کو نہ صرف قابل اعتبار سے ناقابل تسخیر بنا دیا بلکہ اس کے انتظامی ڈھانچے کو بھی مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے تعلیم یافتہ تھے اس تربیت نے ان کو فکر ونظر کا خاص سانچا عطا کیا تھا جس کی مدد سے انہوں نے ایک ایسی ریاست کے خدوخال نمایاں کئے جس کو انسانی تاریخ ہمیشہ رشک کی نظروں سے دیکھتی رہی ہے اور رہے گی۔ اِنشاءاللہ۔

حضرت عمر الفاروقؓ کی سیرت پر دنیا کی مختلف زبانوں میں تصانیف موجود ہیں جن سے آپؓ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں اور آپ کی علمی، فقہی، اجتہادی اور سیاسی بصیرت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اردو زبان میں حضرت عمر الفاروقؓ کی سیرت پر مبسوط جامع علمی وتحقیقی کتاب شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی شہرۂ آفاق ''الفاروق'' ہے، جو اردو زبان میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے اور حضرت عمر الفاروقؓ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والے قاری کو اپنے انتخاب پر مجبور کردیتی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ کتاب محنت شاقہ اور انتظار طویل کے بعد منظر عام پر آئی اور آتے ہی دل ونگاہ پر اس قدر چھاگئی کہ آج تک اس کے سحر سے آزادی نہ مل سکی۔

علامہ شبلی نعمانی کا شمار اردو ادب کے اہم عناصر میں ہوتا ہے، ان کی تصانیف اردو ادب کا زیور ہیں، انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو صحیح طور پر اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا، الفاروق، المامون، الغزالی، سیرۃ النعمان سے ہندوستان کے خواندہ مسلمانوں کو ان عظیم شخصیات سے واقفیت بہم پہونچائی، شعرالعجم لکھ کر مولانا نے فارسی شاعری کا ذوق جو ہندوستان سے اٹھ رہا تھا اسے برقرار رکھنے کا سامان کردیا، موازنہ انیس ودبیر سے ہر ایک کا مرتبہ متعین کیا۔ زندگی کے آخری سالوں کو عشق نبی میں لگایا، اور سیرۃ نبوی پر ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جوان کی زندگی میں صرف دوجلدوں میں پورا ہوا اور اس کی تکمیل ان کے سچے جانشین کے حصے میں آئی، جس نے پوری محنت ودیانت کے ساتھ استاذ محترم کے خواب کو پورا کیا، جسے آج ایک مستند مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔

علامہ شبلی رفقاء سرسید میں بلاشبہ ایک عظیم سوانح نگار ہیں، تنقید، تاریخ، سیرت نگاری، انشاپردازی، شاعری اور تحقیق ہر ایک میں ان کا پایہ بلند ہے، فن سوانح نگاری میں ان کے موضوعات کا دائرہ مذہبی اور تاریخی ہے۔

سوانح نگاری میں علامہ شبلی کارلائل سے متأثر نظر آتے ہیں اس کا مشہور قول ہے کہ تاریخ عالم صرف اس کے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے شاید اسی کے پیش نظر علامہ شبلی نے ہیروز آف اسلام یعنی مشاہیر اسلام پر قلم اٹھایا۔

علامہ شبلی نے سوانح کو تاریخ کا جز بنادیا ہے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ سوانح ہے یا اس دور کی تاریخ۔ لیکن غور وفکر کے مطالعہ کے بعد یہ تصویر صاف نظر آنے لگتی ہے کہ علامہ شبلی مؤرخ پہلے ہیں اور سوانح نگار بعد میں۔ غالبًا یہی وجہ تھی کہ مہدی افادی نے علامہ شبلی کے بارے میں لکھا کہ وہ تاریخ کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ اس تاریخی ذوق کی جلابخشی میں سرسید کی صحبت کا بھی دخل ہے سرسید کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی اور علامہ شبلی کا بیشتر وقت سرسید ہی کی صحبت میں گزرتا تھا۔

علامہ شبلی کی اکثر تصانیف سوانح سے متلق ہیں اس لئے ان سوانحی تصانیف کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

ا۔ مقصدیت

علامہ شبلی کی تصانیف کسی نہ کسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں صرف عقیدت ومحبت یا تفریح طبع کے لئے کوئی تصنیف نظر نہیں آتی، ان مقاصد کا تذکرہ عموماً وہ کتاب کے دیباچہ میں ضرور کرتے ہیں۔ ناموران اسلام کا سلسلہ انہوں نے دو مقاصد کے پیش نظر شروع کیا (۱)غدر کے بعد مسلمانوں کا اپنے ماضی پر افسوس اور کارناموں کی بے وقعتی پیدا ہوئی تھی ان کے اسلاف کے کارناموں کو پیش کرکے رفع کیا جائے (۲)اردو زبان جو مستقبل میں قومی زبان اختیار کرنے والی تھی اس میں ادب العالیہ کا اضافہ کیا جائے جیسا کہ المامون کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں ''زمانہ کے انقلاب سے مسلمانوں کی قومی خاصیت گو بہت کچھ بدل گئی اور بدلتی جاتی ہیں لیکن آج جو زبان (اردو) ہماری ضرورتوں کی کفیل ہے اس کے خزانے میں قومی تاریخ کا جس قدر سرمایہ ہے ضرورت سے بہت کم ہے'' ص:۳

۲۔ درایت

روایت ودرایت کی بحث میں چھوڑتا ہوں

۳۔ پس منظر وپیش منظر

اس کے متعلق وہ خود الفاروق میں لکھتے ہیں ''تاریخ کے لئے دو باتیں لازمی ہیں (۱) یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کئے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور سبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے''۔

۴۔ تلاش بسیار اور پوری محنت

اس خصوصیت کے لئے علامہ کا قول کافی ہے ''ہم لوگ چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرکے مٹھائی تیار کرتے ہیں''

۵۔ ایجاز واعتدال

علامہ شبلی کی تصانیف میں ایجاز واعتدال کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے جس سے

قاری کی توجہ ہمہ تن کتاب پر مرکوز رہتی ہے۔ اس میں غالباً ان کی شعری طبیعت کا دخل ہے کیونکہ شاعری میں بغیر ایجاز واعتدال کے بات مکمل طور پر بنتی نہیں ہے۔

۶۔ انشاء پردازی

ادبی تحریروں میں حسن تحریر اور لطف انشا پیدا کرنا آسان ہے مگر تاریخ اور سوانحمریوں میں حسن و جمال اور لطافت پیدا کرنا آسان نہیں۔ علامہ شبلی اس اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ الفاروق کے دیباچہ میں خود علامہ تحریر کرتے ہیں ''اخیر میں طرز تحریر کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے آج کل کی اعلیٰ درجہ کی تاریخیں جنہوں نے قبول عام حاصل کیا ہے فلسفہ اور انشا پردازی ہے اور اس طرز سے بڑھ کر کوئی طرز مقبول عام نہیں ہوسکتا۔

ان خصوصیات کے ساتھ ہم '' الفاروق'' کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ''الفاروق'' علامہ شبلی کی سب سے اہم اور اچھی تصنیف ہے۔ ۱۸۹۸ء میں لکھی گئی اور ۱۸۹۹ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ علی گڑھ کالج سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد لکھی گئی، اس کے لئے مصنف نے نہ صرف ہندوستان کے ذخیرۂ معلومات سے فائدہ اٹھایا بلکہ شام، مصر، روم وغیرہ کا سفر بھی کیا، قسطنطنیہ کے کتب خانہ کو بھی کھنگالا، جس قدر اس کتاب کی تالیف میں مشکلات پیش آئیں اسی قدر اسے مقبولیت و پذیرائی بھی ملی۔ اس کا احساس علامہ شبلی نعمانی کو بھی تھا جیسا کہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں''

الفاروق دو اجزاء میں منقسم ہے، دیباچہ میں تاریخ کی تعریف، روایت درایت، تاریخ کا طرز، تاریخ اور انشا پردازی کا فرق واضح کیا ہے، نیز سوانح نگار اور مؤرخ کے فرائض بتائے ہیں۔

الفاروق کے حصہ اول میں حضرت عمرؓ کے حالات زندگی، اس عہد کی تاریخ تہذیب وتمدن کو پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے، حضرت عمرؓ کے نام ونسب، قبول اسلام اور ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ کی وفات، غزوات کا ذکر ہی نہیں واقعات ومسائل مفصل بیان کئے ہیں، حضرت عمرؓ پر شیعہ حضرات کے مدِنظر سقیفہ بن ساعدہ اور

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر طویل بحث کر کے مستند حوالوں سے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔

حصہ دوم میں حضرت عمرؓ کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کی تفصیل ہے، فاروق اعظم کی فتوحات، نظام حکومت کے دوران شخصی اور جمہوری سلطنت کے موازنے، مجلس شوراء، اضلاع کی تقسیم، شہروں کی آبادی اور غلاموں کے حقوق، خراج، عدالت، افتاء، فوجداری اور پولیس، بیت المال، پبلک ورکس، فوجی انتظامات مذہبی و تعلیمی امور، ذمی رعایا کے حقوق، غلامی کے رواج کی تضعیف، سیاست وتدبیر، عدل وانصاف، امامت اور اجتہاد، ذاتی حالات اور اخلاق وعادات پر سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔

الفاروق کے ابتدائی صفحات میں آنحضور صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کے حالات بیان کرنے کے بعد بھی عمر الفاروقؓ کا عکس مدھم نہیں ہوتا، اسی طرح حضرت خالد بن ولید کی پر شکوہ شخصیت اور نازک موڑ آنے کے بعد بھی عمر الفاروق ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کئے رہتے ہیں، فنکارانہ صلاحیتیں تمام حالات میں فنکار کا ساتھ یک لمحہ بھی نہیں چھوڑتیں۔

الفاروق اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ سیرۃ النبی کے بعد علامہ شبلی کی بہترین تصنیف قرار دیجا سکتی ہے، اس کتاب میں علامہ شبلی کا اسلوب اس قدر طاقت ور ہے جو آسانی کے ساتھ واقعات کا رخ موڑ سکتا ہے بلکہ ایک اچھے سوانح نگار کی طرح اپنے فرائض کا انہیں احساس رہا۔ یہی اسباب تھے کہ الفاروق کے بارے میں مشہور اہل قلم مہدی افادی نے لکھا ''غالباً یہ عمروں کی کمائی ہے، بڑی کاوش واہتمام سے سالہا سال کی مؤرخانہ اور تدقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلے میں خلیفہ دوم کی لائف پر یہ ضخیم کتاب تالیف کی گئی ہے، مؤرخ نے محض تحقیقی واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ترکی ومصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کی، سیکڑوں قدیم ونایاب تاریخوں کے لئے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا اصل ماخذ کے چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا تھا''

الغرض الفاروق میں جو ذخیرہ معلومات یکجا کیا گیا ہے وہ تاریخ فاروقی کے لئے ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

دوسری تصنیف مشہور عالم دین مولانا ابو یحییٰ امام نوشہروی کی ہے، جسکا نام ''حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریے'' ہے۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ دھلویؒ کے رسالہ مذہب در فاروق اعظم کا اردو میں فقہ عمرؓ کے نام سے ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

''حضرت عمر کے سیاسی نظریے'' کے مؤلف جناب مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی کا پورا نام عبد الغنی بن محمد بخش المعروف امام خاں نوشہروی ہے اور کنیت ابو یحیٰی، آپ کی پیدائش نوشہرہ ضلع گجرات میں ہوئی۔ یہ نوشہرہ دریائے چناب کے کنارے آباد تھا، جو دریا کی طغیانی کی وجہ سے مٹ گیا، مولانا مرحوم کے دادا کالے خاں سکونت ترک کر کے سوہدرہ آئے تھے، ان کے ساتھ مولانا مرحوم کے والد جناب محمد بخش اور مولانا مرحوم بھی تھے۔

بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا، ذرا بڑے ہوئے تو مشہور عالم دین غلام نبی ربانی کے حلقہ میں داخل ہو گئے، ابتدائی تعلیم مولانا عبد الحمید بن غلام نبی ربانی سے حاصل کی مگر عین جوانی میں مولانا عبدالحمید کے انتقال کے بعد ان کے والد ہی سے مزید تعلیم حاصل کیا، یہاں سے نکل کر امرتسر کے مدرسہ تقویۃ الاسلام پہونچے جہاں مولانا ابو اسحاق نیک محمد، مولانا محمد حسین ہزاروی اور مولانا عبد اللہ ساکن بھوجیاں سے استفادہ کیا، امرتسر میں تکمیل تعلیم کے بعد کچھ عرصہ گجرانوالہ میں مولانا محمد اسماعیل سلفی کے پاس رہے۔

تعلیمی فراغت کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں کاروبار کے واسطے قیام کیا اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ جاری رکھا، اخبار اہل حدیث امرتسر، اخبار محمدی دہلی، زمانہ کانپور، آزاد حیدر آباد دکن، جامع دہلی، برھان دہلی، معارف اعظم گڑھ اور اردو معلیٰ کانپور میں علمی، تحقیقی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی اور الاعتصام، رفیق، ثقافت اور امروز میں بے شمار مضامین لکھے۔

آپ کے علمی وادبی صلاحیت کا اثر تھا کہ مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ

اردوئے معلیٰ میں جب ہندوستان کے مشہور اہل قلم کی فہرست شائع کی اس میں مولانا مرحوم کا نام شامل تھا۔

مولانا کی تصانیف وتراجم کی تعداد ۲۵ کے قریب ہے جن میں کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں

مطبوعہ تصانیف وتراجم

۱۔ دربار مامون کے فیصلے ۱۹۲۳ء
۲۔ قصۂ خلق قرآن ۱۹۲۴ء (ترجمہ)
۳۔ ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ۱۹۳۷ء
۴۔ ترجمہ علمائے حدیث ہند، جلد اول ۱۹۶۲ء
۵۔ ہندوستان میں علم حدیث ۱۹۴۷ء
۶۔ قرآنی دستور حیات ۱۹۵۰ء
۷۔ فقہ عمر ۱۹۵۲ء (ترجمہ)
۸۔ حیات محمد ﷺ ۱۹۵۶ء ترجمہ حیاۃ محمد للہیکل
۹۔ زندگی کے نمونے ۱۹۵۶ء
۱۰۔ حرف آخر ۱۹۵۶ء
۱۱۔ حضرت عمر کے سیاسی نظریے ۱۹۵۶۔۱۹۷۹ء
۱۲۔ مکالمات نبوی ۱۹۵۶۔۱۹۷۸ء
۱۳۔ ترجمہ نزہۃ الخواطر دوجلدیں ۱۹۵۷ء
۱۴۔ سیاسی وثیقہ جات ۱۹۶۰ء
۱۵۔ نقوش ابوالفاء دوجلدیں ۱۹۶۲ء

غیر مطبوعہ تصانیف وتراجم

۱۔ فقر وتصوف ۱۹۳۸ء ترجمہ فتوی الصوفیۃ

۲۔ سخنوران ہند ۱۹۴۲ء
۳۔ افکار بن قیم در سیاست شرعیہ (ترجمہ) ۱۹۵۳ء
۴۔ افکار ابن قیم در فقہ واصول فقہ ۱۹۵۲ء (ترجمہ)
۵۔ چہ خوش گفت ۱۹۵۶ء
۶۔ ترجمہ ھدایۃ المجتہد ۱۹۵۶ء (ترجمہ)
۷۔ ترجمہ نزہۃ الخواطر پانچ جلدیں
۸۔ دستور المجاہدین ۱۹۵۸ء
۹۔ مکالمات صحابہ ۱۹۵۹ء
۱۰۔ تذکرہ مصنفین گجرانوالہ ۱۹۵۶ء
۱۱۔ تراجم علمائے حدیث ہند دو جلدیں

سر دست امام خاں نوشہروی کی تصنیف ''حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریے'' زیر بحث ہے اس کتاب میں مولانا کا اپنا کوئی مقدمہ و دیباچہ نہیں ہے جس سے اس کتاب کی وجہ تالیف، غرض و غایت، اسلوب و انداز بیان معلوم ہو، البتہ ابتدائی صفحات میں عرض ناشر، چند تاثراتی مضامین، مختصر حالات زندگی اور اجازت نامہ وغیرہ مذکور ہیں۔

اس کتاب کا آغاز حضرت عمرؓ کے حالات سے ہوتا ہے اور ابتدا ہی میں مولانا فرماتے ہیں ''جناب رسالت مآب ﷺ کب سے مصروف دعا تھے اللھم أشد الدین بعمر، اللھم أیّد الدین بعمر۔ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ''وماعبد اللہ جھرۃ حتی اسلم عمر'' ص:۲

اس کے بعد حضرت عمرؓ تمنائے محمد، حضرت عمر اور ملکات نبوت، سیدنا عمر الخطابؓ کی طینت، حضرت عمرؓ منطوق آیت، عمرؓ کی صلاحیت ان کے لئے دعائے ایمان کی محرک ہوئی، حضرت عمرؓ کی مشابہت حضرت ہارون سے، حضرت عمرؓ ان کی ہمشیرہ اور برادر نسبتی کا بقیہ واقعہ مذکور ہے، لیکن ان تفصیلات میں حضرت عمرؓ کی ذاتی حالات زندگی، خاندان ونسب وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔

اس کے بعد اسیران بدر کے قتل پر حضرت عمرؓ کا نظریہ، واقعہ ایلاء میں ابن الخطابؓ کی التجا پر سماعت، حضرت خالد بن ولید کی معزولی، ذمیوں کے حقوق، محاصل، جاگیرات، کسٹم ڈیوٹی، اقامت دین میں امیر المؤمنین کے ذاتی فیصلے، عراق کی مفتوحہ اراضی اور ذمیوں کی تقسیم پر مشہور بحث، مولانا مودودیؒ کی ملکیت زمین پر تنقید، اوس وخزرج کے پانچ پانچ مسن حضرات سے مشاورت، مستحقین فئے وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

مولانا امام خاں نوشہروی کی کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریات سے بحث ہوگی لیکن پوری کتاب میں ایک دو مقام پر گفتگو معلوم ہوتی ہے، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''حضرت عمرؓ کی سیاست کے انداز پوشیدہ نہیں، وہ صرف اسلام کی سربلندی کے حریص تھے، یاد کیجئے ان واقعات کو جن میں ذرا ذرا سی بات پر فلاں اشخاص کی گردنیں اڑا دینے پر اصرار ہے، انہیں نہ تو یہ گوارہ تھا کہ مسلمان اسلام کو خالد بن ولید کا دست نگر سمجھیں، نہ یہ منظور کہ جمہور پر خلیفہ وقت کے خاندان کا تفوق مسلط ہوجائے، آپ اپنی ذات کو جمہور کا نمائندہ سمجھتے اور اپنے منصب سے ان کا مقصود جمہور کی برتری قائم رکھنا تھا، آپ کے دور کا کوئی عامل ان فیصلوں سے شاید ہی مطمئن ہوا ہو جوان کی طرف سے عمال کے متعلق صادر ہوئے۔

امیر المؤمنین کے نزدیک عمال سلطنت حکمراں نہ تھے بلکہ خادم تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک عامل کا محل جلوا دیا دوسرے کو تن زیب کا کرتہ پہننے پر دار الخلافہ میں طلب فرمالیا اور جمہور کے سامنے عبرت ناک سزا دی بخلاف اس کے امیر المؤمنین کی ذات پر جمہور کی طرف سے ایسا قدغن تھا جس سے ان کی تذلیل ہوسکتی''۔ اس کے علاوہ ایک جگہ ''فرزندوں پر جمہور کی ترجیح'' اور ایک جگہ اوس وخزرج کے پانچ پانچ مسن حضرات سے مشاورت کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن کوئی نظام حکومت کی تصویر نہیں دکھاتے کہ اس وقت کی سلطنت میں جمہوری نظام تھا یا شورائی یا ذاتی جسکی وجہ سے کتاب کا ٹائیٹل کچھ بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کے نامکمل حالات کے بعد غزوۂ بدر اور اس کے

بعد واقعہ ایلا اور معاً بعد خلافت کا تذکرہ آجاتا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں کوئی ترتیب نہیں۔

مولانا نوشہروی کی کتاب سیاسی نظریات کے بجائے سیاسی کارناموں، معاشی اصلاحات وغیرہ کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے علامہ شبلی نعمانی کی الفاروق دیگر اردو مصنفین کی کتابوں سے ہر لحاظ سے ممتاز ہے اور بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زبان میں اس قدر اعلیٰ مواد یکجا نہیں مل سکتا۔

☆☆☆

الفاروق: علی گڑھ تحریک کا ایک عطیہ

ڈاکٹر نذیر احمد عبدالمجید

مولانا شبلیؒ نعمانی کی کتاب ''الفاروق'' اردو ادب کے ذخیرے میں ایک ایسی معتبر کتاب ہے کہ اس کی اشاعت کو پوری ایک صدی گزر چکنے کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا ہے۔ آج بھی یہ کتاب علمی، ادبی اور اسلامی حلقوں میں اور عوام و خواص ہر طبقے میں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کتاب کو اردو سوانح نگاری اور حضرت عمرؓ کی جدید سوانح عمریوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ تاہم ان تمام باتوں سے قطع نظر، اس کتاب کی ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق سے ایک خاص تاریخی اہمیت بھی ہے۔ میں اپنے اس مقالے میں کتاب کا اسی پہلو سے جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک عظیم علمی، ادبی اور ثقافتی روایت رہی ہے، حکومت کے زوال سے اس روایت کی عظمت پر حرف نہیں آیا، بلکہ انتہائی بے بسی اور مایوسی کے دور میں بھی عظیم علمی اور ادبی شہ پارے تخلیق ہوتے رہے۔ مولانا حالی اور شبلیؒ بھی اسی عظیم روایت کا حصہ ہیں جنہوں نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' اور ''المامون'' و ''الفاروق'' جیسے ادب پارے انتہائی مایوس کن سیاسی ماحول میں تخلیق کئے۔ علامہ اقبال کی ''شکوہ'' اور ''مسجد قرطبہ'' ایسی ہی تخلیقات کی مثالیں ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں حکومت کے زوال کے علاوہ بھی، ہندوستانی مسلمانوں کو استشراق اور استعمار کے صدمے مسلسل پہنچتے رہے، حتی کہ جب فرنگی استعمار کی زد سے خانۂ کعبہ کی سرزمین بھی محفوظ نہ رہی تو حالیؒ نے کہا:

اے برق آج شعلہ فشاں کیوں نہیں ہے تو

اے رعد آج گرم فغاں کیوں نہیں ہے تو

اے ابر آج گریہ کناں کیوں نہیں ہے تو

دریائے قہر! آج رواں کیوں نہیں ہے تو

اسلام آج کفر کے نرغے میں آگیا
بادل سیاہ رنگ کا کعبے پہ چھا گیا[۱]

استشراق کی غارت گری اس کے سوا تھی۔ جس کا ایک خاص ہدف اسلامی تاریخ تھی۔ مستشرقین کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے اندر (یعنی تمام دنیا میں) ان کے ماضی اور مستقبل کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا کردیں۔ ماضی قابل فخر نہ رہ کر، قابل شرم ہوجائے اور مستقبل تاریک اور مایوس کن نظر آئے۔ حیاتِ شبلیؒ میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ''اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی۔ یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جزو اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا یہ لوگ (مستشرقین) مشنری نہ تھے۔ اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے۔ بلہ ان کا شمار یورپ کے فضلاء میں تھا، (جو) خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے (یہ لوگ) اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی، اور مسلمان بچے جب اسکولوں اور کالجوں میں زیر درس تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں پڑھتے تھے تو شرم سے گردن جھکا لیتے تھے''[۲]

حالات کی یہ تصویر صرف ہندوستان ہی میں نہ تھی بلکہ استعمار اور استشراق کی یہ غارت گری عالم گیر تھی۔ سید صاحب لکھتے ہیں: ''چونکہ ہندوستان، مصر، مراکش، الجزائر اور تونس وغیرہ اسلامی ملکوں میں ان یورپ والوں سے پہلے، مسلمانوں کی (اپنی) سلطنتیں تھیں، اس لئے ان کے تاریک پہلوؤں کو دکھائے بغیر ان کے کارنامے چمک نہیں سکتے تھے، اس بناء پر مسلمان بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کو برا کہنا اور برا دکھانا، ان کے مصنفوں کا سب سے بڑا فرض ہوگیا تھا، ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا''[۳]

ہندوستانی مسلمانوں کے دل میں تمام عالم اسلام کا درد تھا۔ عالم اسلام میں کہیں بھی استعمار کی غارت گری جاری ہویا اسلام اور اہل اسلام پر کہیں سے استشراقی شب

خوں ماریں، اس کا درد اور کرب انہیں بے چین رکھتا تھا۔ مدرسۂ علی گڑھ کا قیام اسی زمانے میں ہوا۔ بانیٔ مدرسہ سرسید احمد خاں استشراق کی ترک تازیوں سے اہل اسلام کی مدافعت خود بھی کر رہے تھے اور اپنے ساتھیوں میں بھی یہ ذوق وشوق اور خود اعتمادی پیدا کرنے میں مصروف تھے[۴] ''خطبات احمدیہ'' ''مسدس مدّو جزر اسلام'' اور ''المامون'' و ''الفاروق'' وغیرہ تصنیفات سے دراصل ان بزرگوں نے اہل اسلام کی مدافعت کی سعی کی تھی۔ مسلمانوں کا اپنے ماضی پر اعتماد اور فخر برقرار رہے، اس کے لئے حالیؒ نے کہا:

نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین
کتب خانۂ پیرس وروم ولندن
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے[۵]

حالیؒ نے مسدس ۱۸۸۵ء میں لکھی تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں مولانا شبلی نعمانیؒ، پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ، نے ''المامون'' تصنیف کی۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمے میں جو ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا، سرسید لکھتے ہیں '' وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو، جو یاد رکھنے کے قابل ہیں، بھلا دے یا ان کو نہ جانے، بزرگوں کے قابلِ یادگار کارناموں کو یاد رکھنا اگر اپنے میں ویسا ہونے کا چسکا ہو تو امرت ہے مگر یہ تو پچھلی بات ہے۔ پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ دلچسپ حالات اور پرفخر واقعات ہم کو ملیں کہاں سے (یہ) ایک نہایت لائق شخص کا کام ہے جو ان کو (تاریخ کے ذخیرہ سے) چنے اور لڑی میں پرو کر سجائے۔ ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسہ کے پروفیسر مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور ایک سلسلہ ''ہیروز آف اسلام'' کا لکھنا چاہا ہے، اسی سلسلہ میں کی یہ کتاب ہے جو ''المامون'' کے نام سے موسوم ہے''۔[۶]

''المامون'' کے برعکس اگرچہ ''الفاروق'' کے مقدمے میں سرسید احمد خاں یا علیگڑھ کا کوئی ذکر موجود نہیں اور شبلیؒ نے اسے ''سلسلۂ آصفیہ'' کے تحت داخل بتایا ہے اور

اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ: ''خاکسار کو ۱۸۹۶ء میں جناب ممدوح (یعنی نظام آصف جاہ) کی پیش کار سے عطیۂ ماہوار کی جو سند عطا ہوئی اس میں یہ بھی درج تھا کہ خاکسار کی تمام آئندہ تصنیفات اس سلسلے (سلسلۂ آصفیہ) میں داخل کی جائیں''[7] تاہم اس بات کی تصریح بھی انہوں نے خود ہی کر دی ہے کہ اس تصنیف کا پلان دراصل ''المامون'' لکھتے وقت ہی بنا تھا۔ لکھتے ہیں: ''الفاروق'' جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ ''المامون'' طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا اس نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ''الفاروق'' کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا''[8]

شبلیؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الفاروق'' بھی دراصل علی گڑھ کے مجوزہ ''ہیروز آف اسلام'' سلسلے ہی کی ایک تصنیف ہے۔ اس بات کی مزید تائید سرسید کے درج ذیل جملوں سے ہوتی ہے۔ جنہیں مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ''الفاروق'' کی تصنیف پر اختلاف رائے'' کے عنوان سے نقل کیا ہے، سرسید لکھتے ہیں: ''ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگانِ دین کو بھی ''ہیروز آف اسلام'' میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں، ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اور نہ ان سے متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں، نہ ہیروز آف اسلام، اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں''[9]

رہا سرسید کا یہ ''اختلاف رائے'' تو اس کی اصل حقیقت یہ نہیں کہ سرسید حضرت عمرؓ وغیرہ بزرگان دین کو جو ''فادر آف اسلام'' ہیں، ہیروز آف اسلام نہیں سمجھتے۔ بلکہ بات یہ تھی کہ بقول سرسید ''ہیروز آف اسلام (سلسلہ) میں حضرت عمرؓ کی لائف کا لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے''[10] (اور) یہی حال ''العلی'' کا ہے''[11] اس سلسلے میں ''سب سے مقدم'' بات سرسید کے نزدیک یہ ہے کہ ''اول اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے اور سچا ہسٹورین بن کر ان کی لائف لکھے''[12]

مولانا سید سلیمان ندوی کے خیال میں اس اختلاف کی وجہ دراصل 'کالج کی

مصلحت، تھی۔ لکھتے ہیں: (سرسید کے اختلاف کی وجہ) کالج کی وہی مصلحت بنی تھی۔ یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سنی اور شیعی کا فرق پیدا کر دے،''[۱۳] لیکن سید صاحب کا یہ تاثر پوری طرح صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ الفاروق کے معاملہ میں سرسید کے پیش نظر ایک بڑی 'مصلحت' اور بھی تھی، جسے خود سید صاحب نے حیات شبلی میں نقل کیا ہے۔ سرسید، جو اپنی شہرت یافتہ 'وہابیت' کے علی الرغم مسلمانوں میں فرقہ وارانہ یگانگت اور یکجہتی کے بہت بڑے داعی تھے، فرماتے ہیں: ''ممکن ہے کہ ان (حضرت عمرؓ) کی لائف اس طرح پر لکھی جاوے جو انسانوں کے لئے باعث رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعث آفت ہو...... (اور) دونوں فریق سنی وشیعہ کو بجز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو''[۱۴]

ایک جگہ تو سید صاحب نے سرسید کے اس نام نہاد 'اختلاف' کو 'مخالفت' کا عنوان دیدیا ہے۔ سرسید کے ایک مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر (کہ انہوں نے الفاروق کے غلغہ سے فائدہ اٹھا کر' جو اس کے وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا تھا، ایک کتاب 'سیرۃ الفاروق' کے نام سے لکھ کر بازار میں پیش کر دی) افسوس کے بعد (سرسید نے) الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کر دی ہے''[۱۵] لیکن راقم کا احساس ہے کہ سید صاحب نے یہ تعبیر اختیار کرنے میں بے احتیاطی کی ہے۔ اس معاملہ میں احتیاط کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید نے شبلیؒ کی ''مولویت'' کے اندیشے سے الفاروق کے مباحث (موضوعات ومضامین) کے سلسلے میں اپنی ترجیحات پیش کی تھیں، جن سے یہ کتاب 'انسانوں کے لئے باعث رحمت' ہو سکے، 'باعث آفت' نہ ہو۔ سرسید کے اسی مضمون سے، جس میں سید صاحب کے بقول، انہوں نے اپنی مخالفت بے پردہ ظاہر کر دی ہے، پتہ چلتا ہے کہ سرسید، الفاروق کے مشتاق تھے، مخالف نہ تھے، اور اسے 'رحمتِ منتظر' تک کہہ رہے تھے۔ فرماتے ہیں! ''ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو بلاشبہ مناسب نہ تھا کہ اس مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے ...... بلکہ اس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلیؒ کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی،''[۱۶]

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں: ''یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلیؒ بددل ہوگئے ہیں۔ اب نہ وہ 'ہیروز آف اسلام' لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے...... (مولوی شبلیؒ) ایسے شخص (ہیں) جو کیا بحیثیتِ علم اور کیا بلحاظ عمدگیٔ تالیف اور کیا بہ نظر طریقۂ ترتیب مضامین میں یادگارِ سلف ہے...... اگر اہل ملک مولوی شبلیؒ کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلیؒ کی تحریر نرالی ہوگی۔ بس ان کو کیا پرواہ ہے، (اور) جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا اور یہ صادق آوے گا ''فتقبل من أحدهما ولم يتقبل من الآخر''۔[۱۷]

جیسا کہ ذکر ہوا سرسید کے نزدیک یہ بات عین ممکن تھی کہ حضرت عمرؓ کی سوانح عمریؒ ایک ایسے طرز پر لکھی جائے جس سے ہیروز آف اسلام سلسلہ کے مقاصد پورے ہوتے ہوں۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''(یہ) ممکن ہے کہ ان (حضرت عمرؓ) کی لائف اس طرح پر لکھی جاوے جو انسانوں کے لئے باعث رحمت ہو۔ (جس کی صورت یہ ہے کہ) اس کا لکھنے والا ان امور کو جو دونوں فریق (شیعہ وسنی) میں متنازعہ فیہ ہیں، مطلق نہ چھیڑے، (بلکہ) وہ ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت وانتظامی قوت اور اس برکت کو لکھے جو ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچی، جن سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا''۔[۱۸]

گویا وہ ''مسدس حالی'' جیسی کوئی چیز چاہتے تھے، البتہ وہ شبلی سے اس کی توقع نہیں رکھ سکتے تھے۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے؟''۔ اس میں شک نہیں کہ ''مولوی'' شبلی نے ایسا نہیں کیا کہ متنازعہ فیہ امور کو مطلق نہ چھیڑتے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام ایسے مقامات میں شبلی نے بالعموم اپنے مذہب ومسلک اور مولویانہ ذوق ورجحان ہی کی نمائندگی کی ہے۔[۱۹] تاہم اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ''الفاروق'' نے ''ہیروز آف اسلام'' سلسلہ کے مقاصد بہرحال پورے کئے۔

سرسید کے نام نہاد اختلاف کی حقیقت بیان کرنے کے بعد، اب ہم کچھ ذکر اس

بات کا کرنا چاہیں گے کہ اپنے مذکورہ بالا خدشات کے باوجود، سرسید کو ''الفاروق'' سے فی الجملہ ایک خاص دلچسپی تھی۔ خود مولانا شبلیؒ ہی کی روایت ہے کہ: ''سرسید مرحوم ''الفاروق'' کا مسودہ اور اس کے چھپے ہوئے اجزاء دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے اور میں مسکرا کر یہ جواب دیتا تھا کہ مشاعرہ سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی''۔[۲۰]

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ''الفاروق'' کی تصنیف کا کام علیگڑھ میں انجام پایا تھا، بلکہ اس کے بعض اجزاء سرسید کی زندگی میں طبع بھی ہوئے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ ہی کے ان کے ایک اور عزیز دوست مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کی روایت ہے کہ مولانا شبلیؒ نے ''مجھ کو ایک ملاقات میں الفاروق کے ایک حصہ کا مطبوعہ پروف اپنے ہاتھ میں لے کر اس شرط سے دکھایا کہ میں صرف اس کا حسنِ طبع دیکھوں، پڑھوں نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا''۔[۲۱] ''سیرۃ النعمان'' کے مقدمے میں خود شبلی کی یہ صراحت موجود ہے کہ ''الفاروق'' کا ایک ''معتد بہ حصہ'' (علی گڑھ میں) لکھا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ یہ 'ہیروز آف اسلام' سلسلے ہی کی ایک تصنیف ہے۔ فرماتے ہیں: ''میں نے خلافت وسلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کئے ...... المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا۔ لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے چند روز کے لئے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا''۔[۲۲]

اب تک کی گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گے کہ ''الفاروق'' علی گڑھ تحریک کا ایک عطیہ ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ علی گڑھ تحریک کے وہ کون سے مقاصد تھے جن کے حصول کے لئے ''ہیروز آف اسلام'' سلسلہ کی تصنیفات کا منصوبہ تیار ہوا تھا۔ المامون اور الفاروق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر تین تھے۔

۱۔ قومی بیداری یا سرسید کے الفاظ میں ''قوم میں اپنے بزرگوں جیسا ہونے کا چسکا'' پیدا کرنا۔

۲۔ اردو کو ایک معیاری علمی وادبی زبان کی حیثیت سے ترقی دینا۔

۳۔ استشراق سے مدافعت۔

پہلے اور دوسرے نمبر کے مقاصد کے لئے سر سید کی اپنی تصریحات الماموں کے مقدمے میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اردو کے سلسلے میں سر سید فرماتے ہیں:

''اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کر دیتا ہے'' [۲۳]

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شبلیؒ کے زمانہ میں علماء اردو کو ایک علمی زبان کے طور پر لائق اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ مولانا سر سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں علماء جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی یا فارسی میں، مولانا (شبلی) نے بھی علی گڑھ (آنے) سے پہلے تک عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑے کوشش سے لکھتے تھے'' [۲۴] شبلی، جو علی گڑھ آنے سے قبل اردو میں خط و کتابت کو بھی عار سمجھتے تھے، علی گڑھ آنے کے بعد بھی ''سیرۃ النعمان'' اردو میں تصنیف کرنے کے لئے عذر پیش کرتے ہیں:

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود
حرف اردو زدن آئیں نبود [۲۵]

تاہم بعد میں یہ صورت حال بدلی، یا بالفاظ دیگر، انہیں بدلی ہوئی صورت حال کا احساس ہوا۔ الماموں کے مقدمے میں فرماتے ہیں: ''موجودہ نسلیں جنہوں نے حال کی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے، اردو کا حق سمجھتے ہیں اور ان کی دلی خواہش ہے کہ اپنی ملکی زبان کو ترقی کے عالی رتبہ پر پہنچائیں''۔ [۲۶]

ہیروز آف اسلام سلسلہ سے شبلی اردو زبان میں ایک ''خاص'' قسم کی صلاحیت اور بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جو ان کے خیال میں، عربی و فارسی کی قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اردو کا حق تھا۔ فرماتے ہیں:

''یہ ضرور ہوا کہ اردو کی وسعت کا ایک قدم اور آگے بڑھا، لیکن افسوس اور عبرت کی جگہ ہے کہ (جو) زبان عربی اور فارسی کو ہٹا کر ہماری علمی اور قومی زبان بنی وہ اسی خاصہ سے محروم رہ گئی، جو قائم مقامی کی حیثیت سے اس کا ذاتی حق تھا، (جب کہ)

یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے، اور اگر یہ نہیں تو قوم قوم نہیں،، [۲۷]

شبلی یہ بھی جانتے تھے کہ اس مقصد کے لئے تاریخ نگاری کا انتخاب کس قدر مفید اور بار آور ثابت ہو سکتا ہے۔ المامون کے مقدمے میں فرماتے ہیں: ''زمانہ کے انقلاب سے مسلمانوں کی قومی خاصیتیں گو بہت کچھ بدل گئیں اور بدلتی جاتی ہیں، تاہم اپنی قومی تاریخ سے جو دلچسپی اور شغف ان کو پہلے تھا، اب بھی ہے آج بھی (اپنی) گذشتہ تاریخ کی طرف ان کو وہ جوشِ التفات ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا،، [۲۸]

کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی ہیروز آف اسلام سیریز کی تصانیف، بشمول الفاروق، سے علی گڑھ تحریک کے یہ مقاصد پورے نہ ہوئے! ''المامون'' کے مقدمے میں خود سرسید نے اس کے ''صاف اور شستہ اردو'' میں ہونے کی سند عطا کی ہے۔ فرماتے ہیں: ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔ ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے (کہ طرز بیان فن تاریخ کے مناسب ہو) اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے، ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی صورت پر موجود ہے،، [۲۹] ''الفاروق'' کے بارے میں حبیب الرحمان خاں شروانی تمام اور باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں: ''......اس موقع پر اگر ہم چند الفاظ الفاروق کی طرز ادا کی نسبت کہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ الفاروق کی تحریر میں جو آزادی ہے، وہ (اگر) بالکل نہیں تو اکثر طرز متقدمین کا پرتو ہے،، [۳۰]

استشراق سے مدافعت، علی گڑھ تحریک کا ایک نمایاں مقصد رہا ہے۔ شبلی نے اپنی بہت سی دیگر تحریروں کی طرح ہیروز آف اسلام سلسلہ کی تصانیف بالخصوص ''الفاروق'' سے بھی یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''ذمی رعایا کے حقوق'' اور ''غلامی کا رواج کم کرنا'' وغیرہ عنوانات کے تحت شبلی نے دراصل مستشرقین ہی کے اعتراضات دفع کرنے کی سعی کی ہے۔ ایسے ہی مقامات میں سے ایک وہ ہے جہاں شبلیؒ نے ''فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ'' کے عنوان سے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کی فتوحات کے ''اسباب'' سے بحث کی

ہے۔ یہ بحث جلد دوم کے آغاز میں تقریباً دس صفحات پر مشتمل ہے۔ مستشرقین کا خیال تھا کہ حضرت عمرؓ کی یہ فتوحات اس لئے ممکن ہوئیں کیونکہ ''اس وقت فارس اور روم دونوں سلطنتیں اوج اقبال سے گزر چکی تھیں''[۳۱] شبلی کہتے ہیں کہ ''یہ جواب گو واقعیت سے خالی نہیں لیکن جس قدر واقعیت ہے اس سے زیادہ استدلال کی ملمع سازی ہے جو یورپ کا خاص انداز ہے''[۳۲] فتوحات کے ''اصل اسباب'' کی نشاندہی کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک اس سوال کا اصل جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت بانیٔ اسلام (مراد ہیں پیغمبر اسلام ﷺ) کی بدولت جو جوش، عزم واستقلال، ہمت، بلند حوصلگی اور دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا، روم وفارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانہ میں بھی اس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں''[۳۳]

اس کے علاوہ شبلیؒ کے نزدیک مسلمانوں کی دیانتداری، انصاف پروری اور عرب عیسائیوں کا، جو شام وعراق میں آباد تھے، مسلمانوں کے ساتھ قومی (یعنی عرب) اتحاد وغیرہ بھی اس کے جزوی اسباب ہو سکتے ہیں[۳۴]

عہد فاروقی کی فتوحات میں حضرت عمرؓ کی شخصی رول کے اہمیت کم کر کے دکھانے والے بعض مستشرقین کی ایک ''عام رائے'' یہ تھی کہ ان فتوحات میں خلیفۂ وقت کی چنداں تخصیص نہیں۔ بلکہ اس وقت کے جوش اور عزم کی جو حالت تھی وہ خود تمام فتوحات کی کفیل تھی۔ شبلی کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، وہ کہتے ہیں ''حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی تو آخر وہی مسلمان تھے''[۳۵]

ایک اور مقام جہاں شبلی مستشرقین سے جو جھتے نظر آتے ہیں، وہ نظامِ حکومت کی بحث ہے۔ اس بحث میں شبلیؒ یہ ثابت کرنے کے بعد کہ حضرت عمرؓ کے گرد و پیش کی جو سلطنتیں تھیں وہ بھی جمہوری نہ تھیں، حضرت عمرؓ کی خلافت کو جمہوری قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں: حضرت معاذ بن جبلؓ نے رومیوں کی سفارت میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے متعلق جو تقریر کی تھی وہ درحقیقت حکومت جمہوری کی اصلی تصویر ہے اور حکومت جمہوری کی حقیقت آج بھی اس سے واضح تر اور صحیح تر نہیں بیان کی جا سکتی''[۳۶]

سر ولیم میور نے جو شبلیؒ کے معاصر ہیں، الفاروق کی اشاعت سے پندرہ سال قبل ۱۸۸۳ء میں اپنی کتاب ''The Caliphate'' میں خلافت کو ایک Autocratic institution (شخصی حکومت) قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ انہیں ''عالم اسلام میں کہیں بھی عوامی حکومت کا کیڑا کلبلاتا نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کے ہاں آج بھی آزادی پسند اور لبرل ادارے موجود نہیں ہیں'' اور یہ کہ ''اسلام کے (سیاسی اور سماجی) اداروں میں کہیں بھی کوئی ترقی یا تبدیلی نہیں آئی ہے''۔[۳۷] (یہ لکھتے ہوئے وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کے زمانے میں عالم اسلام استعمار کے جوئے میں بندھا ہوا تھا) اس پس منظر میں یہ ضروری معلوم ہوا کہ خلافت کو وقت کے مذاق کے موافق ایک جمہوری ادارہ ثابت کیا جائے۔ شبلیؒ نے یہ ''خدمت'' تقریباً سات صفحات میں انجام دی ہے۔[۳۸]

سر ولیم میور کی ''The Caliphate'' اور شبلیؒ کی ''الفاروق'' معاصر تصانیف ہیں۔ دونوں کتابوں کے مقاصد تصنیف میں جو فرق تھا، اسی لحاظ سے ان کے مشمولات میں فرق ہوتا ایک قدرتی بات تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے بیان میں میور صاحب کے ہاں بڑے شہروں میں مسلم نوجوانوں کی بے راہ روی اور آزاد منشی کا ذکر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ شراب، موسیقی اور جوے کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ حتی کہ، ان کے بقول، حضرت عمرؓ کو اپنے متعدد گورنروں کی سرزنش کرنی پڑی اور اپنے ایک صاحبزادے کو بھی اس کے لئے سزا دینی پڑی۔[۳۹]

شبلیؒ نے ''الفاروق'' میں تصویر کا دوسرا رخ یا بالفاظ دیگر، تاریخ کا روشن پہلو دکھایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''پہلے حصے میں تم فتوحات کی تفصیل پڑھ آئے ہو۔ اس سے تمہارے دل پر اس عہد کے مسلماوں کے جوش، ہمت، عزم، استقلال کا قوی اثر پیدا ہوگا''۔[۴۰] سر ولیم میور کے نزدیک فتوحات کے بیان میں مسلمانوں کی اخلاقی خوبیوں کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ جب کہ شبلیؒ جگہ جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایرانی سردار جاپان نے کہا، اس بڑھاپے میں تمہارے کس کام کا ہوں، مجھ کو چھوڑ دو اور معاوضے میں مجھ سے دو نوجوان غلام لو۔ ابو عبیدہ نے منظور کر لیا۔ بعد کو لوگوں نے جاپان کو پہچانا تو غل مچایا کہ ہم ایسے دشمن کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن ابو عبیدہ

نے کہا کہ اسلام میں بدعہدی جائز نہیں''۔[۴۱]

اسی معرکہ کے ذکر میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''ابوعبیدہ نے (فرح) کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ مسلمانوں میں ایک کو دوسرے پر کچھ ترجیح نہیں''۔[۴۲]

اس کے برخلاف سرولیم میور اپنی کتاب میں جہاں کہیں موقع ملتا ہے، عرب عیسائیوں کے کردار کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایرانیوں سے مقابلہ کی تفصیل بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"Backed by a few heroic spirits, amoing them a Christian cief of Bani Tay (Mothanna) Seized the benner.."[۴۳]

(چند جیالوں کی مدد سے، جن میں بنی طے کا ایک عیسائی سردار بھی تھا، مثنیٰ نے علم ہاتھ میں لیا)۔

ایرانیوں کے ساتھ اس معرکہ کی تفصیل میں ایک اور جگہ میور لکھتے ہیں:

"But the most remaskable was a Christian tribe of the desert, which, without detriment to their faithe, threw im their but with Moslems and brought a conting ent to their help.."[۴۴]

یعنی سب سے زیادہ قابل ذکر صحرا کا ایک عیسائی قبیلہ تھا، جس نے، اپنے ایمان (دین) کو کچھ ضرور پہنچائے بغیر، مسلمانوں کی حمایت کا فیصلہ کا اور ایک دستہ لاکران کی مدد کی۔

میور نے اس عیسائی قبیلہ کے مسلمانوں کا ساتھ دینے کی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ شبلیؒ نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

''آج عرب وعجم کا مقابلہ ہے۔ اس قومی معرکہ میں ہم بھی قوم کے ساتھ ہیں''[۴۵] (راقم کے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ اس عہد کے مسلمانوں اور عیسائیوں میں مذہبی یگانگت کا احساس ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل عہد رسالت میں رومیوں اور ساسانیوں کے درمیان معرکہ آرائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومیوں کے ساتھ رہ چکی تھیں)۔[۴۶]

اس کے برخلاف میور یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ عیسائیوں نے مسلمانوں کا ساتھ ضرور دیا تھا، تاہم یہ انہوں نے اپنے دین وایمان کے کسی نقصان کے بغیر کیا تھا۔

حتی کہ حضرت عمرؓ کے قاتل کے بارے میں شبلیؒ یہ بتانے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ وہ ایک پارسی غلام تھا[۴۷] جب کہ میور تفصیل سے بتاتے ہیں کہ وہ پارسی غلام (یعنی ابولولو) بہت پہلے عیسائی ہو چکا تھا[۴۸]

ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ''الفاروق'' کس ماحول میں تصنیف ہوئی اوراس نے جمیعت اسلام کی بالعموم اور اسلامیان ہند کی بالخصوص کیا خدمت انجام دی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جس طرح عجم کے ساتھ مسلمانوں کی معرکہ آرائی میں قبیلۂ نمر اور تغلب کے عیسائی سرداروں نے حمیتِ قومی نام سے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا، بہت سے شیعہ علماء نے حمیتِ اسلامی کے جذبے سے ''الفاروق'' کی تصنیف واشاعت کا خیر مقدم کیا تھا۔ جن میں علی گڑھ تحریک کے ایک سرکردہ رکن مولوی سمیع اللہ خان کے علاوہ ایک نہایت سربرآوردہ شخصیت عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے سرسید کو ایک خط میں لکھا تھا: ''اسلام میں دین ودنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروقؓ کی ہے اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے''[۴۹]

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ The role of Minorities in freedom struggle, Asghar ali engineer (Ed) Ajanta publications, Delhi-1986 P-32

۲۔ ''حیات شبلیؒ'' مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰، ص: ۲۳۔۲۴

۳۔ ایضاً ص: ۲۴

۴۔ مسدس مدو جزر اسلام کے مقدمہ میں مولانا حالیؔ لکھتے ہیں:

''قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کررہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے)۔ آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعوی کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے''۔

مسدس مدو جزر اسلام۔ خدا بخش ایڈیشن ۱۹۹۵۰، ص: ۵

۵۔ مسدس حالی ''مدو جزر اسلام'' خدا بخش ایڈیشن، ۱۹۹۵ ص: ۱۳۔۱۴

۶۔ ''المامون'' مولانا شبلی النعمانی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۷ ص ۱

۷۔ ''الفاروق'' مولانا شبلی نعمان، مطبوعہ، لاہوئی فائن آرٹ پریس، تاریخ درج نہیں فرید بک ڈپو، چتلی قبر دہلی۔ ۶ ص: ۴/۲۰

۸۔ ایضاً، ص: ۱/۱۷

۹۔ حیات شبلی، ص: ۲۳۶

۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۳۴

۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۳۲

۱۲۔ ایضاً، ص: ۲۳۴

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۳۱

۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۳۴

۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۳۳

۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۳۴

۱۷۔ ایضاً،ص:۲۳۴۔۲۳۵

۱۸۔ ایضاً،ص:۲۳۴۔۲۳۵

۱۹۔ چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں:''الفاروق کیا شیعہ وسنی مباحث کا فیصلہ نہیں'' ''حیات شبلی''،ص:۳۵

۲۰۔ ایضاً،ص:۳۳۷

۲۱۔ ایضاً،ص:۳۳۷

۲۲۔ سیرۃ النعمان۔مولانا شبلی نعمانی۔مکتبہ برہان،اردو بازار،جامع مسجد،دہلی۔۶ تاریخ درج نہیں،ص:۸

۲۳۔ المامون،ص:۳

۲۴۔ ایضاً،ص:۳۳

۲۵۔ سیرۃ النعمان،مولانا شبلی نعمانی۔مکتبہ برہان،اردو بازار جامع مسجد دہلی۔۶ ص:۷

۲۶۔ المامون،ص:۷

۲۷۔ ایضاً،ص:۸

۲۸۔ ایضاً،ص:۶

۲۹۔ ایضاً،ص:۳۔۴

۳۰۔ مقالات شروانی،حبیب الرحمان خاں شروانی،حبیب منزل،علی گڑھ ۱۹۴۶ء ص:۴۶

۳۱۔ الفاروق،ص:۲۲۹

۳۲۔ ایضاً،ص:۲۳۰

۳۳۔ ایضاً،ص:۲۳۲

۳۴۔ ایضاً،ص:۲۳۳۔۲۳۵

۳۵۔ ایضاً،ص:۲۳۶ The Encyclopaedia of Islam کے مقالہ نگار نے عہد فاروقی کی فتوحات کے باب میں مستشرقین کے تحفظات کو مسترد کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے شخصی رول کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے، اگر چہ وہ اسے حضرت عمرؓ کی ایک ناکامی شمار کرتا ہے کہ وہ ان مسائل کا کوئی قطعی حل دریافت نہ کرسکے جن سامنا ان کے بعد حضرات عثمان وعلی کو کرنا پڑا۔ دیکھئے The Encyclopaedia of Islam New Edition 2000, Leiden, Brill, Vol.x, P.820

۳۶۔ ایضاً،ص: ۲۴۷

۳۷۔ The Caliphate, Its Rise, Decline and Fall Sir William Muir, Beirut, 1965.P. xiii-xiv

۳۸۔ الفاروق،ص: ۲۴۱۔۲۴۷

۳۹۔ The Caliphate, P.193-196

۴۰۔ الفاروق،ص: ۲۲۸

۴۱۔ الفاروق،ص: ۱۰۲

۴۲۔ ایضاً،ص: ۱۰۳

۴۳۔ The Caliphate, P.92

۴۴۔ I bid, P.94 مزید مثالوں کے لئے دیکھئے: PP. 96-98 عیسائیوں کے ان احسانات کا صلہ مسلمانوں کی طرف سے کیا ملا؟ فتح دمشق کے ذکر میں میور لکھتے ہیں: تمام املاک (مال وجائداد، نجی وسرکاری) کا نصف حصہ ایک قرار دادِ سپردگی کے بموجب فاتحین (یعنی مسلمانوں) کو دیدیا گیا اسی طرح تمام گرجا گھروں کو دوحصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ مسلمانوں کے لئے مخصوص کردیا گیا، جس میں اسلامی طریقے سے عبادت ہوتی تھی اور قبے کی بلندی سے موذن روزانہ عرب کے پیغمبر (گویا حضرت عیسیٰ یورپین پیغمبر تھے) کی بالادستی کا اعلان کرتا تھا۔ مفتوحین کے ساتھ اسی قسم کا سلوک پورے ملک (شام) میں روا رکھا گیا۔ بازنطینی عہد کے تمام ٹیکسوں کو باقی رکھتے ہوئے مزید ٹیکس عائد کئے گئے اور ہر عیسائی سے جو اسلام قبول کرنے سے انکار کرے، سونے کی ایک اشرفی اور غلے کا ایک حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ PP. 104-105

۴۵۔ الفاروق،ص: ۱۰۶

۴۶۔ دیکھئے: تفسیر سورۂ روم آیات ۱۔۳

۴۷۔ الفاروق،ص: ۲۲۱

۴۸۔ The Caliphate, P.198

۴۹۔ حیات شبلی،ص: ۲۳۱

☆☆☆

ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

(روداد سمینار)

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مولانا شبلی نعمانی (ذوالقعدہ ۱۲۷۴ھ/مئی ۱۸۵۷ء۔ ۲۲ ذوالحجہ ۱۳۳۲۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء) کی مشہور زمانہ صنیف الفاروق کا عظیم الشان پہلو یہ ہے کہ پہلی بار علم و تحقیق کی دنیا میں سیدنا عمر فاروقؓ کی زندگی اور متنوع خدمات پر بڑے صاف، شستہ اور دلنشیں اسلوب میں علم و تحقیق کے اعلی ترین تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے ایک ایسی کتاب وجود میں آئی جس نے تاریخ اسلام کی اس عظیم ترین شخصیت کے جلال و جمال پر بھر پور روشنی ڈالی۔ جن کے بارے میں خود مصنف کا احساس یہ تھا کہ اس اثناء میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں لیکن جو نگاہیں فاروق اعظم کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں ان کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہو سکتی تھی''۔ مولانا شبلی نعمانی کے دوست مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی کے تاثرات اس مایۂ ناز تصنیف کے بارے میں بڑے خوشگوار ہیں۔ ''الفاروق کی آمد آمد کا آوازہ مدت سے ملک میں بلند تھا، پبلک کا شوق وقفِ انتظار تھا، خلیفہ ثانی کی لائف کی عظمت واہمیت علامہ مصنف کے پیش نظر تھی......... لہٰذا الفاروق کو دیکھ کر ہم نے بے تأمل کہا دیر آید درست آید اور جب ہم نے اس میں ان کتابوں کے حوالے دیکھے جو قسطنطنیہ میں مصنف کی نظر سے گذری تھیں تو ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا'' دیر آمدہ دیر آمدۂ زراہ دور آمدہ''۔

مصنف کی اس رجحان ساز تصنیف پر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر، ماہر اسلامیات پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے دو روزہ قومی سمینار کے انعقاد کا اعلان کیا تو اربابِ علم وفضل نے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ مدارس دینیہ کے کہنہ مشق اساتذہ اور عصری جامعات کے ادیبوں اور فضلاء نے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا

چنانچہ ۱۸۔۱۹/ نومبر ۲۰۰۱ء کو منعقد ہونے والے اس سمینار میں ملک کے نمائندہ مدارس اور جامعات کے اساتذہ نے تقریباً ۲۶ مقالے پیش کیے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نوجوان محققین اور ریسرچ اسکالرس نے بھی طبع آزمائی کی، نیز ااردو، عربی، فارسی اور دینیات کے شعبوں کے علاوہ فلسفۂ معاشیات تاریخ طب، انگریزی، سیاسیات، ویسٹ اسٹین اسٹڈیز وغیرہ کے مضامین کے ماہرین نے اپنے مقالات، تبصروں اور مباحثوں میں شرکت سے سمینار کو کامیاب بنایا۔

سمینار کا افتتاح کانفرنس ہال، ایڈمنسٹریٹیو بلاک میں جناب قاری عتیق الرحمان کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جناب ریحان بدر متعلم بی۔ اے نے علامہ عامر عثمانی کی معروف زمانہ منقبتِ فاروقی پیش کر کے حضرت عمرؓ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا:

عدل وہ عدل کہ مجرم ہو اگر ابن عمرؓ ☆ دستِ قانون کی تلوار بنے باپ کا پیار
فقر اس شان کا ملبوس ہیں دسیوں پیوند ☆ سروری ایسی کہ شاہانِ جہاں باجگزار

پروفیسر عبد العلی نے جناب شیخ الجامعہ محمد حامد انصاری، مہمانِ خصوصی مولانا سید رابع حسنی ندوی، صدر اجلاس پروفیسر نجات اللہ صدیقی، ڈائریکٹر سمینار پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اور تمام مندوبین اور مہمانوں کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ جبکہ ڈائریکٹر سمینار نے سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے الفاروق کو اسلامی تاریخ نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز قرار دیا۔ الفاروق کی اشاعت کو ایک سو ایک سال مکمل ہونے پر اس عظیم الشان تحقیقی تصنیف کو خراج پیش کرنا اس سمینار کا ایک اہم مقصد ہے کیونکہ مسلم یونیورسٹی پر علامہ شبلی نعمانی کا حق دوسرے عمائدینِ تحریک علیگڑھ سے کچھ کم نہیں ہے۔ پروفیسر صدیقی نے الفاروق کی جلد دوم کو علامہ شبلی کی ادبیت، تحقیقی مزاج اور اسلوبِ نگارش کی اصل تماشہ گاہ قرار دیا۔

مہمانِ خصوصی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے علامہ شبلی نعمانی کی علمی وتحقیقی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی، ندوہ کی ترویج وترقی پر فاضل محقق کے زبردست اثرات کا آپ نے جائزہ لیا اور بطور خاص الفاروق کو اسلامی تاریخ نویسی

کے میدان میں ایک اہم سنگِ میل قرار دیا، انہوں نے فرمایا کہ الفاروق وہ اہم تصنیف ہے جس نے امتِ مسلمہ ہندیہ کے دانشور طبقے سے بہت خراجِ تحسین حاصل کیا بلکہ اس دور میں مسلمانوں کی شکستہ دلی اور اسلامی سربلندی کے پہلو سے موجود مایوسی اور احساسِ کمتری کو ختم کرنے اور اسلامی عظمت کا احساس دلانے کا کام بھی انجام دیا، انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یہ رائے بھی نقل کی کہ الفاروق شبلی کی انشاء پردازی کا شاہکار ہے۔ نیز یہ کہ دبستانِ شبلی نے بحث وتحقیق، وسعتِ مطالعہ، قلم کی شائستگی اور تحریر کی شگفتگی کے دلآویز نمونے پیش کیے۔ انہوں نے فرمایا کہ علامہ شبلی کے کارناموں کی قدر ماند پڑتی جارہی تھی، ان کی قدر دانی کو ابھارنے کی ضرورت تھی، اس سلسلہ میں یہ سمینار ایک بڑا قابل قدر اقدام ہے، میں اس کے منتظمین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شیخ الجامعہ جناب محمد حامد انصاری نے سمینار کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا اور اس پر زور دیا کہ اردو کے ساتھ عربی اور انگریزی زبانوں میں ہماری تحقیقات بین الاقوامی معیار کے مطابق منظر عام پر آئیں تو ان کی افادیت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ انہوں نے مختلف مقامی اور عالمی زبانوں میں اسلام اور اسلامی مطالعات کو پیش کرنے پر زور دیا۔ جبکہ ماہر معاشیات اسلامی پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے علامہ شبلی نعمانی اوران کی تصنیف الفاروق کے محاسن پر گفتگو کرتے ہوئے خود احتسابی کی راہ دکھائی کہ ہماری تحقیقات وتصنیفات بین الاقوامی معیار پر کس حدتک پوری اترتی ہیں اس ضمن میں پچھلے دس سالوں کی بین الاقوامی اسلامی تحقیقات میں ہندوستانی علماء اور دانشوروں کے حوالے کس حدتک دئے گئے ہیں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے علمی میدان میں مسابقت پر زور دیا۔ پروفیسر عضدالدین خان، نے کلماتِ تشکر ادا کئے اور ڈاکٹر عبیداللہ فہد نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

پہلا علمی اجلاس پروفیسر عبدالحق انصاری کی صدارت میں اور جناب عبدالمجید خاں کی نظامت میں منعقد ہوا جب کہ شیماء فہد متعلمہ بی۔ اے سال اول نے بارگاہ رسالت مآب میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر محمد راشد ندوی، سابق صدر شعبۂ عربی

نے ''الفاروق اور المامون'' کے تقابلی مطالعہ پر اپنا مقالہ پیش کیا، انہوں نے دونوں تصانیف کے تصنیفی محرکات سے بھی بحث کی، اور دونوں کے اسلوب اور فکروفن کا جائزہ لیا۔ المامون کے ذریعہ مقالہ نگار کی رائے میں شبلی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام ایک عالم گیر تہذیب ہے جن کی بنیاد علم وحکمت پر ہے، جب کہ الفاروق کے ذریعہ اسلامی نظامِ حکومت کے خدو خال اجاگر کئے۔

پروفیسر اختر الواسع، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، نے اپنے مقالے میں الفاروق کا عمومی جائزہ لیا، انہوں نے الفاروق کو سوانح عمری نہیں بلکہ تاریخی دستاویز قرار دیا، جبکہ محترمہ انجم آرا فلاحی نے حضرت عمرؓ کی جامع کمالات شخصیت سے بحث کی۔ اور انہوں نے اولیاتِ عمرؓ کی فہرست بھی پیش کی اور الفاروق کو علامہ شبلی نعمانی کی اولیات میں سرفہرست قرار دیا۔ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے الفاروق کے مآخذ ومصادر کا تجزیہ پیش کیا۔ انہوں نے عربی کے علاوہ ان فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کی فہرست بھی پیش کی جن سے فاضل مصنف نے استفادہ کیا ہے۔ مصادر کے بعض حوالوں کو شبلی نے درایت کے اصول پر پرکھا ہے جبکہ علم جغرافیہ کی عربی امہاتِ کتب سے استفادہ بھی اس تصنیف میں نظر آتا ہے مگر ان کے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سرور عالم ندوی کے مقالے کا عنوان تھا ''اردو سوانح عمری میں الفاروق کا مقام ومرتبہ''۔ انہوں نے بعد کی تمام تحریروں پر الفاروق کے اثرات کا جائزہ لیا۔

اس اجلاس میں پروفیسر لیٰسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر عبید اللہ فہد، جناب احسان اللہ خاں ندوی، مولانا محمد احسن نیازی، ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، مولانا نظام الدین اصلاحی، پروفیسر محمد اسلم اصلاحی، اور مولانا اشید جمال ندوی نے بحث میں حصہ لیا۔ صدر اجلاس پروفیسر محمد عبد الحق انصاری نے مقالات پر بحث کرتے ہوئے کچھ سوالات اٹھائے مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی کی ازالۃ الخفاء اور شبلی کی الفاروق کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اس طرح ڈاکٹر القلاجی اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور شبلی نعمانی کی تحریروں کا مقارنہ کیا جائے اور پھر الفاروق کی قدر وقیمت متعین کی جائے۔ آپ نے مغربی ملکوں میں اسلام کے مختلف

پہلوؤں پر ہونے والی تحقیقات اور دور جدید میں مسلمانوں کو درپیش مسائل کے تناظر میں الفاروق کے مطالعہ پر زور دیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت مولانا نظام الدین اصلاحی شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ نے فرمائی۔ جبکہ اس اجلاس کے ناظم ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری تھے۔ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا نے حضرت عمر فاروقؓ کی عبقریت پر الفاروق کے حوالے سے گفتگو کی۔ جبکہ ویمنس کالج کی استاد ڈاکٹر قیصر حبیب ہاشمی نے دور جدید میں الفاروق کی معنویت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی نے الفاروق کے فقہی مباحث پر بڑے جامع اور مفصل انداز میں روشنی ڈالی۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کی فقیہانہ بصیرت اور ان کے اجتہادات پر مدلل گفتگو فرمائی۔ انہوں نے اصولِ تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے ازالۃ الخفاء پر شبلی کے مکمل انحصار کو سوالیہ نشان قرار دیا اور اصل ماخذ کا حوالہ نہ دینے پر تنقید کی۔ مولانا محمد اسلام عمری نے ''الفاروق اور علم حدیث'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر محمد مسعود خاں ندوی، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، اور ڈاکٹر عبیداللہ فہد نے فاضل مقالہ نگاروں سے سوالات کئے اور مختلف وضاحتیں طلب کیں، اپنے صدارتی کلمات میں مولانا نظام الدین اصلاحی نے مقالات کے معیار اور پیشکش کو سراہا مگر حضرت عمرؓ کی فوجی عبقربت پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے زور دیا کہ جسموں اور ملکوں کو فتح کرنے سے پہلے وہ دلوں کو فتح کرتے تھے اور یہ تعلیم آپ کو نبی اکرم ﷺ کی زندگی سے ملی تھی، اسی طرح آپ نے حضرت عمرؓ کی شدت پسندی کے ساتھ ان کے نظام مشاورت کو اجاگر کرنے پر بھی زور دیا۔

تیسرا اجلاس پروفیسر محمد راشد ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر شارق عقیل نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمائی، رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت کی پیشکش کے بعد مقالات کی خواندگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر عبد الحمید فاضلی نے ''علامہ شبلی کی سوانحی تصنیفات کا تقابل الفاروق کے مواد، معیار اور اسلوب سے کیا۔

جبکہ مولانا عبد المعید مدنی نے ''الفاروق کے منہجی مطالعہ'' پر اپنا مقالہ پیش کیا اور علامہ شبلی نعمانی کے اصولِ تحقیق اور منہاجیات پر تنقید کی۔ ان کے مطابق شبلی جمہوریت، سیکولرازم، اور نیشنلزم کی مروجہ مغربی اصطلاحات اور اندازِ فکر سے متأثر تھے، جبکہ اسلامی تاریخ نویسی میں محدثین کے مناہج پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ محترمہ ثمینہ بی نے الفاروق میں موجود حضرت عمرؓ کے تعلیمی نظریات اور خدمات سے بحث کی۔

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے شبلی کی تاریخ نویسی کا جائزہ الفاروق کے حوالے سے لیا، فاضل محقق کے مطابق شبلی نے تاریخی واقعہ اور قیاس واجتہاد کو الگ الگ برتا ہے، انہوں نے درایت کے اصول، معلمین یورپ سے نہیں محدثین سے اخذ کئے ہیں۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ تاریخ نگاری میں صورت واقعہ کو انفرادی نظریات اور قیاسات سے ہمیشہ الگ رکھنا چاہئے۔ صدر اجلاس نے علامہ شبلی نعمانی پر ہونے والے بعض اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی اور تمام مقالہ نگاروں کو انہوں نے مبارکباد پیش کیا۔

۱۹ر نومبر کی صبح ۹ بجے چوتھا اجلاس مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر توقیر عالم نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری نے عربی کتب سیرتِ فاروقی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر حسین ہیکل، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عباس محمود عقاد، اور دوسرے جدید ادیبوں کی تحریروں کا تقابل الفاروق سے کیا۔ اور شبلی کے امتیاز پر مدلل گفتگو فرمائی۔ مولانا نظام الدین اصلاحی نے الفاروق کے حوالہ سے اسلامی ریاست کا مفصل خاکہ پیش کیا اور اس بات پر زور دیا کہ حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں ہی الفاروق کا مطالعہ مفید اور مؤثر ہوگا انہوں نے بعض علماء کے اس اشکال کو بھی رفع کیا کہ شبلی نے الفاروق میں حضرت عمرؓ کی سیاسی عبقریت پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے مگر ان کی دینی اور روحانی حیثیت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے حضرت عمر فاروقؓ کے نظامِ جمہوری پر بڑے مؤثر انداز میں گفتگو کی اور ان کے نظام سیاست کو قیامت تک کے لئے اسوہ اور انتہائی ترقی یافتہ نظام قرار دیا۔

پروفیسر حکیم الطاف احمد اعظمی ڈین فیکلٹی آف ہسٹری آف یونانی میڈیسن، جامعہ

ہمدرد، نئی دہلی نے الفاروق کے حوالہ سے سوانح نگاری کے بنیادی اصولوں پر اپنا خوبصورت مقالہ پیش کیا۔ آپ نے مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، اور مولوی چراغ علی کی منہاجیات اوران کے تاریخی رجحانات کا جائزہ لیا اور شبلی کو سوانح نگاروں کی کہکشاں میں ایک قائد اور رہنما قرار دیا۔ انہوں نے شبلی کی مشہور تصنیف سیرۃ النعمان کو جادۂ اعتدال سے کسی قدر ہٹی ہوئی اور فقہ حنفی کی وکیل اور ترجمان قرار دیا۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے حضرت عمر فاروقؓ کے فہم قرآن پر روشنی ڈالی اور الفاروق کے حوالے سے قرآن اور اس کے علوم کی اشاعت میں حضرت عمرؓ کی کوششوں اور خدمات اور قرآن کے فہم اور اس سے استنباط کے سلسلہ میں آپ کے مقام ومرتبہ پر بھرپور روشنی ڈالی۔ سید علیم اشرف جائسی نے الفاروق کی ادبی خدمات پر اچھے اسلوب میں ایک جامع مقالہ پیش کیا۔ ایک ایسی کتاب میں جہاں واقعات ومہمات کی کثرت مصنف کے قلم کو دم مارنے کی گنجائش نہیں دیتا، انشا نگاری کا امکان کم رہ جاتا ہے مگر شبلی کی ادبیت سنگلاخ زمینوں سے بھی لطافت کے چشمے نکال لیتی ہے۔ پروفیسر محمود الحق نے معاصرین شبلی پر گفتگو کرتے ہوئے مصر کے شیخ محمد عبدہ، جمال الدین افغانی اور علامہ شکیب ارسلان کے اسلوب اور مزاج سے انہیں ہم آہنگ قرار دیا۔

سمینار کے پانچویں اجلاس میں پروفیسر سید احتشام احمد ندوی نے صدارت اور مولانا عبد المعید مدنی نے نظامت فرمائی۔ جناب احسان اللہ خاں ندوی نے امام ابو یحییٰ خاں کو نوشہروی کی تصنیف حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریے اور الفاروق'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ مولانا محمد جرجیس کریمی نے الفاروق کے حواشی پر بعض علمی نکات اٹھائے۔ انہوں نے متن کتاب اور حاشیہ کا تقابلی مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا کہ حاشیہ نگاری میں بھی فاضل مصنف کی دقیقہ سنجی اور تبحر علمی کا مظاہرہ پایا جاتا ہے۔ پروفیسر عبد العلی نے حضرت عمر فاروقؓ پر مستشرقین کے لگائے ہوئے الزامات کے جوابات شبلی کا جائزہ لیا اور انگریزی زبان میں مقالہ پیش کرتے ہوئے سر ولیم میور، اڈورڈ گبن، پی۔ کے۔ ہٹی اور پیٹر مینس فیلڈ وغیرہ نے سیدنا عمر فاروقؓ کی زندگی پر جو اعتراضات قائم کئے ہیں اور ان کی جو تردید علامہ

شبلی نے کی ہے اس پر آپ نے بڑا خوبصورت محاکمہ پیش کیا۔

شعبہ معاشیات کے سینئر استاذ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی کے مقالے کا موضوع تھا ''الفاروق کے معاشی مباحث کا تجزیہ'' فاضل مقالہ نگار نے ان معاشی مباحث کو اسلام کی معاشی فکر کی تاریخ میں بہت اہم قرار دیا۔ بیت المال کے قیام وانتظام، حکومت کے ذرائع آمدنی، مصارف عامہ، معاشی فروغ کے لئے کوششیں، نظام احتساب، سکہ کا اجراء اور زر کی کیفیت اور معاشی جمہوریت کے عنوانات کے تحت علامہ شبلی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا فاضل مقالہ نگار نے جائزہ لیا۔ انہوں نے شبلی کے بیانات میں بعض جگہوں پر تعارض بھی محسوس کیا۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے الفاروق کے تراجم پر تحقیقی مقالہ پڑھا۔ انہوں نے عربی، فارسی، انگریزی، پشتو، ترکی، اور ملیالم زبانوں میں تراجم کا مطالعہ پیش کیا، جبکہ پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے خطابتِ فاروقی پر دلنشین اسلوب میں گفتگو کی، اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنے مخصوص انداز میں الفاروق کا بھرپور تجزیہ پیش کیا اور پوری کتاب کے تمام مباحث پر مدلل گفتگو فرمائی۔ ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی نے فقہی درایت کے حوالہ سے الفاروق کو موضوع بحث بنایا اور جناب عبد السلام جیلانی نے نظامِ جمہوری کی تفصیلات الفاروق کے تناظر میں پیش کیں۔

اس جلاس کے آغاز میں ڈاکٹر سرور عالم ندوی نے علامہ اقبال کی مشہور غزل ''کبھی اے حقیقت منتظر'' اپنے مترنم آواز میں پیش کیا۔ جبکہ صدر اجلاس نے حضرت عمر فاروقؓ کے اس انتظامی دبدبہ پر بطور خاص روشنی ڈالی کہ انہوں نے فاتح اعظم حضرت خالد بن ولیدؓ کو انتظامی حکمتوں کے تحت بیک جنبشِ قلم معزول کر دیا اور پوری اسلامی خلافت میں کہیں سے بغاوت کی کوئی بوتک محسوس نہ ہوئی۔ اس اجلاس میں سامعین نے کھل کر سوالات کئے۔

چھٹے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمود الحق نے فرمائی جبکہ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ظفر الاسلام نے انجام دیا۔ محترمہ انجم آرا فلاحی نے نعتِ پاک پیش کر کے اجلاس کا آغاز کیا، محترم عبد المجید خاں نے انگریزی زبان میں الفاروق کے انگریزی ترجمہ پر اپنا مفصل

مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے برطانوی مستشرقین کی نگارشاتِ فاروقی کے پسِ منظر میں الفاروق کی قدر و قیمت متعین کی جبکہ ڈاکٹر نذیر احمد عبد المجید قاسمی کے مقالے کا موضوع بڑا نادر تھا ''الفاروق علیگڑھ تحریک کا ایک عطیہ''۔ ڈاکٹر عبد المتین نے سائمن اوکلے اور شبلی کی تحریروں کا انگریزی زبان میں بڑے مؤثر انداز میں تجزیہ کیا، اور مفتی محمد مشتاق تجاروی نے ''ازالۃ الخفاء اور الفاروق'' کے مقارنہ کو موضوع بحث بنایا۔ ڈکٹر عبید اللہ فہد نے حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ سے الفاروق کے تناظر میں بحث کی، انہوں نے حضرت عمرؓ کے دوایوانی پارلیمانی نظام پر خاص طور سے روشنی ڈالی جس میں خلیفہ کو ویٹو پاور حاصل نہ تھا، انہوں نے مولانا مودودی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا عبد الرحمان کیلانی وغیرہ کے مقابلہ میں شبلی نعمانی کے نظریات کی تائید کی۔

شرکاء اجلاس نے مقالات پر سیر حاصل تبصرے کیے۔ جناب فرخ جلالی نے شوریٰ کے تعلق سے مقالہ نگار کی رائے کی تائید کی، جبکہ پروفیسر عبد الحق انصاری اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کو بعض پہلوؤں سے کافی اختلاف رہا، وہ خلیفہ کو ویٹو پاور دینے کے طرفدار نظر آئے۔ پروفیسر صدیقی فاروقی نظام حکومت کو شخصی یا جمہوری قرار دینے کے خلاف تھے وہ اسے محض خلافت کہنے پر زور دے رہے تھے۔ ان کے مطابق شوریٰ کا نظام بہت زیادہ قابلِ عمل نہیں ہوسکتا۔

الوداعی اجلاس کی صدارت حکیم الطاف احمد اعظمی نے کی جبکہ اس کے ناظم ڈاکٹر عبد المتین صاحب تھے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ڈاکٹر عبید اللہ فہد اور ان کے تمام رفیقوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی کی دینی بصیرت اور مستشرقین کی ملمع سازیوں کے خلاف ان کے دینی دفاع پر بطور خاص زور دیا۔
مولانا نظام الدین اصلاحی نے مغربی فکر و ثقافت کے مقابلہ میں شبلی، مودودی اور اقبال کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ آپ نے تمام مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی تجویز رکھی، ڈائریکٹر سمینار پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ: میں حضرت عمرؓ کے ''تصرف'' کا قائل تھا اب ان کے ذریعہ شبلی کے ''تصرف'' کا

بھی قائل ہو گیا۔ اسی تصرف نے فاضل دانشوروں اور علماء کو یہاں جمع کیا۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد نے نمناک آنکھوں سے مہمانوں کو الوداع کہا، صدر اجلاس نے اس عظیم موضوع پر سمینار منعقد کرنے کے لئے شعبہ اسلامک اسٹڈیز اور اس کے کار پردازان کی خدمت میں تبریک پیش کی۔ اور چلتے چلتے صدر شعبہ کی خدمت میں یہ عرضداشت بھی پیش کی:

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

☆☆☆

علامہ شبلی نعمانی

منتخب کتابیات

کبیر احمد خاں

مختصر حالات زندگی:

شبلی نعمانی (ابتدائی تحریروں میں محمد شبلی، بعد میں محمد شبلی نعمانیؒ) کی پیدائش اعظم گڑھ پرگنہ سگڑی کے قصبہ بندول میں بتاریخ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۸ر مئی ۱۸۵۷ء میں ہوئی (حیات شبلی: ۶۸)۔ رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کرنے کے بعد مولانا چڑیا کوٹی سے علم کلام، مولانا ارشاد احمد مجددی رامپوری سے علم الفقہ، فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب اور مولانا احمد علی سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ وہ فروری ۱۸۸۳ء میں علیگڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے (حیات شبلی: ۱۲۲) اور درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔ علیگڑھ کے قیام نے شبلی کی شخصیت کی ساخت وپرداخت اور ذہنی نشونما میں غیر معمولی صلاحیت پیدا کی۔ یہاں پر ایک طرف تو ان کی سرسید سے رفاقت بڑھی اور دوسری طرف ان کے اندر ہندوستان کی تعمیر نو میں حصہ لینے کا احساس بھی فروغ پاتا رہا۔ پروفیسر ٹامس آرنالڈ نے شبلی کو علم تاریخ کے جدید سائنٹفک اصولوں سے ہی واقف نہیں کرایا بلکہ مغرب میں ہونے والی علمی ترقی سے بھی روشناس کرایا۔ وہ قدیم کتابوں کے مطالعہ کے مقصد سے اسلامی ممالک کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۲۳ر مئی ۱۸۹۲ء کو قسطنطنیہ پہنچے۔ اسی دوران ان کو ۱۴ر نومبر ۱۸۹۲ء کو تمغہ مجیدی ملا اور ساتھ میں ایک شاہی فرمان بھی (شبلی نقادوں کی نظر میں: ۱۵)۔ ترکی سے بیروت، دمشق، اسکندریہ اور قاہرہ پہنچے۔ انہوں نے جون ۱۸۹۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ علیگڑھ میں ملازمت کے دوران ہی شبلی کو ۱۹ر جنوری ۱۸۹۴ء کو حکومت ہند کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ انہوں نے اعظم گڑھ میں ۲۰ر جون ۱۸۸۳ء کو ایک نیشنل اسکول قائم کیا، وہ مئی ۱۹۰۱ء تا جنوری ۱۹۰۵ء حیدر آباد میں سررشتۂ علوم وفنون میں نظامت کے عہدہ

پر فائز رہے۔ ۱۹۰۰ء میں جب ہندی اور اردو کی چپقلش کے نتیجے میں دہلی میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی تو پروفیسر آرنالڈ اس کے صدر اور علامہ شبلی اس کے سکریٹری ہوگئے۔ مولانا شبلی ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۳ء دار العلوم ندوہ کے معتمد بھی رہے۔ ان کے دور معتمدی میں جہاں ایک طرف ندوہ میں نصاب کو تبدیل کیا گیا وہیں نہ صرف انگریزی کو نصاب میں داخل کیا گیا بلکہ اسلام پر بیجا اعتراض کرنے والے آریہ سماجیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ہندی اور سنسکرت کا بھی ایک درجہ قائم کیا گیا تاکہ طلبا ان زبانوں کو سیکھ کر ان کا مقابلہ کرسکیں۔ وہ ندوۃ العلماء کے رسالہ ''الندوہ'' کے ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۲ء مدیر بھی رہے۔ علامہ مذہب اسلام اور اس کے قوانین کے تئیں بہت ہی فکرمند تھے مثلاً قانون وقف علی الاولاد کی ان کی تجویز اور ترتیب، اس کے لئے انہوں نے تحریک بھی چلائی اور کمیٹیاں بھی بنائیں۔ دوسرے اور بہت سے تعلیمی اور سیاسی کاموں کے علاوہ ان کی دار المصنفین کی تجویز بھی بہت اہم ہے جس کے بیشتر مراحل ان کے سامنے ہی طے ہوچکے تھے۔ ان کا انتقال ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا (حیات شبلی: ۷۲۵)

علامہ شبلی نعمانیؒ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ سرسید کے رفقاء میں شبلی ہی کی تصانیف میں جدت، آزادیٔ فکر اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی اور تحقیقی علمی اور قومی مشاغل میں حصہ لیا۔ چنانچہ جہاں ایک طرف ان کے سیاسی خیالات نے مسلمانان ہند کے ذہن کو بدلنے میں بڑا کام کیا وہیں دینیات میں انہوں نے فکر وتصور کے نئے راستے دریافت کئے۔

شبلی نعمانی کی خدمات:

مولانا شبلیؒ نے علم وفن کے تقریباً تمام شعبوں پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، کلام، اور فلسفہ وغیرہ میں کوئی بھی موضوع ان کی دسترس علم سے باہر نہیں ہے۔ ویسے تو شبلی نے علوم قرآن پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی تاہم سیرۃ النبیؐ اور کسی قدر ان کے مطبوعہ مقالات حصہ اول کے ابتدائی صفحات میں بعض قرآنی موضوعات کے تعلق سے جو امور ومسائل سپرد قلم کئے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دامن فکر قرآنی علوم وافکار کے لعل ہائے رنگیں سے بھی مالامال ہے۔ قرآنیات پر ان کی تحقیقات اور ان کے

معرکہ آراء مباحث وتوضیحات اسکا بین ثبوت ہیں جس کو شارحین شبلی نے عام طور پر نمایاں کرنے پر کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے۔

شبلی کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی زیادہ تر تحریروں میں زور دیا ہے کہ اسلام کی جدید علوم اور جدید تمدن سے مطابقت نمایاں کی جائے۔ سرسید اور شبلی کے نظریۂ دینی میں بظاہر یہی فرق ہے کہ جہاں سرسید" قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اسے تمدن اور زندگی کے نئے رجحانات کی تائید ہو وہیں شبلی اس کے برعکس جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے قدیم عقائد کی تائید نکلتی ہو اور اسی لئے سرسید سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد رکھی۔ مولانا نے علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم میں اپنی یہ حیثیت نمایاں رکھی ہے۔ علم الکلام قدیم علم کلام پر ہے اور الکلام میں شبلی نے اپنا نیا علم کلام مرتب کیا ہے۔ تیسری کتاب میں بھی انہوں نے بتایا ہے کہ مثنوی عقائد اور علم الکلام کی بھی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ شبلی کے متعلق مہدی افادی لکھتے ہیں:

> "شبلی نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز پرزوں یعنی فلسفہ اور سائنس کے سامنے ۱۳۰۰ برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرادیا۔ یہ معتدل روش جو اس علمی نزاع میں اختیار کی گئی ہے شبلی کا ہی حصہ تھا" (افادات مہدی: ۱۱۹)

شبلی کی مصنفانہ حیثیتوں میں سب سے اہم ان کی مورخانہ حیثیت ہے، تاریخ میں انکا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ انسانی خصوصاً تاریخ اسلامی پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے وہ صرف ایک مؤرخ ہی نہیں بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع اور نقاد بھی تھے۔ ان کے خیال میں تاریخ واقعات کے علاوہ انسانی تہذیب وتمدن کی سرگذشت بھی ہے (الفاروق، ج۱: ۱۱)۔ مہدی افادی لکھتے ہیں کہ شبلی کی تاریخی تصنیفات محض مغازی اور فتوحات کی داستانیں ہی نہیں بلکہ اسلام کے تمام علمی، ادبی، سیاسی د معاشرتی کارناموں کا دلآویز مرقع ہیں۔ جس مبحث پر مولانا کے قلم سے ایک جملہ نکل وہ

ہزاروں صفحات کا نچوڑ اور اس مبحث پر آخری قول فیصل ہے (افکار سہیل: ۸۳)۔ الفاروق، المامون، تاریخی مقالات ومضامین اور کسی حدتک سیرۃ النبیؐ ان کی تاریخی کاوشوں کی شاہکار ہیں۔

تنقید نگاری میں بھی شبلی کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ ان کی تنقیدوں میں ایک طرف اس وقت کے عصری اور سماجی حالات کے اثرات اور دوسری طرف اس وقت کے ادب اور زندگی کے عام رجحانات کے اثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی تنقیدوں میں عقلی اور عملی دونوں قسم کی تنقیدوں کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ ادبی تنقید کے علاوہ دیگر علوم کی بعض دوسری شاخوں کی تنقید کے اصول بھی واضح کئے گئے ہیں جیسے سوانح نگاری اور تاریخ نگاری کے اصول۔ شعر العجم، موازنہ انیس ودبیر، سوانح مولانا رومی کے علاوہ متعدد مقالات ومضامین میں انہوں نے نقد ونظر کے معیار کا ذکر کیا ہے۔

شبلی نعمانیؒ فارسی اور اردو کے خوش فکر شاعر بھی تھے۔ شروع کے اپنے زمانے میں تسنیم تخلص کرتے تھے (حیات شبلی: ۳)۔ انہوں نے جہاں ایک طرف کسی تاریخی واقعہ کو شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے وہیں ان کے عصر کے مسائل پر لکھی گئی لمحاتی شاعری بھی کی ہے۔ قومی اور ملی نظمیں ان کے سیاسی شعور اور عصر آگہی کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے اردو میں مثنوی، قصائد، مسدس، اخلاقی، مذہبی، سیاسی، اور تاریخی نظمیں لکھی ہیں۔ کلیات شبلی (اردو)، کلیات شبلی (فارسی) اور ساتھ ہی مثنوی صبح امید بہت مشہور ہیں۔

ویسے تو شبلی عملی سیاست میں نہ تھے اور نہ ان کی تحریروں کا موضوع عام طور پر سیاست تھا لیکن ان کو مکمل سیاسی شعور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے وقت کے سیاسی مسائل میں دلچسپی لی اور کانگریس کی حمایت کی اور ہندو مسلم اتحاد وسیاسی مصالحت پر مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کے سیاسی شعور کا ذکر کرتے ہوئے طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:

> "شبلی نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دل دل سے نکالنے میں خاص کام کیا۔ مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے سلسلے میں مولانا آزاد مولانا شبلی کے شریک کار رہے" (مسلمانوں کا روشن مستقبل: ۳۷۸)

علامہ شبلیؒ اردو کے ایک بلند پایہ سوانح نگار بھی ہیں۔ ان کے نزدیک سوانح نگاری کا بڑا حصہ اصلاح اخلاق ہے اور ان کی رائے میں یہی طریقہ سب سے زیادہ

صحیح، سب سے زیادہ کامل اور سب سے زیادہ عملی ہے (سیرۃ النبیؐ ج۱) ان کی اہم سوانحی تصانیف ہیں: المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبیؐ۔

سیرۃ النبیؐ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض ایک سادہ سوانح عمری نہیں بلکہ اس میں آپ کی سیرۃ طیبہ کی تفصیل بیان کر کے دراصل اسلام کے تعلیمات وحقائق کو علم کلام کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ فن سیرت وسوانح کو شخصیت کے جلو میں رونما ہونے والے واقعات کی مفصل کیفیت اور ان کے اسباب ونتائج کو نمایاں کرنے والا ایک فلسفہ قرار دیتے ہیں۔ یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی نہیں بلکہ اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعۂ ضروریات دینی ودینوی ہے (سیرۃ النبیؐ: مقدمہ ٦)

شبلی نعمانی جہاں ایک طرف اپنے مختصر مگر شگفتہ اور دلآویز مکاتیب کی وجہ سے مشہور ہیں وہیں ایک بلند پایہ مقالہ نگار بھی مانے جاتے ہیں۔ ان کے آٹھ جلدوں میں شائع مقالات میں کسی مضمون یا افسانہ کا تفریحی انداز نہیں پایا جاتا بلکہ ہر مقالہ کسی علمی ضرورت مثلاً کسی کتاب کا تبصرہ، کسی تاریخی غلط فہمی کا ازالہ یا کسی علمی سوال کے جواب کو پورا کرتا ہے۔

غرض یہ کہ شبلی نے مسلمانوں کا ماضی سے رشتہ جوڑا۔ ان کی اصلاحی تحریک کے اثرات سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، حیدرآباد اور بہار کے مدارس ہی نہیں بلکہ قسطنطنیہ اور مصر کے جامعہ ازہر میں نمایاں اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں۔ سرسید کی طرح شبلی نے بھی کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ رفقاء کی ایک ایسی جماعت بھی پیدا کی جو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نام سے تصنیف وتالیف کے ساتھ ایک معیاری رسالہ 'معارف' کی اشاعت کر کے اردو ادب کے ذخیرے کو مالامال کر رہی ہے۔ شبلی نعمانی کے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''تنوع یا رنگارنگی کی دولت شبلی کے نصیب میں آئی۔ تاریخ ہو یا سوانح نگاری، شعر ہو یا نقد شعر، کلام یا فلسفہ، جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اب چاہے چھوٹا سا مقالہ ہو یا بڑی سی کتاب، لکھنے کا حق ادا

کردیا'' (معارف، مارچ ۱۹۶۵ء:۱۹۴)

مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے استاد کے لئے اسی طرح کی رائے کا اظہار کیا ہے:

''مولانا شبلی قدیم اور جدید علوم کے سنگم تھے۔ وہ ہمارے قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آراء وخیالات سے واقف بھی تھے، ساتھ ہی محقق بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، شاعر بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے اور نئے زمانے کے تقاضے اور مطالبے کے مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے'' (حیات شبلی:۱۰)

شبلی نعمانی کی شخصیت، ان کی خدمات اور اصلاحی کارناموں پر یقیناً بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور مسلسل لکھا جارہا ہے لیکن لٹریچر کے منتشر ہونے کی وجہ سے اس تک کسی محقق یا طالب علم کی رسائی بہت مشکل کام ہے۔ اسی مقصد سے یہ کتابیات تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ کوئی اسکالر یا طالب علم اپنا مطلوبہ مواد کم سے کم وقت میں حاصل کرکے فائدہ اُٹھا سکے۔ یہ کتابیات حسب ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:

۱۔ شبلی کی تصانیف اوران کے تراجم طباعتوں کی تفصیلات کے ساتھ
۲۔ شبلی پر اردو میں کتابیں
۳۔ شبلی پر تحقیقی کام
۴۔ شبلی سے متعلق مقالے اور اردو کتب کے مضامین
۵۔ شبلی سے متعلق معیاری اردو رسائل کے اہم مضامین

شبلی نعمانی کی تصنیفات

اردو کتب:

آفتاب رسالت — اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، غیر مورخہ
اخلاق نبیؐ — اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، غیر مورخہ
اسلام کی عالمگیر خدمات — کراچی، مکتبہ حجاب، ۱۹۶۲ء

اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اسکا تمدنی اثر لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۹۲۷ء

انتخاب مضامین شبلی: مرتبہ سید سلیمان ندوی — اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۵۰ء،
مرتبہ رشید احمد صدیقی — مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۵ء

انتخابات مقالات شبلی: تذکرہ وتنقید؛ کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء
مرتبہ غلام الدین خالد

اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر لاہور، اردو مرکز، ۱۹۴۹ء، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء مع مقدمہ غلام رسول مہر، انگریزی ترجمہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ادارہ ادبیات دلّی، ۱۹۸۱ء بعنوان ''Auranzeb''

بیان خسرو دہلی، رحمانی پریس، غیر مورخہ

الجزیہ لاہور، مطبع مجتبائی، ۱۸۹۱ء، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء (عربی از شبلی نعمانی)

جہانگیر اور توزک جہانگیری لاہور، ادبی دنیا، غیر مورخہ

حجرت مدینہ لاہور، گلاب پبلیشرز، غیر مورخہ

حیات حافظ دہلی، رنگین پریس، ۱۹۲۳ء

حیات خسرو لکھنؤ ادارہ ادبیہ ۱۹۲۲ء؛ دہلی، جامعہ ملیہ برقی پریس، غیر مورخہ

حیات سعدی دہلی، خواجہ برقی پریس، غیر مورخہ، دہلی، رنگین پریس، غیر مورخہ

حیات النبیؐ کراچی، تاج کمپنی، غیر مورخہ

خطبات اسکندریہ آگرہ ۱۸۹۱ء؛ فارسی تراجم: سید محمد فخر داعی گیلانی، تہران، ۱۳۱۵ھ ش۔
انگریزی تراجم: سید صباح الدین

	عبدالرحمٰن، غیر مورخہ
خطباتِ شبلی؛ مرتبہ سید سلیمان ندوی	اعظم گڑھ دارالمصنفین، ۱۹۴۱ء
رسائلِ شبلی	دہلی، رحمانی پریس، ۱۸۹۸ء مع دیباچہ از شبلی نعمانی
سفرنامہ روم و مصر و شام	آگرہ، مطبع مفید عالم، ۱۸۹۴ء، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۰ء
سوانح عمری فردوسی	دہلی، مطبع مجتبائی، غیر مورخہ
سوانح عمری نظام گنجوی	دہلی، مطبع مجتبائی، غیر مورخہ
سوانح مولانا روم	کانپور، مطبع نامی، ۱۹۰۶ء؛ اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۳۸ء؛ لاہور، ترقی ادب، ۱۹۷۱ء؛ دہلی، مہتاب پریس، غیر مورخہ تراجم فارسی: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی تہران، ۱۳۳۲ھ ش بعنوان ''سوانح مولانا رومی''
سیرۃ النبیؐ: جلد اوّل	اعظم گڑھ، دارالمصنفین (طبع ششم: ۱۹۶۱ء)
سیرۃ النبیؐ: جلد دوم	اعظم گڑھ، دارالمصنفین (طبع پنجم: ۱۹۵۵ء) پشتو تراجم: برہان الدین کشلکی، کابل پشتو ٹولنا، ۱۳۲۶ و ۱۳۲۸ھ ش، دو جلدیں؛ عزیز الرحمٰن سیفی، کابل، پشتو ٹولنا، ۱۳۵۰ و ۱۳۵۴ھ ش، دو جلدیں بعنوان ''سیرۃ النبیؐ''؛ محمد اسرائیل پشاور، پشتو اکیڈمی، ۱۹۶۹ء بعنوان ''سیرۃ النبیؐ''؛ ملیالم تراجم:

جی داؤد شاہ اور محمد یوسف فاضل باقوی، کتب خانہ دار الاسلام مدراسی، ۱۹۳۲ء؛ انگریزی تراجم: فضل الرحمٰن، کراچی، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۰ء، دو جلدیں؛ طیب بخش بدایونی، لاہور، قاضی پبلیشرز، ۱۹۸۰ء، دو جلدیں؛ دہلی، ادارۂ ادبیات دلی، ۱۹۷۹ء، دو جلدیں؛ ملخصات: بی اے احسان، لاہور، دبستان، ۱۹۶۵ء بعنوان ''تلخیص سیرۃ النبیؐ''۔

سیرۃ النعمان
دہلی، مطبع مجتبائی، ۱۸۹۳ء، علیگڑھ، ۱۸۹۱ء، دہلی، مکتبہ برہان، ۱۹۵۶ء؛ انگریزی تراجم: ہادی حسین، لاہور، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء بعنوان ''امام ابو حنیفہ''

شعر العجم: حصہ اول
اعظم گڑھ، دار المصنفین (طبع چہارم: ۱۳۵۹ھ (طباعت اولین ۱۹۰۸ء)؛ فارسی تراجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی تہران، ۱۳۱۶ھ ش، تہران، ابن سینا چاپ دوم: ۱۳۵۵ھ ش؛ منصور انصاری، کابل، ۱۳۰۶ھ ش

شعر العجم: حصہ دوم
اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۴۷ء (طباعت اولین: ۱۹۰۹ء) فارسی تراجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، تہران، ۱۳۲۷ھ ش؛ منصور انصاری، کابل، ۱۳۰۶ھ ش

شعر العجم: حصہ سوم	اعظم گڑھ، دارالمصنفین (طبع چہارم: ۱۹۴۵ء، فارسی تراجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، تہران ۱۳۱۴ھ ش، تہران، ابن سینا (چاپ دوم: ۱۳۳۶ھ ش)
شعر العجم: حصہ چہارم	اعظم گڑھ، دارالمصنفین (طبع: ۱۹۵۱ء) فارسی تراجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، تہران، ۱۳۱۴ھ ش؛ تہران، ابن سینا (چاپ ۲: ۱۳۳۶ھ ش؛ منصور علی، کابل، ۱۳۰۴ھ ش
شعر العجم: حصہ پنجم	مرتبہ عبدالسلام ندوی وابوالحسنات ندوی، الہ آباد، مطبع انوار احمدی، غیر مورخہ؛ لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۲۴ء؛ فارسی تراجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، تہران ابن سینا، ۱۳۱۸ھ ش
ظل الغمام فی مسئلۃ القراۃ خلف الامام۔	کانپور، مطبع نظامی، ۱۲۹۲ھ
عبادت	لاہور، گلاب پبلیشرز، غیر مورخہ
عقائد	لاہور، گلاب پبلیشرز، غیر مورخہ
علم الکلام	آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۰۳ء؛ کراچی، نفیس اکاڈمی، ۱۹۵۲ء؛ فارسی تراجم: سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، تہران، ۱۳۲۸ھ، ش؛ تہران، ۱۳۳۰ھ ش
غزوہ احد	کانپور، مطبع نامی، ۱۹۰۲ء؛ اعظم گڑھ، دارالمصنفین، غیر مورخہ
غزوہ بدر	اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، غیر مورخہ
الغزالی	کانپور، مطبع نامی، ۱۹۰۲ء؛ اعظم گڑھ،

دارالمصنفین، ۱۹۲۸ء، ۱۹۵۶ء

الفاروق
کانپور، مطبع نامی، ۱۸۹۹ء؛ دہلی، علمی
کتاب خانہ، ۱۹۵۱ء؛ اعظم گڑھ،
دارالمصنفین، ۱۹۵۶ء؛ دہلی، فرید بکڈپو
۱۹۸۷ء؛ مخلصات: قمر القادری و عارف خاں
لاہور، ایم فرمان اینڈ سنز، غیر مورخہ
بعنوان ''فاروق اعظم: خلاصہ الفاروق''؛
گلشن شادانی، لاہور، شیخ جان محمد الٰہی بخش،
۱۹۴۵ء بعنوان ''المفردق خلاصہ الفاروق''۔
فارسی تراجم: سید غلام قادر، کراچی، ۱۹۴۹ء؛
ترکی تراجم: محمد عمر رضا کحالہ، آمدی مطبعہ سی،
استنبول، ۱۹۲۷ء بعنوان ''حضرت عمرؓ''؛
ملیالم تراجم: عبدالسلام، اسلامک پبلشنگ
ہاؤس، تراونکور، ۱۹۳۰ء؛ انگریزی تراجم:
ظفر علی خاں، لاہور، شیخ محمد اشرف (طبع
چہارم: ۱۹۵۶ء) بعنوان ''عمر دی گریٹ''
دوجلدیں؛ دہلی، انٹرنیشنل اسلامک پبلیشرس،
۱۹۹۲ء بعنوان ''الفاروق دی لائف
آف عمر دی گریٹ''۔

فطرۃ الاسلام
لکھنؤ، لال باغ کوٹھی، غیر مورخہ

الکلام
کانپور، مطبع نامی پریس، ۱۹۰۴ء؛
اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۶۲ء؛ لکھنؤ،
شبلی بکڈپو، ۱۳۴۰ھ۔

کلیات شبلی؛ مرتبہ سید سلیمان ندوی
آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۴ء؛

	اعظم گڑھ، دار المصنفین ۱۹۵۴ء۔
المامون	اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۵۷ء؛ علیگڑھ، ۱۸۸۷ء، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۴ء۔
مثنوی صبح امید	دہلی، رنگین پریس، غیر مورخہ
مجموعہ کلام شبلی؛ مرتبہ ظفر ملک علوی	لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۹۲۴ء
مجموعہ نظم شبلی مع سوانح عمری؛ مرتبہ ظہور الحق	دہلی، تاج اینڈ سنز، غیر مورخہ
مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم	آگرہ، ۱۸۸۷ء
معجزات نبویؐ	اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، غیر مورخہ
مقالات شبلی: جلد اول: مذہبی	اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۵۴ء (دیباچہ از سید سلیمان ندوی)
مقالات شبلی: جلد دوم: ادبی	اعظم گڑھ، دار المصنفین (طبع دوم: ۱۹۵۰ء)
مقالات شبلی: جلد سوم: تعلیمی	اعظم گڑھ، دار المصنفین (طبع دوم: ۱۹۵۵ء)
مقالات شبلی: جلد چہارم: تنقیدی	اعظم گڑھ، دار المصنفین (طبع سوم: ۱۹۵۶ء)
مقالات شبلی: جلد پنجم: تاریخی حصہ ۱	اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۳۶ء (دیباچہ از سید سلیمان ندوی)
مقالات شبلی: جلد ششم: تاریخی حصہ ۲	اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۵۱ء
مقالات شبلی: جلد ہفتم: قومی اور اخباری مضامین کا مجموعہ	اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۳۷ء (دیباچہ از سید سلیمان ندوی)
مقالات شبلی: جلد ہشتم: فلسفیانہ	اعظم گڑھ، دار المصنفین (۱۹۳۸ء)
مکاتیب شبلی: جلد اول	اعظم گڑھ، دار المصنفین (طبع دوم: ۱۹۲۸ء)
مکاتیب شبلی: جلد دوم	اعظم گڑھ، دار المصنفین (طبع دوم: ۱۹۲۷ء)

موازنہ انیسؔ ودبیر یعنی میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۰۶ء؛ الٰہ آباد، لالہ نرائن لال، ۱۹۳۶ء؛ لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۴ء؛ مخلصات: بشیر احمد،

لاہور، شیخ مبارک علی، غیر مورخہ بعنوان ''خلاصہ موازنہ انیس و دبیر''۔

ہارون الرشید — لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۸ء

عربی کتب:

اسکات المعتدی علی انصات المقتدی — کانپور، مطبع نظامی، ۱۲۹۸ھ

الانتقاد علی التمدن الاسلامی — لکھنؤ، آسی پریس، ۱۹۱۲ء؛ القاہرہ، مطبع المنار، ۱۹۱۲ء؛ اردو تراجم: مقالات شبلی جلد چہارم، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۵۶ء

تاریخ بدء الاسلام — اکبرآباد، المطبع مفید عام، غیر مورخہ؛ اردو تراجم: سلطان شاہ بانو، دہلی، مہتاب پریس، غیر مورخہ، بعنوان ''آغاز اسلام''؛ دہلی، تاج کمپنی، غیر مورخہ، محمد حمید اللہ، دہلی، رحمانی پریس، ۱۳۴۲ھ بعنوان ''حیات النبیؐ''۔

فارسی کتب:

برگ گل — لکھنؤ، ۱۹۲۳ء

کلیات شبلی — اعظم گڑھ، دارالمصنفین، غیر مورخہ

مجموعہ نظم فارسی — آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۳ء

شبلی نعمانی پر کتابیں

آزاد، سید محمود

شاہکار شبلی — لاہور، مکتبہ شاہکار، ۱۹۷۸ء؛ ص: ۹۰

اختر جوناگڑھی

علامہ شبلی بحیثیت شاعر — جوناگڑھ، مصنف خود، غیر مورخہ؛ ص: ۵۷

اعظمی، عبداللطیف

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ دہلی، شبلی اکادمی، ۱۹۴۵ء، ص: ۲۰۷

انوارالحسن

شبلی نعمانی — لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۷ء، ص:۳۲

خلیق انجم

شبلی کی علمی وادبی خدمات — دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص:۳۲۰

خورشید، عبدالسلام

شبلی — لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۵۲ء، ص:۹۶

دسنوئ سید شہاب الدین

شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں۔ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۷ء، ص:۱۴۷

زبیری، محمد امین

ذکر شبلی۔ لکھنؤ، کتاب خانہ دانش محل، ۱۹۴۶ء؛ لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء، ص:۲۴۶

شبلی کی رنگین زندگی۔ لاہور، فاروق عمر پبلیشرز، ۱۹۵۲ء، ص:۹۶

شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق۔ بھوپال، سنٹرل انڈیا پریس، ۱۹۴۶ء، ص:۴۱

سعید انصاری

مولانا شبلی۔ لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۹۲۵ء، ۱۲۰انشا پرداز۔ مولانا شبلی اردو کے بہترین۔ لکھنؤ، الناظر بک ایجنسی، ۱۹۵۶ء، ص:۲۴۰

شاہ، سید افتخار حسین

اقبال اور پیروی شبلی۔ لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۷ء، ص:۱۹۰

شجاعت علی سندیلوی

مطالعہ شبلی۔ لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، غیر مورخہ، ص:۵۰

شمسی، محمد اسحاق

شبلی کا تنقیدی شعور۔ کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص:۲۷۲

شوق، عبدالرحمٰن

مولانا شبلی کے تاریخی مضامین۔ لاہور، ملک دین محمد، غیر مورخہ، ص:۱۲۷

صباح الدین عبدالرحمٰن، سید

مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر۔ اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۸۵ء، ص:۱۴۶

صدیقی، آفتاب احمد

شبلی ایک دبستان۔ ڈھاکہ، مکتبہ عارفین، غیر مورخہ؛ کراچی، ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، غیر مورخہ، ص: ۲۶۸

شبلی بحیثیت سیرت نگار۔ علیگڑھ، مصنف خود، ۲۰۰۱ء، ص: ۳۰۴

عبدالرحیم، شیخ

شبلی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ۔ پٹنہ، مصنف خود، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۶۳

عثمانی، محمد واصل

شبلی ادیبوں کی نظر میں۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ص: ۳۸۶

شبلی نقادوں کی نظر میں۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ص: ۲۸۶

عظیم، وقار اختر

شبلی بحیثیت مورخ۔ نئی دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ء؛ لاہور، ادارہ تصنیفات، ۱۹۶۸ء، ص: ۲۶۴

فراہی، عبیداللہ

علامہ شبلی کا نظریۂ تعلیم (اختلافات کے پس منظر میں)۔ نئی دہلی، مصنف خود، ۱۹۸۸ء، ص: ۵۸

محمد اکرام، شیخ

شبلی نامہ ایک فنکار کی داستان حیات۔ بمبئی، کتبخانہ تاج آفس، غیر مورخہ، ص: ۲۷۵

یادگار شبلی۔ لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص: ۴۵۶

مشتاق حسین

باقیات شبلی۔ دہلی، آزاد گھر، ۱۹۶۴ء؛ لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۱۴

مظہر، ایس جالب

مطائبات شبلی۔ بمبئی، علوی بکڈپو، غیر مورخہ، ص: ۱۲۶

مفتون احمد

مولانا شبلی نعمانی۔ ایک مطالعہ۔ کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۳۵

مہدی، محمد احمد

شبلی۔ آگرہ، ۱۹۲۵ء، ص:۶۱

ناز صدیقی

شبلی نقادوں کی نظر میں۔ حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء، ص:۲۸۶

ناظر کاکوروی=شجاعت علی سندیلوی

ندوی، سید سلیمان

حیات شبلی۔ اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۴۳ء، ص:۸۴۶؛ ۱۹۷۶ء، وغیرہ

نذر احمد

مقالات یوم شبلی۔ لاہور، مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء، ص:۹۵

وحید قریشی

شبلی کی حیات معاشقہ۔ لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء، ص:۱۰۲

ہاشمی، نجی احمد

شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ کراچی، مجلس یادگار ہاشمی، غیر مورخہ، ص:۵۴۷

ہاشمی، نصیر الدین

شبلی۔ لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، غیر مورخہ، ص:۶۴

شبلی نعمانی سے متعلق تحقیقی کام

ایم فل:

اعظمی۔ عبد الرحمٰن

شذرات شبلی: ایک تنقیدی جائزہ۔ دہلی یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء

پی ایچ ڈی:

اشرف النبی قیصر

شبلی کے کارنامے۔ بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور، ۱۹۸۸

پروین خواجہ

دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڑھ کی علمی، ادبی، تصنیفی خدمات کا جائزہ۔
اورینٹل کالج، لاہور، غیر مورخہ

شوکت آرا

شبلی نعمانی کی سوانح نگاری۔ بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی،
مظفر پور، ۱۹۹۲ء

شہناز اختر

حالی وشبلی کے تنقیدی نظریات کا تقابلی مطالعہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۷ء

صابرین خاتون

شبلی نعمانی بحیثیت تنقید نگار۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۲ء

صدیقی آفتاب احمد

شبلی اور ان کی تصانیف۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۴۸ء

عثمانی مسعود الحسن

مولانا شبلی نعمانی اور اردو ادب میں ان کی خدمات۔ لکھنؤ یونیورسٹی، غیر مورخہ

عمدۃ النساء بیگم

علامہ شبلی نعمانی۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سند (پاکستان)

غضنفر علی

شبلی نعمانی کا تنقیدی مطالعہ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، غیر مورخہ

ندوی، محمد نعیم

دبستان شبلی کے علمی و ادبی کارنامے۔ جامعہ سندھ، حیدر آباد سندھ (پاکستان) ۱۹۷۱ء

نصیر احمد

شبلی کی نثری خدمات۔ بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی،
مظفر پور، ۱۹۸۵ء

نیّر جہاں

شبلی بحیثیت سوانح نگار: ایک تنقیدی مطالعہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین

(الف) اردو کتب

آزاد، ابوالکلام

"مکاتیب آزاد بنام شبلی"
مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ کراچی، اردو اکیڈمی ۱۹۳۸ء، ص: ۷۶۔۸۲

آفاق احمد

"شبلی مہدی افادی کی نظر میں"
شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی۔ حیدرآباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء، ص: ۶۳۔۷۵

ابوظفر، عبدالواحد

"مقالات شبلی"
شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ص: ۳۶۴۔۳۶۸

اختر جوناگڑھی

"شبلی کی فارسی شاعری"
مقالات یوم اختر۔ کراچی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۲ء، ص: ۵۴۔۹۰

اعجاز حسین

"شبلی"
مختصر تاریخ ادب اردو۔ کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۰ء، ص: ۳۲۲۔۳۲۵

اعظمی، عبداللطیف

"مولانا شبلی اور ان کے منتقد و معتقد"
مشاہیر کے خطوط۔ دہلی مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵ء، ص: ۲۴۔۴۱
شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء،

ص:۱۱۵-۱۲۲

اکرام الحق، شیخ

"شبلی"

شعرالعجم فی الہند- ملتان، شعبہ اشاعت الاکرام، ۱۹۶۱ء، ص: ۳۷۹-۳۹۴

الطاف فاطمہ

"شبلی اور انکا فن سوانح نگاری"

اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء- کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء،
ص:۱۰۹-۱۵۰

انصاری، سعید احمد

"عربی انشاء"

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۰۴-۱۲۱

"مولانا شبلی اور علم کلام"

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی، حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء
ص: ۱۴۸-۱۷۴

باقر، آغا محمد

"شبلی نعمانی"

تاریخ نظم ونثر اردو- لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۲ء، ص: ۲۵۰-۲۵۶

بخاری، غلام شبیر

"شبلی ایک ماہر تعلیم"

مقالات یوم شبلی، مرتبہ نذر احمد- لاہور، مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء، ص: ۳۵-۴۱

بخاری، ن

"شبلی بحیثیت مورخ، سوانح نگار، نقاد، مقالہ نگار"

اشارات- میرپور، پاک یونین سٹورز پبلیشرز، ۱۹۶۷ء، ۵۰-۶۵

برنی، ضیاء الدین

"علامہ شبلی"

عظمت رفتہ۔ کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۲۶۵۔۲۶۹

بسمل، قربان علی

''مولانا شبلی کے حالات زندگی''
مجموعہ نظم شبلی (ادو)۔ دہلی، شاہجہانی پریس، ۱۳۴۸ھ، ص: ۹۷۔۱۰۴

تمکین کاظمی

''علامہ شبلی نعمانی''
شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء
ص: ۱۹۱۔۲۱۸

جعفری، لیس

''مولانا شبلی''
ابتدائی تنقیدی ادب۔ کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، ص: ۱۸۷۔۹۰۰

جین، گیان چند

''مثنوی صبح امید''
شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء،
ص: ۹۷۔۱۰۵

چشتی، افتخار احمد

''علامہ شبلی کا ندوۃ العلماء''
مقالات یوم شبلی، نذر احمد۔ لاہور، مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء، ص: ۲۷۔۳۴

خالد محمود

''شبلی نعمانی۔ سفرنامۂ مصر وروم وشام''
سرسید سے اکبر تک، مرتبین شمیم حنفی وسہیل احمد فاروقی۔ دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۵ء،
ص: ۱۵۷۔۱۷۱

خاں، شمس تبریز

''شبلی نعمانی''
صدر یار جنگ۔ لکھنؤ، دار العلوم ندوۃ العلماء، ۱۹۷۲ء، ص: ۲۳۱۔۲۳۷

خاں، شیخ عبداللہ

''مولانا شبلی نعمانی مرحوم ومغفور''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۶۱۔۱۷۱

خاں، صغیر احمد

''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی''

تنویر ادب، الہ آباد، نیشنل پریس، ۱۹۳۷ء، ص: ۲۴۶۔۲۴۹

خاں، محمد حبیب اللہ

''مولانا شبلی نعمانی''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں۔ لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۷۰۔۷۹

خاں، محمد ظفر

''سوانح مولانا روم شبلی کے آئینہ تحقیق وتنقید میں''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی۔ حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء

ص: ۱۲۵۔۱۴۷

خورشید الاسلام

''شبلی''

تنقیدیں۔ علیگڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۷ء، ص: ۲۴۔۵۸

''شبلی خطوط کی روشنی میں''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی، حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء،

ص: ۳۸۔۶۲

خوندمیری، عالم

''اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ''

شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء،

ص: ۲۴۲۔۲۶۳

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی، حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء،

ص: ۱۹۸۔۲۱۶

رضا علی، سید

''موازنۂ انیس و دبیر''

اعمال نامہ۔ دہلی، ہندوستانی پبلیشرز، ۱۹۴۳ء، ص: ۵۰۔۶۲

زور، محی الدین قادری

''شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات''

شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء

ص: ۱۶۱۔۱۷۵

سرور، آل احمد

''شبلی میری نظر میں''

انتخاب آل احمد سرور، مرتبہ فقیر احمد فیصل، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، غیر مورخہ

ص: ۷۳۔۹۸

''حیات شبلی پر ایک تبصرہ''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی، حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء

ص: ۲۵۔۳۷

سروری، عبد القادر

''شبلی''

جدید اردو شاعری، لاہور، کتاب منزل، ۱۹۴۶ء، ص: ۱۰۲۔۱۰۸

سری رام، لالہ

''شبلی''

خم خانۂ جاوید: جلد چہارم۔ دہلی، ہمدرد پریس، ۱۹۲۶ء، ص: ۴۷۳۔۴۷۸

سکسینہ، رام بابو

''شبلی نعمانی''

تاریخ ادب اردو؛ اردو ترجمہ: مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۲۹ء

ص: ۶۵۔۷۴

سہیل، اقبال احمد

''شبلی کی جامعیت''
افکار سہیل، مرتبہ شوکت سلطان و علی حماد عباسی، اعظم گڑھ، شبلی نیشنل کالج، ۱۹۵۷ء
ص: ۸۵-۱۰۲

سید حامد

''امیر خسرو، شبلی اور رضا زادہ کی رائیں''
نگار خانۂ رقصاں، دہلی، تاج کمپنی، ۱۹۸۴ء، ص: ۹۷-۱۰۶

شاہ علی، سید

''حالی اور شبلی کا سوانحی دور''
اردو میں سوانح نگاری۔ کراچی، گلڈ اشاعت گھر، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۵۳-۲۶۰

شجاعت علی

''انشائے شبلی''
شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸
ص: ۷۵-۸۶

شرر، عبدالحلیم

''شبلی نعمانی''
مضامین شرر: جلد سوم۔ لاہور، گیلانی الیکٹریک پریس بکڈپو، غیر مورخہ،
ص: ۲۵۶-۲۶۳

''ندوۃ العلماء اور شبلی''
مضامین شرر: جلد پانچ۔ لاہور، عبدالرشید اینڈ برادر، غیر مورخہ، ص: ۹۰-۹۵

شروانی، محمد مقتدیٰ خاں

''علیگڑھ میں شبلی کا قیام''
مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۸۰-۱۰۳

شمیم حنفی

''شبلی کی شخصیت''

سرسید سے اکبر تک، مرتبین شمیم حنفی وسہیل احمد فاروقی، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۷۲۔۱۷۸

صباح الدین عبدالرحمٰن، سید

''علامہ شبلی نعمانی بحیثیت نثر نگار''

مقالات سرسید سے مضامین رشید تک، مرتبہ فخر الاسلام۔ اعظم گڑھ نیشنل کالج، ۱۹۸۵ء، ص: ۷۵۔۸۸

''مولانا شبلی کیا تھے؟''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبیداللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۳۰۔۱۳۶

''دارالمصنفین اور شبلی کی اس کی خدمات''

شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی۔ حیدرآباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء، ص: ۱۸۵۔۱۹۷

صدیقی، آفتاب احمد

''شبلی''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبیداللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء ص: ۱۸۔۳۱

صدیقی، ابواللیث

''علامہ شبلی نعمانی''

اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ۔ کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۲ء، ص: ۱۰۰۔۱۰۸

صدیقی، محمد یٰسین مظہر

''تنقیدی بصیرت بحوالہ سیرۃ النبیؐ''

مطالعہ سلیمانی، مرتبین مسعود الرحمٰن خاں ومحمد حسان خاں، بھوپال، دارالعلوم تاج المسلم، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۷۷۔۱۹۵

''شبلی کی سیرۃ النبیؐ میں اضافات سلیمانی''

سید سلیمان ندوی۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، شعبہ اردو، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۰۲۔۱۱۸

عبادت بریلوی

''شبلی کی تنقید نگاری''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱، ص: ۷۶۔۹۳

اردو تنقید کے معمار، مرتبہ ایم حبیب خاں، علیگڑھ، انڈین بک ہاؤس، ۱۹۶۵، ص: ۹۹۔۱۱۲

اردو تنقید کا ارتقاء۔ دہلی، اردو مرکز، ۱۹۶۴، ص: ۱۷۱۔۱۸۸

عبد الماجد دریابادی

''شبلی۔ انسان، مصنف، مصنف گر''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸، ص: ۸۔۲۳

عبد الوحید

''مولانا شبلی نعمانی''

جدید شعرائے اردو۔ لاہور، فیروز اینڈ سنز، غیر مورخہ، ص: ۳۳۔۳۵

عبد الودود

''شبلی کی قومی شاعری''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی، حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء، ص: ۱۷۴۔۱۸۴

عطاء اللہ، شیخ

''شبلی اور سیرۃ النبیؐ''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۲۲۵۔۲۲۹

''شبلی ایک پین اسلامسٹ''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء ص: ۷۔۱۷

''شبلی مفکر و مبلغ''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء

ص: ۲۱۹۔۲۲۳
''شبلی کا اسلوب بیان''
بحث ونظر۔ لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۵۲، ص: ۱۲۳۔۱۷۴
بہترین مقالات، مرتبہ اختر جعفری، لاہور، مکتبہ اردو، غیر مورخہ،
ص: ۵۵۵۔۵۶۸
۱۹۵۱ کا بہترین ادب، مرتبین چوھدری برکت علی و مرزا ادیب، لاہور، مکتبہ اردو،
۱۹۵۲، ص: ۳۷۔۷۰

عظیم، وقار اختر

''شبلی کی سیاسی شاعری''
مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱، ص: ۲۷۔۴۵

فاروقی، ضیاء الحسن

''علامہ شبلی مورخ کی حیثیت سے''
اشخاص وافکار۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۳، ص: ۵۴۔۱۱۴

فہد، عبید اللہ

''علامہ شبلی''
تاریخ دعوت وجہاد (برصغیر کے تناظر میں)۔ دہلی، ہندوستان پبلیکیشنز، ۱۹۸۴ء
ص: ۲۴۵۔۲۴۸

عبد الرزاق

''شبلی''
یاد ایام۔ حیدر آباد، عبد الحق اکیڈمی، ۱۹۴۶ء، ص: ۶۰۔۱۲۷

عبد الرشید، خواجہ

''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی''
تذکرہ شعرائے پنجاب۔ کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۶۷ء، ص: ۴۲۶۔۴۲۷

عبد اللہ، سید

''شبلی''
اشارات تنقید۔ کراچی، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۶ء، ص: ۲۲۷۔۲۳۷

''شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء''
سرسید اوران کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ۔ دہلی، چمن بکڈ پو،
۱۹۶۰ء، ص: ۱۵۵-۱۷۵
''شبلی ایک جامع حیثیات شخصیت''
مقالات یوم شبلی، مرتبہ نذر احمد، لاہور، مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء، ص: ۹-۱۶
''شبلی بحثیت مورخ''
شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی۔ حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۷۶ء
ص: ۹۴-۱۲۴
''شبلی کا اسلوب بیان''
شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی، حیدر آباد، الیاس ٹریڈرس، ۹۷۶ء،
ص: ۲۳۲-۲۵۷
''شبلی کے تصنیفی کام کا مجموعی قدر و قیمت''
مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خاں، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۱-۶
''مولانا شبلی نعمانی''
طیف نثر، مرتبہ ممتاز بنگلوری۔ لاہور، نذر اینڈ سنز ۱۹۶۴ء، ص: ۱۸-۹۲

عبدالماجد دریابادی

''شبلی۔ انسان، مصنف، مصنف گر''
شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء
ص: ۸-۲۳
''شبلی نعمانی''
معاصرین۔ کراچی، مجلس نشریات اسلام، غیر مورخہ، ص: ۶۶-۷۱

قادری، حامد حسن

''علامہ شبلی نعمانی''
داستان تاریخ اردو۔ کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، ص: ۸۱۷-۹۰۰

قریشی، محمد عبداللہ

’’شبلی و حالی‘‘

معاصرین: اقبال کی نظر میں۔ لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء، ص: ۸۶۔۹۱

کریم، سید محمد نواب

’’حالی و شبلی‘‘

اردو تنقید حالی سے کلیم تک۔ نئی دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص: ۷۷۔۱۱۶

کلیم الدین احمد

’’شبلی نعمانی‘‘

اردو تنقید پر ایک نظر۔ دائرہ ادب، غیر مورخہ، ص: ۱۰۸۔۱۱۸

محمد اسماعیل، شیخ

’’الفاروق اور سرسید‘‘

مقالات سرسید، لاہور، مجلس ترقی اردو، ۱۹۶۲ء، ص: ۳۲۲۔۳۲۸

محمد اقبال، سر

’’خط بنام شبلی نعمانی‘‘

اقبال نامہ، مرتبہ عطا اللہ، حصہ اول۔ لاہور، شیخ محمد اشرف، غیر مورخہ،
ص: ۷۳۔۷۴

محمد اکرام، شیخ

’’شبلی نعمانی‘‘

ارمغان پاک۔ لاہور، دین محمد، غیر مورخہ، ص: ۲۲۳۔۲۳۵

’’شمس العلماء شبلی نعمانی‘‘

موج کوثر۔ لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۵ء، ص: ۲۲۱۔۲۴۸

محمد ذوالفقار حسین

’’دار المصنفین۔ شبلی کی تصنیفی تحریک‘‘

مقالات یوم شبلی، مرتبہ نذر احمد۔ لاہور، مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء، ص: ۱۷۔۲۶

محمد فرمان

''محمد شبلی نعمانی''
تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند: جلد ۹۔ لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء،
ص:۱۷۳۔۲۰۷

مہدی

''تمدن عرب اور پروفیسر شبلی''
افادات مہدی، مرتبہ بیگم مہدی، لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۴۹ء، ص:۱۴۔۱۷
''آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ''
افادات مہدی، مرتبہ بیگم مہدی، لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۴۹ء، ص:۸۷۔۱۱۰
''ملک میں تاریخ کا معلم اول شبلی''
افادات مہدی، مرتبہ بیگم مہدی، لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۴۹ء، ص:۱۸۰۔۱۸۸
''شبلی سوسائٹی''
افادات مہدی، مرتبہ بیگم مہدی، لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۴۹ء،
ص:۲۷۱۔۲۹۰
''حالی وشبلی کے معاصرانہ چشمک''
افادات مہدی، مرتبہ بیگم مہدی، لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۴۹ء،
ص:۳۰۰۔۳۲۴،
مرتبہ فیروز احمد۔ لکھنؤ، اتر پردیس اکادمی، ۱۹۸۳ء ص:۹۹۔۱۲۰

ناز صدیقی

''مولانا شبلی مرحوم کے نام مہدی حسن کے خطوط''
مکاتب مہدی افادی، مرتبہ بیگم مہدی، لکھنؤ، اتر پردیس اکادمی، ۱۹۸۲ء
ص:۴۔۱۴

ندوی، سید ابوالحسن علی

''علامہ شبلی کا دور معتمدی اور دار العلوم میں قیام''

حیات عبدالحیؒ۔ دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء، ص: ۱۵۲۔۱۸۰

ندوی، سید سلیمان

''علامہ شبلی نعمانی''

یادرفتگاں۔ اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۸۶ء ص: ۱۶۔۳۰

''مولانا شبلی اردو شاعری کے لباس میں''

کلیات شبلی (اردو)۔ اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۵۴ء، ص: ا۔۲۱

ندوی، شاہ معین الدین احمد

''شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی۔ کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء،
ص: ۸۷۔۹۵

ندوی، عبدالسلام

''شبلی کا طرز تحریر''

شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ ناز صدیقی۔ حیدرآباد، الیاس ٹریڈرس، ۱۹۶۱ء،
ص: ۲۱۷۔۲۲۲

نسیم قریشی

''شبلی نعمانی''

اردو ادب کی تاریخ۔ لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۷ء، ص: ۶۱۰۔۷۴۴

نظیر، اصغر حسین خاں

''علامہ شبلی نعمانی''

مختصر تاریخ ادب اردو۔ لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۳ء، ص: ۳۴۷۔۳۵۰

وزیر آغا

''شبلی نعمانی کی سیاسی نظمیں''

مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبیداللہ خاں۔ لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۲۲۔۱۲۹

ہارون الرشید

''شبلی''

اردو ادب اور اسلام: جلد اول۔ لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۶۸ء، ص: ۲۴۸۔۲۵۲؛ جلد دوم، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۷۰ء، ص: ۴۴۔۴۹

ہاشمی، یحییٰ احمد

''ایک ماہ (جولائی ۱۹۱۴ء) مولانا شبلی کے ساتھ''
مقالات یوم شبلی، مرتبہ نذر احمد۔ لاہور، مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء ص: ۶۲۔۷۷

''حالات شبلی''
ادبی آئینے۔ کراچی، مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ص: ۶۵۔۱۱۸

''شبلی ایک مخالف انگریز''
ادبی آئینے۔ کراچی، مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ص: ۱۶۴۔۱۹۶

''شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ''
ادبی آئینے۔ کراچی، مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ص: ۱۱۹۔۱۳۲

''مولانا شبلی اور ترکی''
ادبی آئینے، کراچی، مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ص: ۱۵۱۔۱۶۳

(ب) رسائل کے مضامین

آصف نعیم

حافظ اور شبلی۔ فکر و نظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۳۰۹۔۳۱۴

آصفی، صفدر علی

مولانا شبلی کا ایک جلیل القدر شاگرد (سہیل اقبال)۔ فاران (کراچی) جلد ا، شمارہ ا، اپریل ۱۹۵۸ء، ص: ۲۵۔۴۵

آغا حیدر

شبلی۔ ایک نقاد (موازنہ انیس و دبیر کی روشنی میں)۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۴۸۷۔۴۹۵

آفاق احمد

شبلی مہدی افادی کی نظر میں۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر،

ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۳۳۷_۳۴۲

ابراہیم احمد

شبلی، عطیہ بیگم اور انجمن اسلام۔ نوائے ادب (ممبئی) جلد ۴۹، شمارہ ا،
اپریل ۱۹۹۹ء، ص: ۵۱_۵۵

ابراہیم خلیل

عرفی کی داستان معاشقہ اور شبلی۔ اردو (کراچی) جلد ۴۵، شمارہ ۳، ۱۹۶۹ء
ص: ۱۱۹_۱۲۶

ابن فرید

شبلی چو بہ خلوت می رود۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء
ص: ۲۶۸_۳۰۳

ابوظفر، عبدالواحد

مقامات شبلی۔ صبا (حیدرآباد) جلد ۴، شمارہ ۱_۲: شبلی نمبر ۱۹۵۸ء، ص: ۵۷_۶۷

احتشام حسین، سید

موازنہ انیس و دبیر شبلی کی ایک تنقیدی کتاب۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹،
شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۰۲_۱۰۶

احسان احمد، مرزا

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۶۳، شمارہ ۲:
فروری ۱۹۴۹ء، ص: ۱۲۱_۱۳۲؛ جلد ۶۳، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۹ء،
ص: ۲۰۳_۲۱۷؛ جلد ۶۳، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۴۹ء، ص: ۲۷۵_۲۹۱؛
جلد ۶۳، شمارہ ۵، مئی ۱۹۴۹ء، ص: ۳۸۱_۳۹۲

علامہ شبلی بحیثیت محقق و نقاد۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۲، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۶_۵۰

اختر جوناگڑھی

مولانا شبلی بحیثیت شاعر۔ ہندوستانی (الہ آباد) جنوری ۱۹۲۶ء، ص: ۱۰_۲۰

اخلاق احمد

علامہ شبلی مکتوبات کے آئینہ میں۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء،
ص: ۸۹۔۱۰۴

ادریس احمد

شبلی کی شخصیت اور علمی کارنامے۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۲۵۵۔۲۶۲

ارشد، اے۔ ڈی

شبلی کا تحقیقی شعور۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۳۳۳۔۳۴۴

اسرار احمد

مولانا شبلی، مولانا آزاد، مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی: موازنہ۔ چٹان (لاہور)
مارچ ۱۹۷۴ء، ص: ۲۳۔۳۶

اصلاحی، ابوسفیان

علامہ شبلی اور اردو زبان وادب۔ فکر ونظر (علیگڑھ)۔ شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء،
ص: ۲۸۳۔۳۰۸

اصلاحی، امین احسن

مدرسۃ الاصلاح اور علامہ شبلی۔ الاصلاح (اعظم گڑھ) جلد ۱، شمارہ ۸،
اگست ۱۹۳۶، ص: ۱۔۸

اصلاحی، شرف الدین

ایک تاریخی تحریر۔ قطعہ تاریخ وفات علامہ شبلی نعمانی۔ معارف (اعظم گڑھ)
جلد ۱۴۴، شمارہ ۲، اگست ۱۹۸۹ء، ص: ۱۵۲

اصلاحی، ضیاء الدین

سیرۃ النبیؐ میں علامہ شبلی کی ادبی رعنائی وگل کاری۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر،
جون ۱۹۹۶ء، ص: ۱۸۳۔۱۸۶

علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۵۲،

شمارہ۴، اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص: ۲۴۵_۲۶۹

علامہ شبلی اور سیرۃ النبی کی تالیف۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۴۸، شمارہ ۷،
اگست ۱۹۹۱ء، ص: ۵۸_۱۰۱

اصلاحی، عبدالعظیم

مولانا شبلی متکلم ندویؒ۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شخصیات نمبر، جلد ۳۷، شمارہ ۳،
۲۰۰۰ء، ص: ۹۲_۹۷

اصلاحی، کلیم صفات

علامہ شبلی کے بعض قرآنی افکار۔ زندگیٔ نو (دہلی) ۲۶، شمارہ ۸،
اگست ۲۰۰۰، ص: ۴۹_۶۰

علامہ شبلی کے چند فقہی مباحث۔ زندگیٔ نو (دہلی) جلد ۲۶، شمارہ ۴،
اپریل ۲۰۰۰ء ص: ۳۶_۶۰

اصلاحی، محمد اجمل ایوب

علامہ شبلی کی تنقید نگاری۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۴۲، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۸۸ء،
ص: ۲۲۶_۲۳۰

اعظمی، ابوعلی

خلاصہ حیات شبلی کا ایک تاثر۔ فاران (کراچی) جلد ۱۵، شمارہ ۱۱،
فروری ۱۹۶۴ء، ص: ۲۴_۲۷

شبلی اور ابوالکلام آزاد۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۱۷۲_۱۸۸

علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبیؐ۔ تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) جلد ۳، شمارہ ۲۴،
دسمبر ۱۹۸۴ء، ص: ۱۰_۱۲

علامہ شبلی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے چند خطوط۔ نگار (لکھنؤ) جلد ۳۷،
شمارہ ۱۱، اکتوبر ۱۹۵۹ء، ص: ۲۳_۲۷

مکاتیب شبلی بنام آزاد۔ جامعہ (دہلی) جلد ۴۷، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۶۲ء،
ص: ۲۴_۳۸

ندوۃ العلماء اور علامہ شبلی نعمانی۔ فاران (کراچی) جلد ۲۱، شمارہ ۲، مئی ۱۹۷۰ء،
ص: ۳۳۔۴۶

اعظمی الطاف احمد

علامہ شبلی بحیثیت تنقید نگار۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۶۷۔۱۰۴

اعظمی، عبداللطیف

علامہ شبلی اور ان کے منتقد ومعتقد۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر،
ستمبر ۱۹۶۰ء؛ ص: ۶۹۔۱۱۰

مولانا شبلی نعمانی بحیثیت مورخ اور سوانح نگار۔ جامعہ (دہلی) جلد ۳۶،
شمارہ ۳؛ مارچ ۱۹۴۲ء؛ ص: ۱۰۔۲۰

یوم شبلی۔ ایک رپورٹ۔ جامعہ (دہلی) جلد ۵۷، شمارہ ۴؛ اپریل ۱۹۶۸ء؛
ص: ۲۱۰۔۲۱۹

اعظمی، عین الحق

مولانا شبلی نعمانی۔ برہان (دہلی) جلد ۱۰۳، شمارہ ۱؛ جنوری ۱۹۸۹ء؛ ص: ۵۷۔۶۳

اعظمی، محمد الیاس

تذکرہ گلشن ہند اور علامہ شبلی۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۶۶، شمارہ ۵،
نومبر ۲۰۰۰ء، ص: ۳۶۳۔۳۸۰

علامہ شبلی نعمانی علیگڑھ میں۔ تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) جلد ۱۵، شمارہ ۱،
جنوری ۱۹۹۶ء، ص: ۱۷۔۲۵

علامہ شبلی نعمانی کا مورخانہ شعور۔ الرشاد (اعظم گڑھ) جلد ۴۱، شمارہ ۲۳۷۔۲۳۸،
اپریل۔ مئی ۲۰۰۱ء، ص: ۴۰۔۶۴

علامہ شبلی نعمانی کا نظریہ تاریخ۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۶۱، شمارہ ۵،
نومبر ۱۹۹۸ء، ص: ۳۳۶۔۳۸۰

علامہ شبلی نعمانی کی تصنیفات کے ترجمے۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۶۴،
شمارہ ۵، نومبر ۱۹۹۹ء ص: ۳۸۲۔۳۹۵

علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر۔ معارف (اعظم گڑھ)
جلد ۱۶۵، شمارہ ۶، جون ۲۰۰۰ء، ص: ۴۵۔۱۷۵

علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبیؐ۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۶۱، شمارہ ۲،
فروری ۱۹۹۸ء، ص: ۹۸۔۱۱۷؛ جلد ۱۶۱، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۹۸ء،
ص: ۱۷۹۔۱۹۶

علامہ شبلی نعمانی کی مایہ ناز تصنیف ''الفاروق''۔ فکر ونظر (علیگڑھ) جلد ۳۵،
شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۰۔۳۲

افتخار الحسن، سید

مولانا شبلی نعمانی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۶۰۷۔۶۱۲

اکبر حسین، سید

شبلی اور ڈارون: ایک اہم خط۔ دکن ریویو (حیدرآباد) ستمبر ۱۹۰۸ء،
ص: ۱۵۔۱۸

انصاری، اسلوب احمد

موازنہ انیس ودبیر۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۱۹۔۲۸

انصاری، ضیاء الدین

جہان شبلی۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۳۱۰۔۳۹۱

انوار الحسن

شبلی نعمانی۔ فروغ اردو (لکھنؤ) ۱۹۵۷ء، ص: ۳۲۔۳۵

انور سعید

شبلی کا معرکہ انیس ودبیر (منظر وپس منظر)۔ سیارہ (لاہور) جلد ۲۲، شمارہ ۳
ستمبر ۱۹۷۸ء، ص: ۵۷۔۶۶

بخاری، ن

شبلی ایک ہمہ گیر شخصیت۔ نئی قدریں (حیدرآباد) ۱۹۷۰ء، ص: ۶۲۔۷۴

برنی، ضیاء الدین

شبلی: چند یادیں۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶ شمارہ ۹، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۰۷۔۳۰۸

بشیر الدین احمد، میاں

شبلی: ایک شاعر۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۵۴۱۔۵۵۴
شبلی بحیثیت مصنف۔ ہمایوں (لاہور) مئی ۱۹۲۰ء، ص: ۴۳۳۔۴۳۵

بلال، محمد شریف

شبلی جمالیات کے آئینے میں۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۳۸۲۔۳۹۱

بلخی، فصیح الدین

شبلی نعمانی۔ صبح نو (پٹنہ) آزادی نمبر، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۵۔۲۶

بلگرامی، سید مرتضیٰ حسین

شبلی پر سرسید کا اثر۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۵۰۔۳۵۳

بیگ، مرزا احسان احمد

علامہ شبلی کی فارسی شاعری۔ علیگڑھ میگزین، جلد ۱، شمارہ ۱۰۔۱۱، نومبر۔ دسمبر ۱۹۲۲ء،
ص: ۲۴۔۲۸

بیگ، مرزا خلیل احمد

شبلی کا تصور لفظ و معانی شعر العجم کے حوالے سے۔ فکر و نظر (علیگڑھ) شبلی نمبر،
جون ۱۹۹۶ء، ص: ۵۱۔۵۴

پرواز، عبد الرحمٰن

شبلی اور ان کے ناقدین۔ جامعہ (دہلی) جلد ۸۰، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۸۳ء،
ص: ۷۔۲۴

تبسم

مولانا شبلی فارسی شاعر کی حیثیت میں۔ مخزن (لاہور) جلد ۲، شمارہ ۱،

مارچ ۱۹۲۸ء، ص: ۲۵۔۳۶؛ جلد۲، شمارہ۲، اپریل ۱۹۲۸ء، ص: ۱۰۔۲۰

تمکین کاظمی

علامہ شبلی نعمانی۔ صبا (حیدرآباد) جلد۴، شمارہ ۱۔۲: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ص: ۲۱۔۳۲

ثاقب حسین

شبلی: ایک مصلح۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۶۳۹۔۶۴۲

ثاقب، شہاب الدین

شبلی نعمانی اور انجمن ترقی اردو۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۲۷۷۔۲۸۲

جائسی، کبیر احمد

شبلی کی ایک یادگار: دارالمصنفین۔ ادیب (علیگڑھ) جلد۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۷۶۔۱۸۵

جین، گیان چند

شبلی کی مثنوی صبح امید۔ ادیب (علیگڑھ) جلد۶، شمارہ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء؛ ص: ۱۳۳۔۱۳۵

شبلی کے نقد مثنوی کے اصول۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر؛ جون ۱۹۹۶ء؛ ص: ۲۹۔۳۸

چٹھہ، بشیر احمد

انشائے شبلی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۳۹۸۔۴۰۲

حبیب اللہ

مولانا محمد شبلی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد۶، شمارہ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء ص: ۳۰۹۔۳۱۳

حسن، شبیر مہدی

حقوق نسواں پر علامہ شبلی نعمانی کی ایک نادر تقریر۔ فکر ونظر (علیگڑھ) جلد۲۴، شمارہ۱، جولائی ۱۹۸۶ء، ص: ۱۱۳۔۱۳۱

حفیظ میسنائی

شبلی اور علیگڑھ تحریک۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،

ص: ۲۳۳۔۲۴۱

حمید کوثر

شبلی کے مقاصد حیات۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۳۹۲۔۳۹۷

حیدر، فیاض الدین احمد

علامہ شبلی کا نظریہ شاعری۔ صبح نو (پٹنہ) مارچ ۱۹۶۰ء، ص: ۵۰۔۶۰

خالد بزمی

شبلی مکاتیب کے آئینے میں۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۵۰۴۔۵۴۰

خاں، افرین بیگم

شبلی نثر کے میدان میں۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۱۲۹۔۱۳۱

خاں، حبیب الرحمٰن

مغربی افکار کی یورش اور علامہ شبلی نعمانی کا کارنامہ۔ معارف (اعظم گڑھ)
جلد ۱۵۴، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۹۴ء، ص: ۳۲۵۔۳۵۰

خاں، رشید حسن

شبلی کا فارسی تغزل۔ نگار (لکھنؤ) جلد ۶۴، شمارہ ۶، مئی ۱۹۵۰ء، ص: ۱۵۔۲۰

خاں، رفیق احمد

شبلی ایک نظم گو۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۴۰۳۔۴۶۴

خاں، شیخ عبداللہ

مولانا شبلی نعمانی مرحوم ومغفور۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر
ستمبر ۱۹۶۰ء ص: ۳۱۴۔۳۲۲؛ البصیر (چینوٹ) شبلی نمبر، اپریل۔ جون ۱۹۵۸ء،
ص: ۱۶۸۔۱۷۵

خاں، عبدالاحد

شبلی اور مہدی حسن۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،

ص: ۳۴۳-۳۴۹

خاں، محمد حبیب اللہ

مولانا شبلی نعمانی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۰۹-۳۱۳

خاں، محمد صغیر

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ تنویر ادب (الہ آباد) مئی ۱۹۳۷ء،
ص: ۲۴۶-۲۴۹

خلیلؔ، خلیل احمد

مولانا شبلی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۵۵۳-۵۶۸

خورشید الاسلام

شبلی نعمانی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۱۴۴-۱۶۳

علامہ شبلی نعمانی۔ فکر ونظر (علیگڑھ) جلد ۲۲، شمارہ ۱-۳: ناموارانِ علیگڑھ:
پہلا کارواں، جنوری۔ ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۸۷-۹۲

خوندمیری، عالم

اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ۔ صبا (حیدرآباد) جلد ۴، شمارہ ۱-۲:
شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ص: ۴۷-۵۶

داؤد اشرف،

علامہ شبلی نعمانی اور حیدرآباد۔ سب رس (الہ آباد) جلد ۵۲، شمارہ ۳،
فروری ۱۹۸۹ء، ص: ۴-۱۰

دروائی، محمد حسین الدین

شبلی ایک مجاہد کے روپ میں۔ علیگڑھ میگزین، جلد ۱۵، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۳۷ء،
ص: ۱۱-۱۵

دسنوی، سید شہاب الدین

عطیہ، اقبال اور شبلی۔ ہماری زبان (دہلی) جلد ۵۴، شمارہ ۱۵-۱۶، اپریل ۱۹۹۵ء،
ص: ۶-۱۷

ڈار، محمد ابراہیم

حیات شبلی پر ایک نظر۔ نوائے ادب (ممبئی) جلد ا، شمارہ ا؛ جنوری ۱۹۵۰ء؛
ص: ۲۲۔۵۷

ڈار، محمد طفیل

شبلی کی اردو شاعری۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۲۱۰۔۲۳۲

ذوالفقار، غلام حسین

دارالمصنفین شبلی کی تصنیفی تحریک۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۲۰۳۔۲۰۹

شبلی کی تاریخ رحلت اور اقبال۔ اردو (کراچی) اپریل ۱۹۶۷ء، ص: ۹۲۔۹۴

رانا، شوکت علی

شبلی کا انداز نگارش۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۶۰۲۔۶۰۶

رانا، طارق محمد

علامہ شبلی ایک نظر میں۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۵۷۳۔۵۷۶

رشید خاں

شبلی کی شاعری۔ قومی زبان (کراچی) جولائی ۱۹۷۶ء، ص: ۱۹۔۲۲

رضیہ بیگم

شبلی کی شعر فہمی اور شعر گوئی۔ صبا (حیدر آباد) جلد ۴، شمارہ ۱۔۲: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء
ص: ۶۸۔۷۶

زبیری، محمد امین

شبلی کا جرم محبت اور سلیمان ندوی۔ نگار (لکھنؤ) جلد ۴۸، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۴۵ء
ص: ۴۹۔۵۱

زخمی، محمود الٰہی

غدر کے بعد قصیدہ گوئی اور شبلی نعمانی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹:

شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۳۶۔۱۴۰

زور، محی الدین قادر

شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات۔ صبا (حیدر آباد) جلد۴، شمارہ ۱۔۲، شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ص: ۳۳۔۳۹

زیدی، ناظر حسن

علامہ شبلی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۱۸۹۔۲۰۲

زینت ساجدہ

حیات شبلی۔ صبا (حیدر آباد) جلد۴، شمارہ ۱۔۲: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ص: ۱۱۔۲۰

سحر انصاری

شبلی کا اسلوب نگاری۔ مجلّہ جناح کالج (کراچی) ۶۹۔۱۹۶۸ء، ص: ۳۳۔۳۷

سرور، آل احمد

شبلی میری نظر میں۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۱۱۰۔۱۲۱
شبلی کی اردو شاعری۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۷۔۱۸

سعید اللہ، شیخ

شبلی کے مطائبات۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۶۲۵۔۶۳۸

سعید انصاری

اردو کے عناصر اربعہ میں علامہ شبلی کا درجہ۔ الناظر (لکھنؤ) جلد ۳۹، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۳۵ء، ص: ۱۔۵
شبلی عالمی ادیب وشاعر۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۹۳۔۲۶۰
مولانا شبلی اور اصلاح تعلیم۔ جامعہ (دہلی) جلد ۵۲، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۶۵ء، ص: ۸۔۲۴
مولانا شبلی اور علم کلام۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۲۶۔۳۵

سلام سندیلوی

شبلی کی اردو شاعری۔ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۵۴۔۱۶۷

سہاروی، اسرار احمد

مولانا شبلی نعمانی۔مجلّہ تعمیر ادب (لاہور)، مئی ۱۹۵۰ء، ص: ۶۶۔۷۹

سہیل، اقبال احمد

دیباچہ سیرت شبلی۔الاصلاح (اعظم گڑھ) جلد ۱، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۳۶ء، ص: ۲۸۔۵۰؛ جلد ۱، شمارہ ۱۱، نومبر ۱۹۳۶ء، ص: ۴۸۔۵۵

سید حامد

علامہ شبلی نعمانی۔عالم وادیب۔ہماری زبان (دہلی) جلد ۵۴، شمارہ ۱۶، اپریل ۱۹۹۵ء، ص: ۲۔۵

سید شاہد

ہمہ جہت شخصیت شبلی نعمانی۔حیات نو (اعظم گڑھ) جلد ۱۲، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۹۶ء، ص: ۱۶۔۱۸

سید یعقوب

شبلی اور حیدر آباد۔آجکل (دہلی) جون ۱۹۶۴ء، ص: ۱۶۔۲۰

سیدہ جعفر

شبلی کے مضامین۔ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۲۱۸۔۲۲۳

شاہ علی، سید

حالی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے۔نگار (پاکستان) جلد ۴۵، شمارہ ۲، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص: ۲۰۵۔۲۱۵؛ نگار (لکھنؤ) جلد ۰۷، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۵۶ء، ص: ۱۶۔۳۱؛ جلد ۰۷، شمارہ ۲، اگست ۱۹۵۶ء، ص: ۶۔۱۵؛ جلد ۰۷، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۶۔۱۶

حالی اور شبلی کا سوانحی دور۔ اردو (کراچی) جلد۳۲، شمارہ۲، اپریل ۱۹۵۶ء،
ص: ۱۰۳۔۱۰۶

شاہ، منیر عالم

شبلی نعمانی: حیات۔ مسلم ریویو (الہ آباد) اگست ۱۹۱۲ء، ص: ۵۰۔۶۵

شباب الدین

حیات شبلی۔ تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) جلد۷، شمارہ ۸، اگست ۱۹۸۸ء،
ص: ۴۷۔۵۱

شبلی کی مقالہ نگاری۔ تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) جلد۵، شمارہ ۲۱۔۲۲،
نومبر ۱۹۸۶ء، ص: ۶۱۔۶۷

شجاعت علی

علامہ شبلی نعمانی بحیثیت انشا پرداز۔ ادیب (علیگڑھ) جلد۱۹: شمارہ ۱۔۲،
۱۹۹۵ء، ص: ۳۷۔۵۲

شروانی، محمد حبیب الرحمان خاں

مرحومی علامہ شبلی نعمانی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۲، شمارہ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء
ص: ۱۶۔۲۵؛ الاسلام (کراچی) جولائی۔ستمبر ۱۹۷۱ء، ص: ۴۹۔۵۷

شروانی، محمد مقتدیٰ خاں

شبلی کی نازک مجازی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد۲، شمارہ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۲۳۔۳۲۶

علیگڑھ میں شبلی کا قیام۔ البصیر (چیونٹ) شبلی نمبر، اپریل۔جون ۱۹۵۸ء،
ص: ۵۵۔۶۰

شروانی، ریاض الرحمٰن خاں

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد۱۵۹،
شمارہ ۷، جولائی ۱۹۹۷ء، ص: ۵۔۱۷

شعیب اعظمی

تحریک آزادی اور علامہ شبلی نعمانی۔ کاروان ادب (لکھنؤ) جلد۲، شمارہ۳،

اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص: ۶۷۔۷۹
شبلی کی فنکارانہ شخصیت ان کے فارسی اشعار کی روشنی میں۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء ص: ۱۳۵۔۱۵۰
شبلی منکر غالب۔ جامعہ (دہلی) جلد ۵۹، شمارہ ۲۔۳، فروری۔ مارچ ۱۹۵۹ء، ص: ۱۶۴۔۱۷۶

شمس کنول

مولانا شبلی نعمانی۔ گگن (ممبئی) جلد ۱۳، شمارہ ۲۔۴، فروری۔ اپریل ۱۹۷۵ء، ص: ۴۱۰۔۴۱۱

صباح الدین عبدالرحمٰن، سید

مولانا شبلی نعمانی۔ نقوش (لاہور) شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۶ء، ص: ۱۸۔۲۰؛ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۳۷۰۔۳۷۷

صدیقی، آفتاب احمد

شبلی کا اسلوب نگارش۔ خاور (ڈھاکہ) نومبر ۱۹۵۳ء، ص: ۱۰۔۱۵
شبلی متکلم۔ البصیر (چنیوٹ) شبلی نمبر، اپریل۔ جون ۱۹۵۸ء، ص: ۲۶۔۳۰
شبلی وحالی کا ایک تقابلی مطالعہ۔ نیمروز (کراچی) نومبر ۱۹۵۶ء، ص: ۱۲۔۱۵
یار سخن شناس (شبلی اکبر کی نظر میں)۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۳۲۷۔۳۳۲

صدیقی، ابواللیث

شبلی اور اردو۔ علیگڑھ میگزین۔ جنوری ۱۹۳۹ء، ص: ۱۴۲۔۱۴۴

صدیقی، شمشاد احمد

شبلی اور ان کے معاصر۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۳۲۔۳۵

صدیقی، صدیق احمد

شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک نظر۔ ادبی دنیا (لاہور) اکتوبر ۱۹۵۳ء،

ص:۳۳-۴۸؛ادیب (علیگڑھ) جلد۶،شمارہ۹:شبلی نمبر،ستمبر۱۹۶۰ء،
ص:۱۶۸-۱۷۵

صدیقی،ظفراحمد

سرسید کے اثرات (شبلی،فراہی اور آزاد کے حوالے سے)۔تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) جلد۱۹،شمارہ۳، مارچ ۲۰۰۰ء ص:۱۰-۳۲
شبلی اور علم کلام۔فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء،ص:۲۳۳-۲۵۰
شبلی نعمانی: حیات اور کارنامے پر مولانا ضیاء الدین کے اعتراضات۔ الرشاد (اعظم گڑھ) جلد۱۳،شمارہ ۶۳، اکتوبر ۱۹۸۶ء،ص:۳۹-۴۹؛ جلد۱۳،شمارہ ۶۴،نومبر ۱۹۸۶ء ص:۲۸-۳۵؛ جلد۱۳،شمارہ ۶۵، دسمبر ۱۹۸۶ء،ص:۴۱-۴۷
علامہ شبلی کی شخصیت۔ اسلام اور ادب کا بہترین امتزاج۔ کاروان ادب (لکھنؤ)،شمارہ ۴-۵ ،جنوری۔ مارچ ۱۹۹۵ء،ص:۱۹۲-۱۹۶
علامہ شبلی نعمانی: مختصر حالات زندگی۔ ہماری زبان (دہلی) جلد۵۴،شمارہ ۱۵-۱۶، اپریل ۱۹۹۵ء،ص:۹-۱۰
مولانا شبلی کی شاعری۔ جامعہ (دہلی) جلد۷۷،شمارہ۴،اپریل ۱۹۸۰ء، ص:۲۱۵-۲۳۷

صدیقی،عبدالحفیظ

علیگڑھ تحریک اور شبلی۔علیگڑھ میگزین: علیگڑھ نمبر، ۱۹۵۵ء،ص: ۲۵۸-۲۶۱

صدیقی،ظہیر احمد

شبلی کی فارسی شاعری۔ادیب (علیگڑھ) جلد۶ ،شمارہ ۹:شبلی نمبر، ستمبر۱۹۶۰ء؛ ص:۱۴۹-۱۵۳

صدیقی،عبداللطیف

اردو کے انشا پرداز۔ شبلی نعمانی۔ الناظر (لکھنؤ) جولائی ۱۹۲۷ء،ص: ۱۵-۳۳

صدیقی،محمد یٰسین مظہر

تالیف سیرۃ النبیؐ۔ پس منظر و پیش کش۔فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء،

ص:۱۹۷۔۲۳۲

شبلی کی سیرۃ النبیؐ کا مطالعہ نقد سلیمانی کی روشنی میں۔تحقیقات اسلامی (علیگڑھ)
جلد۳، شمارہ۲، اپریل ۱۹۸۳ء، ص: ۷۷۔۱۵۴

شبلی نگارشات دعوت و اصلاح۔فکر و نظر (علیگڑھ) جلد۳۰، شمارہ۲، ۱۹۹۳ء،
ص:۲۶۔۵۶

علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبیؐ کی معنویت۔اسلام اور عصر جدید (دہلی) جلد۲۰،
شمارہ۳، جولائی ۱۹۸۸ء، ص: ۴۲۔۵۷

صدیقی، مشیر علی

شبلی کے چند اہم مقالات۔جامعہ (دہلی) جلد۶۹، شمارہ۱، جنوری ۱۹۷۴ء،
ص: ۳۵۔۴۰

صدیقی، مفتون احمد

شبلی کی شخصیت۔نگار (لکھنؤ) جلد۰۷، شمارہ۵، اپریل ۱۹۵۳، ص: ۳۰۔۳۷

شبلی کا اسلوب تحریر۔خاور (ڈھاکہ) جولائی ۱۹۵۲ء ص: ۱۹۔۲۴

مولانا شبلی کے بعض نقاد۔نگار (لکھنؤ) جلد۱۷، شمارہ۴، اپریل، ۱۹۵۷ء،
ص:۲۱۔۲۴

مولانا شبلی اور ان کے عہد کے سیاسی محرکات۔ادیب (علیگڑھ) جلد۶، شمارہ۹:
شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء ص: ۶۰۔۸۶

مولانا شبلی علیگڑھ سے پہلے اور بعد میں۔نگار (لکھنؤ) جلد۷، شمارہ۱،
جولائی ۱۹۵۶ء، ص: ۴۳۔۴۶

صدیقی، نبیلہ شہناز

شعر و شاعری اور شبلی۔صریر (حیدر آباد) دسمبر ۱۹۶۷ء، ص: ۱۶۱۔۱۶۵

طاہر، عبد الغفور

شبلی: شاعر اور نثر نگار۔کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص:۶۲۱۔۶۲۵

طفیل احمد، سید

شمس العلماء مولانا شبلی۔ نقوش (لاہور) آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء،
ص: ۳۲۰۔۳۲۴

مولانا شبلی ایک علیگ شاگرد کی نظر سے۔ ادبی دنیا (لاہور) جلد ۱۰، ۱۹۴۷ء،
ص: ۱۷۔۲۰

طیش، تاج الدین

علامہ شبلی کی ''الفاروق'' پر ایک نظر۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۲۷۹۔۲۹۲

ظفر الاسلام

مولانا شبلی اور علیگڑھ۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۲۵۱۔۲۷۶

ظہور نسیم

شبلی پر ایک نظر۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۵۸۴۔۶۰۱

مولانا شبلی نعمانی اور ان کی فارسی خدمات۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۲۵،
شمارہ ۲، فروری ۱۹۸۰ء، ص: ۸۵۔۱۰۵

ظہیر قادری

حالی و شبلی۔ ساقی (کراچی) جلد ۴۲، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص: ۶۹۔۷۵

عابد، عبدالکریم

علامہ شبلی کے کارناموں کا ایک جائزہ۔ چراغ راہ (کراچی) جلد ۳۰، شمارہ ۱،
جون ۱۹۷۶ء، ص: ۵۳۔۶۵

عارف، اخلاق حسین

شبلی کی قومی شاعری۔ آجکل (دہلی) جلد ۲۶، شمارہ ۲، ستمبر ۱۹۶۷ء،
ص: ۲۵۔۳۲

عامر، عبدالحکیم

مولانا شبلی نعمانی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۶۱۳۔۶۱۶

عبادت بریلوی

شبلی کی تنقید نگاری۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶ شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۲۰۸۔ ۲۱۷؛ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۷۱۔ ۸۶
شبلی کی تنقید۔ المعارف (کراچی) جلد ۱، شمارہ ۱۲، دسمبر ۱۹۶۸ء، ص: ۸۔ ۲۳

عباسی، ش

شبلی کا ادبی مرتبہ۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۲۹۳۔ ۳۰۱

عبدالباسط، محمد

عربی شاعری اور مثنوی (بہ نظر شبلی)۔ دکن ریویو (حیدرآباد) فروری ۱۹۰۹ء،
ص: ۲۶۔ ۳۰

عبدالحق

علامہ شبلی کے تنقیدی تصورات۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۱۷، شمارہ ۱۔ ۲،
جنوری۔ جون ۱۹۹۳ء ص: ۱۷۳۔ ۱۷۹
مولانا شبلی بابائے اردو کی نظر میں۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر،
ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۲۔ ۱۵

عبدالحئی، سید

شبلی بحیثیت ادیب۔ البصیر (چنیوٹ) شبلی نمبر، اپریل۔ جون ۱۹۵۸ء،
ص: ۱۵۵۔ ۱۶۰

عبداللہ، سید

اردو سوانح نگاری سرسید کے زمانے میں (شبلی)۔ ماہ نو (کراچی)، اگست ۱۹۵۳ء
ص: ۱۲۔ ۱۵
شبلی فکر جدید سے کیونکر روشناس ہوئے؟۔ اورینٹل کالج میگزین (لاہور)
۱۹۲۸ء، ص: ۳۸۷۔ ۳۸۹
شبلی کا نظریۂ تاریخ۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۴۱، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۳۸ء،
ص: ۱۹۴۔ ۲۰۴؛ جلد ۴۱، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۳۸ء، ص: ۲۸۱۔ ۲۹۳

شبلی کے تصنیفی کام کا مجموعی قدر و قیمت۔ البصیر (چیونٹ) شبلی نمبر،
اپریل۔ جون ۱۹۵۸ء؛ ص: ۴۸۔۵۲
شبلی نعمانی۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) جلد ۱۱، ۱۹۶۵ء،
ص: ۶۵۰۔۶۵۴

عبداللہ، شیخ

مولانا شبلی نعمانی مرحوم۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۱۴۔۳۲۲
مولانا شبلی ایک پین اسلامسٹ۔ البصیر (چیونٹ) شبلی نمبر، اپریل۔
جون ۱۹۵۸ء، ص: ۱۴۔۲۵
مولانا شبلی مرحوم و مغفور۔ البصیر (چیونٹ) شبلی نمبر، اپریل۔ جون ۱۹۵۸ء،
ص: ۶۸۔۷۲

عبدالماجد دریابادی

شبلی۔ انسان، مصنف، مصنف گر۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۹۵، شمارہ ۳،
مارچ ۱۹۶۵ء، ص: ۱۲۰۔۱۲۲
العلم (کراچی) جلد ۱۴، شمارہ ۲، اپریل۔ جون ۱۹۶۵ء، ص: ۶۶۔۷۷
کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۲۴۔۳۸
شبلی ایک شخصیت۔ چراغ راہ (لاہور) جلد ۱۹، شمارہ ۵۔۶، مئی۔ جون ۱۹۶۵ء،
ص: ۱۲۰۔۱۲۲

عبدالمغنی

شبلی و حالی کی تحریکیت۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۵۴۔۳۶۰
علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۴۱، شمارہ ۴،
اپریل ۱۹۸۸ء، ص: ۲۶۶۔۲۸۳؛ جلد ۱۴۱، شمارہ ۵، مئی ۱۹۸۸ء،
ص: ۳۲۵۔۳۴۷

عرشی، امتیاز علی

علامہ شبلی نعمانی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۳۴، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۳۴ء، ص: ۲۹۷۔۳۰۲

عطیہ بیگم

مولانا شبلی۔ صبح امید (پٹنہ) اپریل ۱۹۵۹ء، ص: ۴۴۔۵۰

مولانا شبلی اور خاندان فیضی۔ ادبی دنیا (لاہور) جلد ۲۴، شمارہ ۵، جون ۱۹۴۶ء، ص: ۲۶۔۲۸

عظیم، وقار اختر

شبلی ایک عظیم مورخ۔ ماہ نو (کراچی) نومبر ۱۹۶۷ء، ص: ۹۔۱۴

شبلی بحیثیت شاعر و مورخ۔ فنون (لاہور) جلد ۷، شمارہ ۷، اپریل ۱۹۶۸ء، ص: ۱۸۳۔۱۹۳

مورخ شبلی۔ اقبال (لاہور) اپریل ۱۹۶۸ء، ص: ۷۶۔۹۱

مولانا شبلی کی سیاسی شاعری۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۸۷۔۱۰۳

عماد الملک، سید حسین بلگرامی

مکاتیب عماد الملک بنام شبلی نعمانی۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۹۵، شمارہ ۲، فروری ۱۹۶۵ء، ص: ۱۴۸۔۱۵۶

عمر یعقوب

شبلی نعمانی کے قانونی اور سماجی تصورات۔ اسلام اور عصر جدید (دہلی) جلد ۳۰، شمارہ ۳، جولائی ۱۹۸۸ء، ص: ۵۔۴۲

غلام الثقلین، خواجہ

مولانا شبلی پر ایک نظر۔ عصر جدید (میرٹھ) جلد ۸، شمارہ ۴، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص: ۴۱۔۴۳

غلام حسین

شبلی ایک مورخ۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۴۹۶۔۵۰۳

فاروق، اظہر علی

مولانا شبلی کی مقالہ نگاری۔ آجکل (دہلی) جلد ۱۰، شمارہ ۱، اگست ۱۹۵۱ء،
ص: ۴۷۔۵۱

فاروقی، سارہ

شبلی کا ایک فلسفیانہ نظام۔ ہماری زبان (دہلی) جلد ۶۵، شمارہ ۷، جولائی ۱۹۹۳ء،
ص: ۵۳۔۶۳

فاروقی، ضیاء الحق

علامہ شبلی بحثیت مورخ۔ جامعہ (دہلی) جلد ۵۳، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۶۶ء،
ص: ۱۲۲۔۱۴۱؛ جلد ۵۳، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۶۶ء، ص: ۱۷۱۔۱۹۱؛ نگار
(پاکستان) جلد ۴۵، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص: ۲۴۔۳۴

فاروقی، محمد احسن

شبلی کی موازنہ انیس و دبیر میں ایک فرد پر تنقید۔ ساقی (کراچی) اپریل ۱۹۵۴ء،
ص: ۱۶۰۔۱۶۵

فاروقی، محمد احمد

مکتوب شبلی۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۲، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۲۳ء،
ص: ۳۹۳۔۳۹۵

فاضل مشہدی

شبلی کے مقالات کا مقام۔ صحیفہ (لاہور) شمارہ ۲۶، جنوری ۱۹۶۴ء، ص: ۲۷۔۳۸

فریدی، محمد ابراہیم

حیات شبلی کے معلومات میں کچھ اضافے۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۶۲، شمارہ ۴،
اکتوبر ۱۹۴۸ء، ص: ۳۱۳۔۳۱۵

قادری، خالد حسن

شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں۔ نگار (لکھنؤ) جلد ۵۹، شمارہ ۸۔۹، اگست۔
ستمبر ۱۹۴۶ء، ص: ۱۰۔۲۱

قادری، محمد ایوب

شبلی نعمانی۔ العلم (کراچی) جلد ۱۶، شمارہ ۲، اپریل ۱۹۶۷ء، ص: ۳۳۔ ۳۸؛
جلد ۱۶، شمارہ ۳، جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۶۶۔ ۷۲؛ جلد ۱۶، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۶۷ء،
ص: ۶۸۔ ۷۳

قریشی، افضل حق

مولانا شبلی کا ایک نایاب مضمون۔ ادبی دنیا (لاہور) ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص: ۹۔ ۱۴

کاظمی، طاہر حسین

کلام شبلی: قومی اور سیاسی رجحانات۔ جامعہ (دہلی) جلد ۸۴، شمارہ ۲،
فروری ۱۹۸۷ء، ص: ۲۴۔ ۳۲

کلیم الدین احمد

شبلی نعمانی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۱۲۲۔ ۱۲۸

کلیم، محبوب الرحمٰن

علامہ شبلی اور ان کی شاعری۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۳، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۱۸ء،
ص: ۳۱۲۔ ۳۲۰

کمال الدین

شبلی ایک مثالی مصنف۔ ادبی دنیا (لاہور) ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص: ۲۱۔ ۳۵

گوریکر، نظام الدین۔ ایس

علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تعلیمی افکار و احوال۔ نوائے ادب (ممبئی) جلد ۴۲،
شمارہ ۲، اکتوبر ۱۹۹۲ء ص: ۵۹۔ ۶۹
علامہ شبلی نعمانی اور ان کی فکر و نظر۔ ہماری زبان (دہلی) جلد ۵۴، شمارہ ۱۵۔ ۱۶،
اپریل ۱۹۹۵ء ص: ۲۰۔ ۲۵

ماہر القادری

شبلی نعمانی کی شاعری۔ ماہ نو (کراچی) اگست ۱۹۵۰ء، ص: ۱۴۳۔ ۱۴۷

مجددی، محمد اقبال

علم کلام پر علامہ شبلی کا ایک نایاب لکچر۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۰۴، شمارہ ۴،

اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص: ۳۰۰۔۳۱۶

محمد اکرام، شیخ

علامہ شبلی نعمانی اور مغربی علوم سے استفادہ۔ المعارف (لاہور) جلد۲، شمارہ۴،
اپریل ۱۹۶۹ء، ص: ۲۔۱۴
مولانا شبلی کے اساتذہ۔ المعارف (لاہور) جلد۳، شمارہ۱۱، نومبر ۱۹۷۰ء،
ص: ۳۔۱۱

محمد تقی، سید

شبلی ایک مفکر کی حیثیت سے۔ جنگ (پاکستان) مارچ ۱۹۶۶ء، ص: ۷۔۱۰

محمد حسن

شبلی کا جہان تنقید۔ نقد ونظر (علیگڑھ) جلد۱۲، شمارہ۲، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۴۵۔۱۵۲

محمد خالد

علامہ شبلی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۵۶۶۔۵۷۲

محمد ریاض

اقبال اور شبلی۔ ماہ نو (لاہور) جلد۴۱، شمارہ۷، مئی ۱۹۷۷ء، ص: ۲۰۔۲۳
تصانیف شبلی کا کلامی سلسلہ اور علم کلام کی تشکیل نو۔ الولی (حیدرآباد)
فروری ۱۹۷۸ء، ص: ۵۔۲۰
سیرت نگار شبلی کی دینی شاعری۔ فکر ونظر (اسلام آباد) جلد۱۷، شمارہ۹،
مارچ ۱۹۸۰ء، ص: ۱۷۔۳۵
شبلی اور معاصر سیاسی حالات۔ المعارف (لاہور) جلد۱۲، شمارہ۷،
جولائی ۱۹۷۹ء، ص: ۱۷۔۲۷
شبلی کی اردو اور فارسی شاعری۔ المعارف (لاہور) جلد۷، شمارہ۱۰،
اکتوبر ۱۹۷۴ء، ص: ۱۸۔۳۲

محمد سردار

شبلی ایک تحریک۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،

ص: ۴۶۵-۴۸۶

محمد طارق، سید

فارسی ادبیات کے دو مورخ: پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی۔ معارف (اعظم گڑھ)
جلد ۱۵۲، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۹۳ء، ص: ۱۸۳-۱۹۷

محی الدین احمد

مولانا شبلی کی فارسی شاعری۔ صبا (حیدر آباد) جلد ۴، شمارہ ۱-۲: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء،
ص: ۷۷-۸۴

مراد، مہر افروز

شبلی نعمانی کے سیاسی افکار۔ اسلام اور عصر جدید (دہلی)۔ جلد ۲۰، شمارہ ۴؛
اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص: ۵-۳۵

مرزا، سلیم پرویز

مولانا شبلی نعمانی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۵۷۷-۵۸۳

مسلح الدین

شبلی موازنے کی روشنی میں۔ آجکل (دہلی) جلد ۲۳، شمارہ ۱۱، جون ۱۹۶۴ء،
ص: ۱۶-۲۰

مشہدی بنگلوری

علامہ شبلی کی تصنیفات۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء،
ص: ۲۴۷-۲۵۸

معراج الدین احمد

شبلی اور الکلام۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۳۶۹-۳۸۲

مقبول احمد، خواجہ

شبلی بحیثیت سوانح نگار۔ نئی قدریں (حیدر آباد) نومبر ۱۹۵۶ء، ص: ۱۲-۱۵
علامہ شبلی اور تنقید سیاست۔ ادبی دنیا (لاہور) ستمبر ۱۹۴۱ء، ص: ۳۰-۴۵

ملک جان

علامہ شبلی نعمانی۔ خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) شمارہ ۷-۸، ۹-۱۹۷۸ء،

ص: ۶۳۔ ۶۶

مہدی حسن، شبیر

حقوق نسواں پر علامہ شبلی نعمانی کی ایک نادر تقریر۔ فکر ونظر (علیگڑھ) جلد ۲۴، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۸۶ء، ص: ۱۱۳۔ ۱۳۱

ناظر کاکوروی

انشائے شبلی۔ فروغ اردو (لکھنؤ) ستمبر ۱۹۵۹ء، ص: ۲۵۔ ۳۰

ندوی، احتشام احمد

مفتون احمد اور شبلی۔ نگار (لکھنؤ) جلد ۱۷، شمارہ ۶، جون ۱۹۵۷ء، ص: ۳۲۔ ۵۳

موج کوثر اور شبلی اسکول۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۹، شمارہ ۱۱، نومبر ۱۹۶۳ء، ص: ۴۱۔ ۴۳

ندوی، جمشید احمد

مولانا شبلی نعمانی ایک مصنف گر۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۶۵، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۰ء، ص: ۱۸۔ ۳۵

ندوی، حبیب الرحمٰن

مولانا شبلی کے ایک استاذ۔ فیض اللہ مؤ دی۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۲۲ شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص: ۸۰۔ ۹۰

ندوی، ساجد علی

شبلی اور بھوپال۔ ندائے سیفیہ (بھوپال) نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۲۷۔ ۲۹

ندوی، سرور عالم

شبلی کی سوانح نگاری۔ حیات نو (اعظم گڑھ) جلد ۱۲، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۹۶ء، ص: ۲۷۔ ۳۳

ندوی، سید سلیمان

شبلی کے مذہبی افکار۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۱۷۔ ۲۳

مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین پر غوغائے تکفیر۔ الاصلاح (اعظم گڑھ) جلد ۱،

شمارہ ۸، اگست ۱۹۳۶ء ص: ۲۵۔۲۸

ندوی، شاہ معین الدین احمد

شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۲۵۰۔۲۵۱

ندوی، عبد السلام

شبلی کا طرز تحریر۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۸۶۔۱۹۲

شبلی کی فارسی شاعری۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۱۴۱۔۱۴۸

ندوی، عبد اللہ کوئی

علامہ شبلی مردم ساز۔ فاران (کراچی) جلد ۱۶، شمارہ ۳، جون ۱۹۶۴ء، ص: ۱۴۔۱۸

ندوی، مجیب اللہ

شبلی کی سوانح نگاری۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۵۱۔۵۹؛ الشجاع (کراچی) جولائی ۱۹۷۳ء، ص: ۱۲۔۱۷

ندوی، محمد اسماعیل

علامہ شبلی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۴، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۵۸ء، ص: ۹۔۱۴

ندوی، محمد راشد

ممالک اسلامیہ کی تصویر (سفرنامہ روم، مصر و شام کی روشنی میں)۔ فکر و نظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۱۱۹۔۱۳۴

نظامی، خلیق احمد

ادب اور مشرقی تاریخ کا فخرن شبلی۔ فکر و نظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۰۵۔۱۱۸

تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں حالی اور شبلی کا حصہ۔ کاروان ادب (لکھنؤ) جلد ۲، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء، ص: ۶۰۔۷۸

نظامی، عابد علی

شبلی اور حالی۔ کریسنٹ (لاہور) شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ص: ۲۴۲۔۲۳۶

نعمانی، احمد اسحاق

شبلی اور سیاست۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۶۱۔۳۶۹

شبلی اور ہم۔ صبا (حیدر آباد) جلد ۴، شمارہ ۱۔۲، ۱۹۵۸ء، ص: ۲۶۔۳۵

شبلی کی محرومیاں۔ علیگڑھ میگزین، شمارہ ۱، ۱۹۵۷ء، ص: ۷۶۔۸۴

نعمانی، خورشید مظہر الحق

دار المصنفین۔ مولانا شبلی کی تصنیفی تحریک۔ نوائے ادب (ممبئی) جلد ۴۸،
شمارہ ۱، ۱۹۹۸ء ص: ۹۸۔۱۱۷؛ جلد ۴۸، شمارہ ۲، ۱۹۹۸ء، ص: ۶۔۲۱

نعمانی، عبد القیوم حسرت

اردو میں تنقید کا ارتقاء: شبلی۔ نگار (لکھنؤ) فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء، ص: ۸۲۔۱۲۶

نقوی، احراز احمد

شبلی: شخصیت اور خطوط۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۲۶۰۔۲۶۷

نقوی، نور الحسن

علامہ شبلی کی تنقید نگاری۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۲۴۔۳۰

نواب علی، سید

شبلی کی رومانی زندگی۔ ادیب (علیگڑھ) جلد ۶، شمارہ ۹: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء،
ص: ۳۰۴۔۳۰۶

نیرنگ نیازی

مولانا شبلی نعمانی۔ پیام حق (کراچی) اپریل۔ مئی ۱۹۷۱ء، ص: ۱۸۔۲۳

وزیر آغا

شبلی کی سیاسی نظمیں۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۳۷۔۴۲

ہاشم، سید محمد

علامہ شبلی نعمانی۔ فکر ونظر (علیگڑھ) ناموارانِ علیگڑھ: پہلا کارواں، جلد ۲۲، شمارہ ۱۔۳، جنوری۔ ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۹۳۔۱۰۴

ہاشمی، رفیع الدین

سرسید، شبلی اور مغرب۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۴۴، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۸۹ء، ص: ۳۵۔۴۷

ہاشمی، یحیٰ احمد

شبلی کی قومی شاعری۔ فروغ اردو (لکھنؤ) جلد ۱۴، شمارہ ۶، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص: ۱۴۔۱۸؛ جلد ۱۴، شمارہ ۷، نومبر ۱۹۶۷ء، ص: ۱۴۔۱۹

ہاشمی، نصیر الدین

علامہ شبلی اور حیدرآباد۔ صبا (حیدرآباد) جلد ۴، شمارہ ۱۔۲: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ص: ۴۰۔۴۷

علامہ شبلی کی رنگین زندگی۔ ادب (علیگڑھ) مارچ ۱۹۶۲ء، ص: ۴۔۸

مولانا شبلی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم۔ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۱۶، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۲۵ء، ص: ۳۰۷۔۳۱۱

یادگارِ شبلی۔ ساقی (کراچی) جلد ۴۶، شمارہ ۲، فروری ۱۹۵۸، ص: ۲۲۔۲۵

ہمدانی، سید محمد کمال الدین حسین

مرثیہ کی تاریخ علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے۔ فکر ونظر (علیگڑھ) شبلی نمبر، ۱۹۹۶ء، ص: ۵۵۔۶۶

☆☆☆

